قطعات و رباعیات

اکبر الٰہ آبادی

حصہ اوّل

تشریح، تبویب، و ترتیب

جناب بھیا احسان الحق صاحب

شایع کردہ
بزم اکبر، کراچی

قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے
Rs. 5/8/0

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مضامین

باب ۲۰
اُردو اور ہندی

باب ۲۱
ادبی چٹکلے اور شعری لطائف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کُلیاتِ اکبر کی نئی ترتیب

کلیات اکبر الٰہ آبادی سالہا سال سے نایاب ہو گئی تھی، اس لئے عالی مرتبت جناب چوہدری نذیر احمد خاں صاحب، صدر بزم اکبر نے مجھے ہدایت فرمائی کہ نئی ترتیب کا خیال پھر کر لینا، کلیات جیسی پہلے چھپتی رہی ہے، ایک دفعہ فوراً اسے ویسا ہی چھاپ دینا چاہیئے۔

چنانچہ تین حصے کلیات اکبر کے پیش کئے جا چکے ہیں۔ پہلا حصہ ایک جلد میں اور دوسرا اور تیسرا حصہ دوسری جلد میں ــــ چوتھا حصہ اور گاندھی نامہ وغیرہ اور بقیہ تمام مطبوعہ و غیر مطبوعہ کلام خدا کو منظور ہوا تو تیسری جلد میں آ جائے گا۔

اگرچہ تبدیلی نہیں کی، تاہم تھوڑا بہت فرق کلیات کے سابقہ ایڈیشنوں اور بزم اکبر کے شایع کردہ ایڈیشنوں میں ضرور ہے۔ کم از کم لکھائی چھپائی اور جلد بندی کا فرق۔

بزم اکبر کی شائع کردہ جملہ کتابیں مجلّد ہیں اور اس قدر شاندار کہ شاندار سے شاندار کتابوں کے برابر رکھی جا سکتی ہیں۔

ترتیب کو زیادہ چھیڑے بغیر کلیات اکبر شایع کر دینے کے بعد نئی ترتیبوں کا دور آپہنچا اور اس دور کا ثمر اول قطعات و رباعیات اکبر کا مجموعہ آپ کے سامنے ہے۔ یہ قطعات و رباعیات اکبر کا ایک حصہ ہے۔ دوسرا حصہ انشاء اللہ جلد ملاحظہ سے گزرے گا۔ قطعات و رباعیات اکبر ابھی نصف باقی ہیں۔

قطعات و رباعیات اکبر کی کلیات سے چھٹائی اختر انصاری صاحب اکبر آبادی نے فرمائی ہے اور ان کی تبویب، ترتیب، تشریح، عنوانات قایم کرنا اور فہرست بنانا سب جناب بھیا احسان الحق صاحب کے کام ہیں۔

بزم اکبر بھیا کی از حد ممنون ہے کہ انہوں نے اپنے علم و فضل اور اپنی اہلیت و صلاحیت سے بزم کو فایدہ اٹھانے کا موقع بخشا۔

اختر انصاری صاحب کی مستعدی اور حضرت اسد ملتانی کے مشوروں کی بھی بزم شکر گزار ہے۔ حقیقتاً تجویز اسد صاحب کی تھی جسے میں نے اختر انصاری صاحب سے شروع اور بھیا سے مکمل کرایا۔

مسٹر مشتاق احمد، معتمد بزم اکبر خاص میرے شکریہ کے مستحق ہیں۔ جس طرح عزت مآب جناب سردار عبد الرب صاحب نشتر نے کلیات اکبر حصہ دوم و سوم کی اشاعت میں دست گیری کی تھی اسی طرح مشتاق احمد صاحب نے قطعات و رباعیات اکبر کی اشاعت میں ہمت دکھائی اور ہمت بندھائی۔ حالات ایسے بگڑے تھے کہ مشتاق احمد صاحب بزم کے سکریٹری نہ ہوتے تو قطعات و رباعیات اکبر کا مسودہ پڑا ہی رہ جاتا۔

اللہ تعالیٰ کی مہربانیوں کی بابت تو کہنا کیا ہے ؎

جو کچھ کہ ہوا، ہوا کرم سے تیرے جو کچھ ہوگا ترے کرم سے ہوگا

۲۶ رجب ۱۳۷۱ھ — محمد واحدی

۲۲ اپریل ۱۹۵۲ء — ناظم شعبۂ تصنیف و تالیف، بزم اکبر۔ کراچی

عذرِ تقصیرِ خدمت

حضرت اکبر الہ آبادی کے کلام سے تھوڑی بہت دل چسپی تو مجھے اُس زمانہ میں ہو گئی تھی جبکہ میں نے علمی و ادبی شعور کی منزل میں قدم رکھا ہی تھا کیونکہ جس مشرقی ثقافت و تہذیب اور جن مذہبی خیالات و رجحانات کا رنگ حضرت اکبر کے اشعار میں نمایاں تھا تقریباً اُسی تہذیب کے ماحول میں میں نے ہوش سنبھالا تھا اور اُن ہی خیالات و رجحانات کے زیرِ سایہ میں نے تربیت پائی تھی۔ پھر جب شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب سے جو حضرت اکبر کو اپنا معنوی استاد سمجھتے اور کہا کرتے ہیں میری نیازمندی کا سلسلہ شروع ہوا۔ یعنی اب سے تقریباً ۵۰ سال قبل، تو حضرت اکبر کے کلام ہی کے ساتھ نہیں بلکہ اُن کی ذات کے ساتھ بھی میری عقیدتمندانہ دل چسپی بڑھتی رہی جو ابھی تک موجود ہے۔ اگرچہ میرے ذہنی اور اعتقادی انقلاب کی وجہ سے اُس کی نوعیت میں کافی تبدیلی ہو گئی ہے۔

کراچی میں بزمِ اکبر قائم ہونے پر میرے شفیق مکرم جناب مُلّا واحدی صاحب اور عزیز محترم جناب مشتاق احمد صاحب وجدی کے وہ گشتی اعلانات و پیامات مجھ کو بھی دہلی میں پہنچے جو حالات و کلام اکبر کی فراہمی و اشاعت کے مقصد سے شائع کئے گئے تھے اور اس سلسلہ کی خط و کتابت میں واحدی صاحب نے مجھ کو لکھا کہ کلامِ اکبر کی تبویب و تفصیل کا کام

میں اپنے ذمہ لے لوں، یعنی کلام اکبر کو ان کے مطالب و مقاصد کی مناسبت کے لحاظ سے مناسب ابواب و فصول کے تحت ترتیب دیدوں۔ میں بیوی بچوں کے کراچی چلے آنے کی وجہ سے دہلی میں تنہائی اور غیر دلچسپی کی زندگی گزار رہا تھا۔ میرا عزیز کتب خانہ، جو مجھ جیسی حیثیت کے شخص کے لئے بیش قیمت بھی تھا، ۱۹۴۷ء کے نامراد فسادات دہلی کی نذر ہو چکا تھا۔ کلیات اکبر کا کوئی نسخہ میرے پاس موجود نہیں تھا۔ مگر چونکہ کلام اکبر کا کافی حصہ میری نظر سے گزرا ہوا تھا اس لئے مجھے اندازہ تھا کہ اگر کلام اکبر کی صحیح معنوں میں کوئی تبویب و تفصیل کی گئی تو بہت سی نظموں ہی کو نہیں بلکہ بہت سے شعروں کو بھی مختلف مطالب و مقاصد کا حامل ہونے کی وجہ سے کئی کئی بابوں اور فصلوں میں درج کرنے کی ضرورت پڑے گی اور اس طرح یہ ایک خاصا لمبا اور فرصت طلب کام ہو جائے گا۔ جو قیام دہلی کے زمانہ میں مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔ اس لئے میں نے افسوس کے ساتھ واحدی صاحب کو لکھ دیا کہ میں بزم اکبر کی یہ خدمت انجام دینے سے معذور ہوں۔

شروع مئی سنہ ۱۹۵۱ء میں جب میں مستقل طور پر دہلی سے کراچی آگیا تو واحدی صاحب سے ملنے جلنے، تبادلہ خیالات کرنے اور جو کام بزم اکبر کے سلسلہ میں ہو چکا تھا یا ہو رہا تھا اس کا جائزہ لینے کے بعد میں نے دیکھا کہ واحدی صاحب بزم اکبر کے نگران تالیف و اشاعت ہونے کی حیثیت سے بھی اپنی قدیم میانہ روی و عمل پسندی کی عادت کے مطابق طلب کل، کی ہوس سے فوت کل کے خطرہ میں پڑنا نہیں چاہتے اور کچھ ہو جانے کو نہ ہونے سے بہر حال غنیمت سمجھتے ہیں۔ یعنی اُن کا مطمح نظر یہ نہیں ہے کہ جو کام بھی اُن کے ہاتھ سے نکلے یا اُن کی نگرانی میں تکمیل تک پہنچے وہ بہمہ وجوہ مکمل اور بہر لحاظ عیوب و نقائص سے پاک ہو۔ بلکہ وہ مصلحت بیں و کار آساں کن،" کے حکیمانہ اصول کے مطابق یہ چاہتے ہیں کہ بزم اکبر کے سلسلہ میں جو کام بھی اُن کے اور اُن کے رفقائے کار کی امکانی کوشش سے بہ آسانی ہو سکے

وہ ہو جائے۔ تاکہ بزمِ اکبر بھی بہت سی دوسری علمی و ادبی بزموں کی طرح محض نام کی بزم ہو کر نہ رہ جائے اور کچھ نہ کچھ کرتی رہے۔ اگر وہ اپنے بلند مقاصد تک دوڑ کر نہ پہنچ سکے تو کم از کم ان کی طرف استقلال سے بڑھتی تو رہے۔

واحدی صاحب جتنے عملی اور استقامت پسند ہیں بدقسمتی سے میں اتنا ہی غیر عملی اور متلوّن مزاج واقع ہوا ہوں۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ میں کچھ نہیں کرتا، یا کرنا نہیں چاہتا بلکہ مطلب یہ ہے کہ واحدی صاحب ہر ذمہ داری کے کام کو ایسی عملی سلامت روی اور استقلال سے کرتے ہیں کہ ان کی کوششوں کے بُرے بھلے نتائج جلد سامنے آجاتے ہیں۔ برخلاف اس کے میں جس کام میں ہاتھ ڈالتا ہوں۔ خصوصاً تالیف و تصنیف کے کام میں۔ اُس کے متعلق شروع ہی سے میرے ذہن میں کوئی ایسا بلند معیار قائم ہو جاتا ہے جو اُس کام کی انجام دہی میں قدم قدم پر رکاوٹیں پیدا کرتا رہتا ہے اور محض بلندی معیار کی وجہ سے اکثر وہ کام ادھورا رہ جاتا ہے۔ لیکن بزمِ اکبر کا جو کام واحدی صاحب ازراہ خلوص و محبت مجھ سے لینا چاہتے تھے اُس کی انجام دہی میں واحدی صاحب کی میانہ روی و استقلال پسندی نے میری ہمت بندھائی اور واحدی صاحب کے طریق کار کو سامنے رکھ لینے سے میری، بے عملی نے بھی کم از کم ایک بدعملی کی شکل اختیار کر ہی لی جسے میں معذرت و ندامت کے ساتھ اس "مُرتّبہ" کی شکل میں بزمِ اکبر کی طرف سے شائقین کلامِ اکبر کی خدمت میں پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

جہاں تک قطعات و رباعیاتِ اکبر کی تبویب و ترتیب کا تعلق ہے اس میں اگرچہ منطقی تقسیم اور جامعیت و مانعیت کا لحاظ نہیں رکھا جا سکا ہے لیکن مجھے امید ہے کہ یہ ناقص و نامکمل تبویب و ترتیب بھی اُن حضرات کے لئے کافی مفید ثابت ہو گی جو کسی خاص موضوع یا مضمون پر حضرت اکبر کے خیالات اور اُن کی جولانیِ فکر کو یکجا

دیکھنا چاہتے ہیں یا جن کی یہ خواہش ہے کہ کلام اکبر کی تدوین و اشاعت میں ایسی ترتیب ملحوظ رکھی جائے کہ کسی مطلوبہ قطعہ یا رباعی کی تلاش میں اُن کو ورق گردانی کی زیادہ زحمت نہ اٹھانی پڑے۔ میں نے قطعات و رباعیات اکبر کی تدوین و ترتیب اس طرح پر کی ہے کہ اہم مطالب و مضامین کے اشتراک کے لحاظ سے ان کو بابوں پر تقسیم کر دیا ہے۔ مگر فصلیں قائم کرنے کی کوشش مجھ کو مقصد کے لحاظ سے زیادہ مفید معلوم نہیں ہوئی اس لیے بجائے فصلیں قائم کرنے کے میں نے ہر ایک قطعہ اور رباعی کے لیے ایک جداگانہ عنوان ایسا تجویز کر دیا ہے جو اُس قطعہ یا رباعی کے اہم مضمون ہی کی طرف نہیں بلکہ اس کے نمایاں الفاظ کی طرف بھی رہنمائی کر رہا ہے، تاکہ کتاب کی مکمل فہرست مضامین میں بابوں کی سُرخیوں کے نیچے ہر قطعہ اور رباعی کا جداگانہ عنوان بھی درج ہو جانے سے اس قطعہ یا رباعی کا تلاش کرنا شائقین کے لیے آسان ہو جائے اور فہرست مضامین پر سرسری نظر ڈالنے سے مضامین و مطالب کتاب کا ایک مکمل خاکہ قارئین کتاب کے ذہن میں آجائے۔

جو ابواب قطعات و رباعیات اکبر کے لیے قائم کیے گئے ہیں اُن ہی کے تحت میں یا صرف چند نئے ابواب کے اضافہ کے بعد حضرت اکبر کی بہت سی باقی ماندہ نظموں کے اشعار بھی درج کیے جا سکتے ہیں۔ اور کلام اکبر خصوصاً اکبر کے اصلاحی اور تبلیغی کلام کی اشاعت کا حقیقی مقصد جب ہی پورا ہو سکتا ہے کہ حضرت اکبر کے منتخب اشعار کا ایک ایسا محشّٰی مجموعہ ابواب و فصول کے ماتحت ترتیب دے کر شائع کیا جائے جس میں قومی و ملی مقاصد و خیالات سے تعلق رکھنے والے وہ تمام بلند پایہ اشعار یکجا کر دیے جائیں جو کُلّیات کی مختلف جلدوں میں منتشر ہیں۔ خواہ وہ غزلوں یا مسلسل نظموں کی شکل میں ہوں، یا قطعات و رباعیات و ابیات کی شکل میں۔

ابتداءً واحدی صاحب نے قطعات و رباعیات اکبر کی صرف تبویب و تدوین کا کام میرے سپرد کیا تھا

اور یہ کام میرے لئے زیادہ دشوار بھی نہیں تھا۔ مگر قطعات و رباعیات کی تبویب و تدوین کے سلسلہ میں مجھ کو کافی اشعار ایسے ملے جن کے مطالب و مقاصد اور محاسن شعری و ادبی کی طرف میرا ذہن بآسانی منتقل نہیں ہو سکا اور میں نے یہ سوچا کہ اس مجموعۂ کلام کے مطالعہ کرنے والوں میں کم از کم پچھتر فی صدی ایسے ضرور ہوں گے جن کی کم استعدادی و کم فہمی میری طرح اکثر قطعات و رباعیات اور خصوصاً اکبر کے بلند پایہ اشعار کے صحیح مفہوم تک پہنچنے اور اُن کے محاسن لفظی و معنوی سے پورے طور پر لطف اندوز ہونے میں مانع ہوگی، اس لئے مجھے یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ قطعات و رباعیات کو معرّیٰ نہیں بلکہ محشّیٰ شائع کیا جائے۔ تاکہ کلام اکبر کی مقبولیت و افادیت صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات ہی تک محدود نہ رہے بلکہ کم استعداد رکھنے والے وہ نوجوان اور طالبانِ علم بھی اس سے مستفید و محظوظ ہو سکیں جن کے خیالات و رجحانات کو کورانہ تقلید کی بے اعتدالیوں سے بچانا حضرت اکبر کی شاعری و جگر کاوی کا سب سے بڑا مقصد رہا ہے اور جن کو اردو شعر و شاعری کی بعض قابل قدر خصوصیتیں کلام اکبر میں مل سکتی ہیں جو کسی دوسرے مشرقی شاعر کے کلام میں مجموعی طور پر نہیں مل سکتیں۔

قطعات و رباعیات اکبر کو محشّیٰ شائع کرنے کی ضرورت کے متعلق جب میں نے اپنے مذکورہ خیال کا اظہار واحدی صاحب سے کیا تو اُنہوں نے بھی میری اس رائے سے اتفاق کیا مگر شاید اس غلط فہمی میں کہ یہ مشورہ میں نے اِس لئے دیا ہے کہ حاشئے لکھنے کا کام بھی میں خود ہی کرنا چاہتا ہوں بلا تامل یہ فرما دیا "تو حاشئے بھی آپ ہی لکھ دیجئے" حالانکہ میرا خیال یہ تھا کہ اس اہم اور ذمہ داری کے کام کے لئے واحدی صاحب کی نظر انتخاب کسی ایسے شخص پر پڑے گی جو مولانا عبد الماجد دریا بادی کی طرح ماہر ادبیات و عالم معانی و بیان بھی ہو۔ مذہب و تصوف اور حکمت و فلسفہ میں کافی دستگاہ رکھتا ہو۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حضرت

اکبر کا ہم مذاق و ہم خیال ہو اور حضرت اکبر سے ذاتی روابط و مراسم رکھنے کا بھی اسے امتیاز حاصل ہو۔ مگر واحدی صاحب نے کلام اکبر پر حاشیہ نگاری کے لئے ان تمام اہلیتوں کی موجودگی کی ضرورت کو نظرانداز کر کے یا یہ کہ میری نااہلیتوں کی طرف سے عمداً آنکھیں بند کر کے محض مصلحت بین و "کار آساں کن" کے اصول عمل کو سامنے رکھا اور میری معذرتوں کے باوجود قطعات و رباعیات اکبر پر حاشیہ نگاری کا اہم و دشوار کام بھی میرے ہی سپرد کر دیا اور میں نے بھی یہ سوچ کر کہ جب یہ کام مجھے کسی ایسے بلند معیار پر نہیں کرنا ہے جو میری قابلیت و استعداد علمی کی پہنچ سے باہر ہو یا جو مولانا دریابادی جیسے قابل لوگوں کے اونچے معیار پر پورا اُتر سکے۔ ہرچہ بادا باد، کو نصب العین بنا کر طوعاً و کرہاً اسے شروع کر دیا اور تقریباً آٹھ نو مہینے کی کاوش و کوشش کے بعد بُرا بھلا جیسا بھی بن پڑا کم از کم ایک ایسی شکل میں تکمیل تک پہنچا دیا جسے واحدی صاحب نے بزم اکبر کی طرف سے شائع کرنا گوارا کر لیا۔

ضعیف العمری و دائم المرضی کی وجہ سے حافظہ اس قدر کمزور ہو گیا ہے کہ روزمرہ کے الفاظ کے معنی بھی بعض وقت یاد نہیں آتے اور مذہبی و تاریخی معلومات کا اگر کوئی دھندلا سا خاکہ ذہن میں موجود بھی ہوتا ہے تو اس کی صحت پر پورا بھروسہ نہیں ہوتا۔ اس لئے ضروری کتب لغات و کتب معلومات کی موجودگی کے بغیر قطعات و رباعیات اکبر پر حاشیہ نگاری کا کام انجام دینا میرے لئے ناممکن تھا کچھ کتابیں تو میں نے خرید لیں جن کی دوسرے کاموں کے لئے بھی مجھے اکثر ضرورت پڑتی رہتی تھی اور کچھ کتابیں مخدومی جناب حکیم حافظ محمد سعید صاحب مالک ہمدرد دواخانہ کراچی نے اپنے کتب خانہ سے مستعار عنایت فرما دیں۔ مگر ان فراہم شدہ کتابوں کی موجودگی کے باوجود میری تمام دشواریاں حل نہیں ہو سکیں اور میں بہت سی توضیح طلب باتوں پر خاطر خواہ حواشی لکھنے میں کامیاب

نہیں ہو سکا بلکہ کئی قطعات و رباعیات کا مفہوم سمجھ میں نہ آنے یا اپنے سمجھے ہوئے مفہوم پر پورا اطمینان نہ ہونے کی وجہ سے مجھے واحدی صاحب کو لکھنا پڑا کہ وہ ایسے اشعار پر مولانا دریابادی وغیرہ سے حاشئے لکھوالیں۔ چنانچہ کچھ حاشئے جن کی تعداد غالباً پانچ چھ سے زیادہ نہیں ہے دوسرے صاحبان کے لکھے ہوئے بھی آپ کو اس مجموعہ میں ملیں گے جن کے آخر میں میں نے حاشیہ نگار صاحب کا نام درج کر دیا ہے اور کچھ اشعار جن کو میں ٹھیک طور پر نہیں سمجھ سکا تھا اور جن پر دوسرے صاحبان سے بھی حاشئے لکھوانے کی واحدی صاحب نے ضرورت نہیں سمجھی وہ اس مجموعہ میں شامل نہیں کئے گئے ہیں۔ لیکن ایسے شعروں کی تعداد بھی کچھ زیادہ نہیں ہے۔

قطعات و رباعیات پر حاشئے لکھنے میں جو مقصد میرے سب سے زیادہ پیش نظر رہا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت اکبر کے کم از کم ایسے اشعار جو دقیق رموز تصوف و نکات حکمت و فلسفہ کے حامل نہیں ہیں اور جن میں نازک استعارات و کنایات یا بلند صنائع و بدائع سے کام نہیں لیا گیا ہے ان کے الفاظ و معانی کی ایسی عام فہم توضیح و تشریح کر دی جائے کہ معمولی استعداد کے اردو خواں بھی ان شعروں کو بخوبی سمجھ لیں اور اُن کے لفظی و معنوی محاسن ادبی سے بھی وہ بقدر اپنی استعداد کے مستفید و محظوظ ہو سکیں۔ اسی مقصد کے ماتحت مجھ کو بہت سے ایسے لفظوں کی بھی لغوی توضیح و تشریح کرنی پڑی ہے جو اگرچہ استعمال تو عام طور پر ہوتے ہیں لیکن اشعار اکبر میں ان کے استعمال کا پورا لطف جب ہی حاصل ہو سکتا ہے کہ اُن کے لغوی اور مجازی معنی بلکہ ان کی اشتقاقی کیفیت بھی معلوم ہو۔ جن ذی استعداد حضرات کو ایسے کثیر الاستعمال الفاظ کی لغوی و معنوی توضیحات غیر ضروری معلوم ہوں ان کو ثانوی درجہ کے کسی طالب علم سے فیصلہ کرانا چاہیئے کہ وہ کس حد تک ضروری ہیں یا غیر ضروری۔

اسی طرح قطعات ورباعیات میں جو توضیح طلب الفاظ یا تلمیحات وغیرہ بار بار آئی ہیں، حاشیوں میں بھی ان کی بار بار توضیح ہونے سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیئے کہ یہ تکرار توضیحات فضول ہے۔ بلکہ اس تکرار کا مقصد یہ ہے کہ جو لوگ کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ نہ کر سکیں انہیں کسی خاص شعر یا اشعار کے سمجھنے کے لئے مکرر استعمال ہونے والے لفظوں وغیرہ کی توضیحات پچھلے حاشیوں میں تلاش کرنے کی زحمت نہ ہو بلکہ خود اسی شعر یا اشعار کے حاشیوں سے ان کا مقصد پورا ہو جائے۔ کم استعداد مطالعہ کرنے والوں کی کم استعدادی کا لحاظ رکھنے کے لئے حاشیوں میں طوالت تو ضرور ہو گئی ہے مگر اس طوالت کے مقابلہ میں کتاب کی فائدہ رسانی میں جو اضافہ ہوا ہے وہ زیادہ قابل لحاظ ہے۔

جو اشعار اکبر دقیق رموز ونکات تصوف وحکمت کے حامل ہیں ان کی معنوی مشکلات کے حل کرنے کی بھی میں نے امکانی کوشش کی ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ میری اس کوشش سے کم استعداد کے مطالعہ کرنے والوں کو پورا فائدہ نہیں پہنچے گا۔ اور جن قابل حضرات کے ذہن ان اشعار کے حقایق تک پہنچ سکتے ہیں ممکن ہے کہ وہ میری تشریحات سے مطمئن نہ ہوں۔ یا ان میں غلطیاں پائیں ان قابل حضرات کی خدمت میں تو سوائے اپنی کم استعدادی کی معذرت کے میں کوئی اور صفائی پیش نہیں کر سکتا اور کم استعداد حضرات سے یہہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ ایسے اشعار سے پورے طور پر مستفید ہونے کے لئے اپنی استعداد علمی کے بڑھنے کا انتظار کریں۔

حضرت اکبر کے کلام میں استعارات وکنایات اور صنائع وبدائع وغیرہ کی ایسی بے شمار خوبیاں ملتی ہیں کہ ان سب کی پوری توضیح وتشریح کی جاتی تو حاشئے اور بھی طویل ہو جاتے۔ اس لئے میں نے صرف

ایسے محاسن شعری و ادبی کی طرف اشارات کر دینے کافی سمجھے ہیں جن کا اثر شعر کے مطالب و مقاصد پر بھی پڑتا تھا یا جن تک سطحی نظریں مشکل سے پہنچ سکتی تھیں۔

جو لوگ مجھ سے یا میرے خیالات سے واقف ہیں ممکن ہے کہ انہیں یہ شبہ ہو کہ حضرت اکبر کے اشعار پر حواشی لکھنے میں میں نے اپنے خیالات و رجحانات کو بھی دخل دیا ہے لیکن دوسروں کے خیالات کی ترجمانی کے فرض کو میں بالکل ایسا ہی سمجھتا ہوں جیسے کسی کی رکھوائی ہوئی امانت کا واپس کرنا۔ یعنی میرے نزدیک کسی دوسرے کے خیالات کو اُن سے خود متفق نہ ہونے کی بنا پر توڑ مروڑ کر یا اپنے خیالات کے رنگ میں رنگ کر پیش کرنا ایک بڑی بددیانتی ہے۔ اس لئے کئی باتوں میں حضرت اکبر سے اصولی اختلاف رکھنے کے باوجود میں نے اپنے اختلافات کو نہ صرف یہ کہ بالکل نظر انداز کر دیا ہے بلکہ اپنے آپ کو حضرت اکبر کا ایک ہم خیال تصور کر کے ان کے خیالات و معتقدات کی تائید میں دلیلیں بھی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لئے میرے لکھے ہوئے حاشیوں سے پڑھنے والوں کو نہ تو یہ غلط فہمی ہونی چاہیئے کہ ان میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ حضرت اکبر کے نہیں بلکہ میرے خیالات ہیں اور نہ یہ سمجھنا چاہیئے کہ اپنے خیالات کے خلاف کسی حاشئے کے لکھ دینے سے میرے خیالات و معتقدات میں کوئی تبدیلی واقع ہو گئی ہے۔

تالیفی اور تصنیفی کاموں کے انجام دینے میں ایک بڑی رکاوٹ مجھ کو یہ پیش آیا کرتی ہے کہ اپنی غلطیاں اور کوتاہیاں تو مجھے اکثر نظر آجاتی ہیں لیکن ان غلطیوں اور کوتاہیوں کی اصلاح میں اپنی

کم علمی و کم اہلیتی کی وجہ سے بہ آسانی نہیں کر سکتا۔ یعنی علمی و عملی قابلیت کے مقابلہ میں میری تنقیدی اہلیت بڑھی ہوئی ہے اس لئے میری غلطیاں میرے ہی دل میں کانٹوں کی طرح چبھا کرتی ہیں۔ قطعات و رباعیات اکبر پر حاشیئے لکھتے وقت اگرچہ میں نے اپنی تنقیدی آنکھوں پر اندھیری عینک لگا رکھی تھی تاکہ میری غلطیاں مجھ کو کم از کم ایسی بھیانک نہ نظر آئیں جس سے میری ہمت ٹوٹ جائے اور یہ کام بھی میرے ہاتھ سے انجام کو نہ پہنچ سکے۔ لیکن اس کے باوجود میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ حضرت اکبر کے کلام پر حاشیئے لکھنے میں میرے دماغ نے کافی ٹھوکریں کھائی ہیں اور میرے قلم نے بھی۔ اور ان معلوم و محسوس غلطیوں کے علاوہ یقیناً ایسی بہت سی غلطیاں اور کوتاہیاں بھی مجھ سے ہوئی ہوں گی جن تک میری تنقیدی نظر بھی نہیں پہنچ سکی ہے۔ ایسی سب غلطیوں اور کوتاہیوں کے لئے میں اپنی نا اہلیت کا عذر پیش کر کے تمام بالغ نظر قارئینِ کتاب سے مستدعی ہوں کہ جو غلطی بھی ان کے علم میں آئے یا جس اصلاحی ضرورت کو وہ محسوس کریں اس سے کارکنان بزم اکبر کو مطلع کرتے رہیں تاکہ آیندہ اشاعتوں میں اُن کے مفید مشوروں سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔

کسی وقیع مصنف کے کلام پر حاشیئے لکھنے والے کا ایک فرض عام طور پر یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ وہ مصنف کے حالات زندگی پر بھی کچھ روشنی ڈالے اور اس کے کلام کی خصوصیات پر تبصرہ و تنقید بھی کرے مگر میں نے اپنے دیئے ان دونوں باتوں کو اس لئے ضروری نہیں سمجھا کہ یہ کتاب بزم اکبر کی طرف سے شائع ہو رہی ہے اور بزم اکبر ملا واحدی صاحب کی تالیف کردہ حضرت اکبر کی ایک کافی مفصل دلچسپ سوانح عمری ”حیات اکبر“ کے نام سے شائع کر چکی ہے اور حضرت اکبر کے اصلاحی و تبلیغی مقاصد اور اُن کے کلام

کی شاعرانہ اور ادبی خصوصیات پر ۲۶ کافی مشہور شعراء و ادبار کے بصیرت افروز تنقیدی و تقریظی مضامین نثر کا ایک دل آویز مجموعہ جناب اختر انصاری صاحب اکبر آبادی کا مرتب کردہ۔ "اکبر اس دور میں" کے نام سے بزم اکبری نے حسال میں شائع کیا ہے اور غالباً مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی کے قلم سے نکلے ہوئے کچھ بلند پایہ مضامین جن کا تعلق بھی حضرت اکبر کے حالات زندگی اور ان کی خصوصیات کلام سے ہے عنقریب بزم اکبری کی طرف سے کتابی شکل میں پیش کئے جانے والے ہیں۔ ان تینوں کتابوں کی موجودگی میں قطعات و رباعیات کے ساتھ سوانح اکبر و تبصرہ کلام اکبر کے شامل نہ ہونے کو امید ہے کہ زیادہ قابل اعتراض نہیں سمجھا جائے گا۔ اگر کلام اکبر کا کوئی ایسا مکمل انتخاب کبھی شائع کیا گیا جو حضرت اکبر کی شاعری کی تمام اصناف اور تمام خصوصیات کا حامل ہوا تو اس کے ساتھ سوانح اکبر و تبصرہ کلام اکبر کے شامل کرنے کی ضرورت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جائے گا۔

احسان الحق

کراچی۔
۲۲ اپریل ۱۹۵۲ء

حمد و دعا

اور

نعت و منقبت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جمال اُس کا۔ جلال اُس کا

وہی ہنسائے، وہی رُلائے، وہی جگائے، وہی سُلائے
وہی بگاڑے، وہی سنوارے، وہی نکالے، وہی بلائے

اُسی سے خوش رہ، اُسی کا غم کر، اُسی کو دیکھ اور اُسی میں[۱] گُم ہو
دُعا اُسی سے، ثنا اُسی کی، جو گِر تو چپ ہو، سنبھل جو قُم[۲] ہو

جہانِ فانی کے کُل کوائف، اُسی کی قدرت کے ہیں لطائف
اُسی کی رحمت پہ کوئی غافل، اُسی کی عظمت سے کوئی خائف

دلوں کا مالک، نظر کا حاکم، سمجھ کا صانع، خِرد کا بانی
جمال اُسی کا، جلال اُسی کا، اُسی کو زیبا ہے لَن ترانی[۳]

---

۱ یعنی اپنی ہستی کو خدا کی ہستی اور خودی میں محو کر دے۔ ۲ قُم عربی بمعنی "کھڑا ہو"۔ ۳ لَن تَرَانِی۔ عربی بمعنی "تو مجھے ہرگز نہ دیکھ سکے گا"۔ اشارہ ہے آیت قرآنی وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰی لِمِیْقَاتِنَا وَکَلَّمَہٗ رَبُّہٗ قَالَ رَبِّ اَرِنِیْ اَنْظُرْ اِلَیْکَ، قَالَ لَنْ تَرَانِیْ (ترجمہ) اور جب موسیٰؑ ہمارے وعدہ کے مطابق (کوہ طور پر) حاضر ہوئے اور اُن کا پروردگار اُن سے ہمکلام ہوا، تو موسیٰؑ نے کہا کہ اے میرے پروردگار تو اپنے تئیں، مجھے دکھا کہ میں تیری طرف ایک نظر دیکھوں۔ خدا نے فرمایا تو مجھے ہرگز نہیں دیکھے گا۔

خدا کی سلطنت کی جوبلی

فلک پر شان و عظمت سے ستارے جگمگاتے ہیں
خدا کی سلطنت کی جوبلی[1] ہر شب مناتے ہیں

یہی نظارہ ہم کو محو رکھتا ہے سدا اکبر
فرشتے بے ٹکٹ[2] یہ منظرِ اعظم دکھاتے ہیں

وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکْ

حضرتؐ کی نبوت میں ہو کس طرح مجھے شک
ہر ذرہ کو ہے وردِ وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکْ[3]

تھی شانِ جلالی کہ عدو رُک گئے آخر
وہ نور تھا عالی کہ صنم (بُت) جھک گئے آخر

بعد از خدا بزرگ توئی قصّہ مختصر

احباب نے طویل مضامیں وہاں پڑھے
لیکن مری زبان کا نغمہ تھا مختصر

میں نے تو بزمِ نعت میں اتنا ہی پڑھ دیا
بعد[4] از خدا بزرگ توئی قصّہ مختصر

---

[1] جوبلی انگریزی JUBILEE بمعنی جشن یعنی خدا کی قدرت اور اُس کی عظمت و شان کو آشکارا کرتے اور یاد دلاتے ہیں۔

[2] بے روک ٹوک اور بلا معاوضہ، [3] آیت قرآنی یعنی "اور ہم نے تمہارے ذکر (خیر) کا آوازہ بلند کیا"

[4] یہ فارسی مصرع شیخ سعدیؒ شیرازی کے شعر لَا یُمْکِنُ الثَّنَاءُ کَمَا کَانَ حَقُّہٗ - بعد از خدا بزرگ توئی قصّہ مختصر۔ کا ہے۔

اسلامیت

اور

عرفانیت

فرعون بھی ہیں اور محمدؓ و عونؓ بھی

ایسے بھی ہیں خلق جن کو فرعون[1] کہے
ایسے بھی ہیں جنھیں محمدؓ[2] و عونؓ کہے
میں نام بنام تم سے کہتا اکبرؔ
نازک ہے مگر معاملہ کون کہے

ترکِ موالات اور اسلام

ہو جو تقوے کے سوا ترکِ موالات[3] کچھ اور
تو وہ اسلام نہیں بلکہ ہوئی بات کچھ اور
علما خوش ہوئے سن کر یہ مرا شعر اکبرؔ
ہاں مخالف نے کہا، بکتے خرافات کچھ اور

حمدِ خدا و نزاعِ حمید و حامد

معاملہ تھا عرب کا خدائے واحد سے
عجم نے واسطہ رکھا شراب و شاہد سے
ادھر تھی حمد خدا ہی سے آشتی دل کو
ادھر تھی بحث نزاعِ حمید[4] و حامد سے

---

[1] لقب بادشاہانِ مصر۔ مگر یہاں خاص طور پر وہ سرکش و مغرور بادشاہ مراد ہے جس نے موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں دعوائے خدائی کیا تھا۔ [2] محمدؓ اور عونؓ۔ یہ دونوں حضرت عبداللہؓ، ابن حضرت جعفر طیار اور حضرت زینبؓ بنت حضرت علیؓ یعنی خواہر حضرت امام حسینؓ کے صاحبزادے تھے۔ جو اپنے ماموں حسین مظلوم کی طرف سے میدانِ کربلا میں یزید لعین کے لشکرِ جرار سے لڑ کر شہید ہوئے تھے۔ فرعون نے خدا سے سرکشی کی تھی اور انہوں نے راہ خدا میں سرفروشی۔ [3] ترکِ موالات بمعنی ایک دوسرے کی امداد اور آپس کے میل جول کا ترک کرنا۔ گاندھی جی کی تحریک نان کواپریشن کی انگریزی اصطلاح کا اردو ترجمہ [4] نزاعِ حمیدؔ و حامد سے مراد ہے معاملاتِ دین میں علمائے ظاہر کی فضول لفظی کج بحثیاں۔ جب تک اسلام پر عجم یعنی فارس وغیرہ کا اثر نہیں پڑا تھا۔ اس وقت تک مسلمان اسلام کی سیدھی سادی تعلیمات پر عامل تھے۔ عجمیت کا دخل ہونے پر دین میں بھی ایسی عقلی اور فلسفیانہ موشگافیاں ہونے لگیں کہ مسلمانوں کے دل روح اسلام سے ہٹ کر ان لفظی کج بحثیوں میں الجھ گئے۔

اثرِ قرآن اور راویوں کا لشکر

سر رشتۂ اتحاد ہم سے چھوٹا
آپس ہی کی خانہ جنگیوں نے لوٹا
قرآن کے اثر کو روک دینے کے لئے
ہم لوگوں پہ راویوں[1] کا لشکر ٹوٹا

فہمِ قرآن مجید

حق نے جنہیں دی ہے فہمِ قرآن مجید
ہونے کے نہیں وہ پیرِ گردوں کے مرید
بدلے سو رنگ انقلابِ دنیا
ہر حال میں اُن کو ہے خدا ہی سے اُمید

عجم میں جم عرب میں رب کا جلوہ

گذرا ہے مری نظر سے سب کا جلوہ
سب سے بہتر ہے روز و شب کا جلوہ
کہتا ہے عجم، عجم میں جم[2] ہے موجود
کہہ دو کہ عرب میں دیکھ رب کا جلوہ

---

[1] راویوں کے لشکر سے مراد راویانِ حدیث کی کثرت اور ثقہ و غیر ثقہ ہونے کے مباحث ہیں۔ اس طعن سے حضرت اکبر کے اہل قرآن ہونے کا نتیجہ نہیں نکالنا چاہیئے۔ بلکہ اُن کا مقصد صرف یہ ہے کہ حدیثوں کی بحث میں پڑ کر مسلمانوں کی توجہ قرآن مجید کی طرف سے ہٹ گئی ہے۔ [2] جم نام ہے بادشاہ فارس جمشید کا جس کا جامِ جم مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ اس جام پر ایسے نقوش تھے جن سے غیب کے حالات معلوم ہو جاتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ اہل عجم کی پیروی سے دنیاوی شان و شوکت اور رسولِ عربیؐ کی پیروی سے قربِ رب حاصل ہوتی ہے۔

پہلے خانہ، پھر خانہ داری

قرآن وحدیث میں ہے ڈوبا واعظ ۔ چھپاں ہو مگر یہ اس کا مضمون کہاں
گھر[1] پہلے بنا کے خانہ داری سکھلا ۔ ملت ہی نہیں ہے جب تو قانون کہاں

اشد حبا للہ

ہے اُن کی جبیں اور بتوں کی درگاہ ۔ ہیں شرک[2] خفی میں مبتلا شام و پگاہ
کس کو یہ خیال ہے کہ مومن کے لئے ۔ قرآں میں ہے اَشَدُّ[3] حُبّاً لِلّٰہ!

مومن کی دنیا

ہر ساعت رخت بستہ دنیا میں رہے ۔ مغموم و ملول و خستہ دنیا میں رہے
عاشورہ ہے ہر روز پس از قتل حسینؑ ۔ مومن[4] اب دل شکستہ دنیا میں رہے

---

[1] مطلب یہ ہے کہ احکام قرآنی کی تبلیغ مفید جب ہی ہو سکتی ہے کہ قوم و ملت میں اُن کے قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ یعنی پہلے افراد قوم میں وہ بنیادی اہلیتیں پیدا ہو جائیں جن سے ملت کی تعریف اُن پر صادق آنے لگے [2] شرک خفی یہ ہے کہ کسی غیر خدا میں ایسی کسی صفت کے ہونے کا اعتقاد رکھا جائے جو خدائے واحد کے لئے مخصوص ہے۔ اور شرک جلی شرک ظاہر و صریح کو کہتے ہیں۔ جیسے بت پرستی، قبر پرستی وغیرہ [3] آیت قرآنی ہے وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ اور جو ایمان والے ہیں اُن کو (تو سب سے) بڑھ کر خدا کی محبت ہوتی ہے۔ [4] حدیث ہے الدُّنیا سِجنُ المومن دنیا مومن کے لئے قید خانہ ہے۔

مراقبہ اور دل کی توجہ

جو چاہے کفر کے آگے سر تسلیم خم کرنا | بجا ہے تم کو اکبر اپنا ملنا اُن سے کم کرنا
مراقب[1] کو بہت آسان ہے گردن کو خم کرنا | مگر مشکل ہے دل کو یادِ خالق سے بہم کرنا

صبر و صلوٰۃ سے مدد

تری معین فقط ہے خدا کی ذات اے دوست | خدا گواہ کہ سچی یہی ہے بات اے دوست
طلب مدد کی نہیں اُن سے جو ہیں خود محتاج | طلب مدد کی ہے بالصّبرِ والصّلوٰۃ[2] ای دوست

انسان - ایمان اور مسلمان

اُلفت اور ادب نہیں تو انسان نہیں | بے صبر و سکوں جو ہو تو ایمان نہیں
جو غیر خدا کو مانتا ہو قادر | اکبر بخدا کہ وہ مسلمان نہیں

قرآن کو بغور پڑھنے اور سمجھنے کی ضرورت

ہر حال میں بہر روح انسب وہ ہے | اللہ و رسول کا بھی مطلب وہ ہے

---

[1] مراقب یعنی مراقبہ کرنے والا۔ یعنی صوفیوں کے طریقوں کے مطابق گردن نیچی کرکے خدا کو یاد کرنے والا۔

[2] اشارہ ہے آیت قرآنی اِسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃ کی طرف جس کا ترجمہ ہے "مدد طلب کرو صبر اور نماز کے ذریعہ) سے"۔

قرآن کو غور سے پڑھو اور سمجھو   اکبر بجز اکہ جانِ مذہب وہ ہے

ایماں برائے طاعت و مذہب برائے جنگ

دیکھا مناظروں کا بہت اُس نے رنگ ڈھنگ   اکبر کے دل میں اب نہ رہی بحث کی اُمنگ
کہتے بہت صحیح تھے یہ حضرت مذاق[1]   ایماں[2] برلئے طاعت و مذہب برائے جنگ

ہم — ہم

رکھو جو مقابل اُس کے سارا عالم   دنیا بخدا ہے اک ذرّے سے بھی کم
اُس اک ذرّے میں ہے ہماری کیا اصل   نافہم ہیں کر رہے ہیں ناحق ہم[3] — ہم

اللہ — اللہ

مسکین گدا ہو یا ہو شاہِ ذی جاہ   بیماری و موت سے کہاں کس کو پناہ
آہی جاتا ہے زندگی میں اِک وقت   کرنا پڑتا ہے سب کو اللہ - اللہ

---

[1] خان بہادر شیخ احمد حسین صاحب مذاق تعلقہ دار پرپاواں ۔ یہ حضرت اکبر کے سمدھی تھے ۔ [2] ایمان اور مذہب سے یہاں مذہب کا باطن اور ظاہر مراد ہے ۔ جیسے مولانا رومیؒ نے اپنے شعر "من ز قرآں مغز را بر داشتم ۔ استخواں پیشِ سگاں انداختم" میں مغز اور استخواں سے تعبیر کیا ہے ۔ [3] ہم ۔ ہم کرنے سے مراد ہے خود پرستی و خود نمائی ۔

حسن کی دل کشی اور بُت پرستی

تاثیر ہوائے باغ ہستی نہ گئی
صورت کی ادا، نظر کی مستی نہ گئی

ہوتے ہی رہے جمال دل کش پیدا
طبعِ انساں سے بُت پرستی نہ گئی

مشرق کی غزل اور مغرب کی رفل

وجد آجاتا ہے مشرق کی غزل کو دیکھ کر
ہوش اُڑ جاتا ہے مغرب کی رفل[1] کو دیکھ کر

ڈر رہا ہوں ضعف سے ایمان کے اس عہد میں
دیکھئے کیا حال ہوتا ہے اجل کو دیکھ کر

رنگ نبیؐ ——— بوئے علیؑ

بے بصیرت ہے مگر تو منکرِ شیخ و ولی
ناشگفتہ رہ گئی بے شک ترے دل کی کلی

چشم پیدا کن[2] کہ بینی آشکارو ہم نہاں
در قبائے گل رُخاں رنگِ نبیؐ بوئے علیؑ

اللہ ——— سے لگاؤ

پڑتا ہے[3] بتوں سے ساعتِ چند کا کام
تمہید میں اس کی دولت و عمرِ تمام

اللہ سے ہر نفس کا رہتا ہے لگاؤ
دشوار ہے نفس پر عبادت کا نام

---

[1] رفل ہندے ہے انگریزی لفظ رائیفل بمعنی گولی مار بندوق کا۔ [2] یعنی ایسی آنکھ پیدا کر کہ گل رخوں (حسینوں) کے ظاہر و باطن میں تجھ کو رنگ نبیؐ اور بوئے علیؑ نظر آنے لگے۔ [3] مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے انسان کی محتاجی کا تعلق اگرچہ ایک ایسا تعلق ہے جس سے کسی آن میں بھی انسان مستغنی نہیں ہو سکتا لیکن اس کے باوجود اللہ کی عبادت انسان کو بہت شاق گزرتی ہے اور جن غیر اللہوں سے انسان کی محتاجی کا واسطہ بہت تھوڑے عرصہ کے لئے پڑتا ہے اُن کی دل جوئی و خوشنودی کے لئے وہ اپنی ساری زندگی اور دولت و مال کو قربان کر دیتا ہے۔

تائیدِ ملّت و دین

تائید[1] وضعِ ملّتِ دیں کی کروں گا میں — اہلِ زمانہ لاکھ ہنسیں مجھ غریب پر
ہوتا نہیں طبیب مداوا (علاج) سے دست کش — سچ ہے اجل تو ہنستی ہی سعئ طبیب پر

فیضِ حضرت سے غم غلط

فیضِ[2] حضرت بہر نمط (بہر طور) ہوتا ہے! — دل کو مرے حظ (خوشی) ہی فقط ہوتا ہے
ہر امرِ غلط کی ہوتی ہے یاں تصحیح — اور لطف یہ ہے کہ غم غلط ہوتا ہے

اسلام بخیر — انجام بخیر

لے جاؤں لحد میں اپنا اسلام بخیر — لکھیں یا رب ملک (فرشتے) میرا نام بخیر
اسلام سے جس نے بے وفائی (یعنی انحراف) کی ہے — پایا نہیں میں نے اس کا انجام بخیر

خزانۂ غیب کا انکار و اعتقاد

طلبِ[3] زر ہے جن کو اے اکبر — وہ رہیں منکرِ خزانۂ غیب

---

[1] یعنی اہلِ زمانہ جو موت اور ہلاکت کی طرف جا رہے ہیں وہ میری تائیدِ وضع ملّت و دین کا خواہ کتنا ہی مذاق اڑائیں مگر میں تو ایک طبیبِ مخلص کی طرح مرضِ قوم کے علاج سے دست کش نہیں ہوں گا [2] مطلب یہ ہے کہ فیاضِ حقیقی یعنی خدا تعالیٰ سے سچا تعلق رکھنے والوں کو کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور پہنچتا ہے اور اُن کے دلوں کو سچی خوشی بھی صرف اسی تعلق سے حاصل ہوتی ہے۔ غلطیوں اور غلط رَویوں کی اصلاح ہوتی رہتی ہے اور دل کو غم و فکر سے نجات ملتی ہے [3] مطلب یہ ہے کہ طالبانِ زر اگر غیب سے دولت نہ ملنے پر خزانۂ غیب کا انکار کریں تو کریں۔ میرے دل میں تو غیب سے میری معنوی دولت یعنی مضامین کا

الہام القا ہوتا ہے اس لئے میں خزانۂ غیب کا منکر نہیں ہو سکتا۔

هم تو مضموں وہیں سے پاتے ہیں　　معتقد ہم تو اُس کے ہیں لاریب

گردن افرازی کی نہیں، جبینِ نیاز کی ضرورت

فتحِ عرب پہ گو ہے تمہیں شوق ناز کا　　بہتر ہے اس سے ذوق درود و نماز کا

گردن اُٹھائیے نہ بہت پالیٹکس[1] میں　　مسجد میں اب ہے کام جبینِ نیاز کا

جلوۂ قدرت و صوت سرمد

جلوۂ قدرتِ باری ہے سدا پیشِ نگاہ　　نہ حکومت کا ہے ماتم نہ غمِ مال سے کام

کوئی ماضی میں ہے اُلجھا کوئی مستقبل میں　　صوتِ[2] سرمد پہ مجھے تو ہے فقط حال[3] سے کام

طاعتِ حق کے بغیر یک جہتی ناممکن

کمیٹیوں میں ہے رونے کا خوب شوق انہیں　　مگر نماز و دعا کا نہیں ہے ذوق اُنہیں

بغیر طاعتِ حق ہے محال یک جہتی　　خدا کرے کہ نظر آئے تحت و فوق اُنہیں

[1] لفظ انگریزی "POLITICS" بمعنی سیاسیات۔ [2] صوتِ سرمد کے لفظی معنی ہیں وجودِ مطلق یعنی اللہ تعالیٰ کی آواز۔ سالکِ راہِ طریقت پر کبھی ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے کہ وہ صوتِ سرمد کی شنید میں سرشار رہتا ہے۔ [3] حال سے مراد یہاں سرشاری و بے خودی ہے جس میں نہ ماضی کا ہوش رہے نہ مستقبل کا۔ اور حال زمانۂ موجود کو بھی کہتے ہیں۔

اللہ تو ہے

ہے جلوۂ مہر پر تو ماہ تو ہے
سینے میں تمہارے قلب آگاہ تو ہو
ظاہر جو نہیں ہے حامیٔ دین کوئی
بے دل کیوں ہو رہے ہو اللہ تو ہو

روٹی ملتی ہے تو طاعت حق بھی تو ہو

کالج و ٹیچر و حکام ہمہ در کارند
تا تو پلے بکف آری وکنی عہدہ پُری[1]
طاعت حق بھی مگر شرط ہے روٹی جو ملے
شیخ سعدی نے کہا ہے کہ بغفلت نخوری

ہر حال میں الحمد

گردوں کا نہ کر شکوہ اچھی نہیں خود غرضی
ہر حال میں پڑھ الحمد، اللہ کی جو مرضی
اکبر نے کہا واپس لیتا ہوں میں ہر خواہش
الحمد[2] رہے قائم منظور رہو یہ عرضی

---

[1] ان اشعار میں شیخ سعدی شیرازیؒ کے اس شعر میں حسب حال لفظی اور معنوی تصرف کیا گیا ہے ؂

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کار اند

تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

مطلب اشعار اکبر کا یہ ہے کہ کالج۔ اساتذہ اور حکام سب اسی کوشش میں ہیں کہ تم میں سرکاری نوکریوں کی اہلیت و قابلیت پیدا ہو لیکن نوکری ملنے اور شکم پُری کا انتظام ہو جانے پر اس کی بھی ضرورت ہے کہ تم رزّاق حقیقی سے غافل نہ ہو اور خدا کی عبادت بھی کرو۔ [2] الحمد قائم رہے، یعنی ہر حال میں شاکر رہ کر خدا کی حمد و ثنا کرتا رہوں۔

قرآن کو دل میں اُتاریئے

قرآن[1] کو زبان سے دل میں اتاریئے — علمی نمود چھوڑ عمل کو سنواریئے
چشم و زباں میں کیجیے پیدا اثر جناب — بعد اس کے بندگان خدا کو پکاریئے

مومن و کافر —— نجس و طاہر

مرے نزدیک تو بے اصل یہ اشکال ظاہر ہیں[2] — جو اچھے ہیں وہ مومن ہیں برے جو ہیں وہ کافر ہیں
وہی ہیں پاک طینت لو لگی ہے جنکی خالق سے — نہیں ہے شرک کی جن میں نجاست بس وہ طاہر ہیں

دل کی کرید کو عشق ہی مٹاتا ہے

مذہب[3] کی لیپ پوت سے دبتی نہیں ہے عقل — بس عشق ہی مٹاتا ہے اس کی کرید کو
دینِ خدا کے نور کا جلوہ نصیب ہو — دل کی نگاہ پائے جو وحدت کے بھید کو

---

[1] مطلب یہ ہے کہ قرآنی تبلیغ کا اثر دوسروں پر جب ہی پڑتا ہے کہ تبلیغ کرنے والا خود بھی قرآن پر عمل کرے اور اس عمل سے اُس کی آنکھ اور زبان میں ایسا اثر پیدا ہو جائے کہ دوسرے اس سے متاثر ہو سکیں۔ محض زبان سے قرآنی آیات کا پڑھ لینا اور دوسروں کو سنا دینا صرف ایک علمی نمود و نمائش ہے جس کا کوئی مفید تبلیغی اثر مترتب نہیں ہوتا۔ [2] مطلب یہ ہے کہ انسان کے ظاہر کو نہیں بلکہ باطن کو دیکھنا چاہیئے جن کا باطن اچھا ہو اور جن کو خدائے برحق اور اپنے خالق سے سچا تعلق ہو ان کو مومن اور طاہر سمجھنا چاہیئے اور جن کا باطن برا اور شرک کی نجاست میں آلودہ ہو اُن کو کافر و نجس سمجھنا چاہیئے اس لئے کہ قرآن میں مشرکوں کو نجس کہا گیا ہے اِنَّمَا الْمُشْرِکُوْنَ نَجَسٌ۔ [3] مذہب سے یہاں مراد شریعت ہے اور عشق سے طریقت۔ مطلب یہ ہے کہ انسانی عقل جو رازہائے کائنات کی کرید یا جستجو میں رہتی ہے اور انسان کو دولت اطمینان سے

(باقی فٹ نوٹ صفحہ ۵ پر)

پاسِ انفاس

پاسِ انفاس ہو اگر محفوظ — ہر نفس راہ کامرانی ہے
سانس لینے کا ورنہ کیا حاصل — صرف اک شغلِ زندگانی ہے

ذوقِ تصوف

مادہ سب میں یہ ہو، اک خیالِ خام ہے — اک مذاقِ طبع ہے جس کا تصوف نام ہے
وہ تو ہے معذور جس کے دل میں اس کا ذوق ہو — اس سے خالی جن کا دل ہو اُن پہ کیا الزام ہے

جھاڑو کی بجائے تنکے

پوچھتے کیا ہو مسلمانوں کا حال — منتشر اجزا سب اِن کے ہو گئے

(صفحہ ۵۶ کا بقیہ فٹ نوٹ) محروم رکھتی ہے، وہ پابندی شریعت سے دب تو جاتی ہے لیکن کبھی کبھی ابھر بھی آتی اور ایمان بالغیب میں رخنہ اندازی کرتی ہے۔ عقل کی اس راز جوئی اور ایمان میں رخنہ اندازی کا پورا انسداد جب ہی ہوتا ہے جبکہ عشق الٰہی کا سچا جذبہ دل میں پیدا ہو جائے۔ خدا کے نور کا جلوہ انسان کو نظر آنے لگے اور اس کے دل کی نگاہ وحدت کے بھید معلوم کر لے، یعنی عقل کو جن رازہائے کائنات کی تلاش رہتی ہے۔ انسان اپنی چشم حقیقت و معرفت سے ان کا مشاہدہ کرنے لگے۔ ۱؎ پاس انفاس کے لفظی معنی ہیں سانسوں کی حفاظت کرنا۔ سلوک میں یہ ایک شغل ہے جس میں سانس خدا کی یاد میں روک روک کر لیا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس زندگی میں خدا کی یاد سے کسی وقت غافل نہ ہوا جائے، وہی زندگی بامرادی و کامرانی کی زندگی ہے۔ ۲؎ مطلب یہ ہے کہ نہ تو صوفیوں کو ملاؤں پر طعن کرنا چاہیئے اور نہ ملاؤں کو صوفیوں پر۔ ذوق تصوف ایک وجدانی چیز ہے۔ جن میں یہ ذوق ہے ان کو بعض ایسی باتوں میں جو اہل ظاہر کے نزدیک قابل اعتراض ہیں معذور سمجھنا چاہیئے۔ اور جن میں یہ ذوق نہیں ہے اُن کو اس کے نہ ہونے پر الزام نہیں دینا چاہیئے۔

معتصم[1] کب ہیں یہ حبلُ[2] اللہ سے — دیکھو تو جھاڑو سے تنکے[3] ہو گئے

ماہ رمضان اور نورِ چراغ سحری

صد حیف۔ کہ ماہ رمضاں ختم ہوا آج — پھر رات کو عالم ہے وہی بے خبری کا
اُٹھتے تھے سحر کھانے کو اور جاتی تھیں اشیا — افسوس گیا نور چراغ سحری[4] آج

شریعت اور طریقت

قرآن[5] رہے پیش نظر یہ ہے شریعت — اللہ رہے پیش نظر یہ ہے تصوّف
مقصود تو واحد ہے اگر غور سے دیکھو — عامل نہ رہے اس کے، اسی کا ہے تاسف

---

[1] و [2] معتصم یعنی مضبوطی سے پکڑنے والا۔ اشارہ ہے آیت قرآنی وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا کی طرف جس کا ترجمہ ہے اور سب مل کر خدا کی رسی کو مضبوط پکڑے رہو۔ [3] یعنی تنکے ایک جگہ بندھ جانے سے جھاڑو ہو گئے تھے۔ بندش کھلتے ہی پھر تنکے کے تنکے رہ گئے۔ [4] ختم رمضان کے ساتھ نورِ چراغ سحری چلے جانے میں کیسا بلیغ ادبی لطف ہے۔ [5] یعنی خدا کے قانون یا احکام قرآنی کی پابندی کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو اس کا نام شریعت ہے۔ اور اگر پابندیٔ احکام خداوندی میں رضا جوئی الٰہی پیش نظر ہو تو یہ طریقت یا تصوف ہے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ نہ تو لوگ شریعت پر عامل ہیں نہ طریقت پر۔ پابندی احکام کو مقصود سمجھ کر جائز و ناجائز کی فضول بحثوں میں الجھ گئے ہیں یا رضا جوئی الٰہی کے لیے پابندی احکام سے اپنے آپ کو آزاد و مستغنی سمجھنے لگے ہیں۔

خود تابع نفس، دوسروں پر نکتہ چینی

اللہ نے کہا ہے تم زیر امتحاں ہو — ہم جانتے ہیں بس ہم دنیا کے ممتحن[1] ہیں
خود نفس کے ہیں تابع تقویٰ سے بے تعلق — اوروں پہ نکتہ چینی میں غرق رات دن ہیں

ارادے پورے نہ ہونے سے رب کی پہچان

کچھ اپنا سوچا نہ کام آیا وہی ہوا جو خدا نے چاہا — عجب ہے تسلیم و صبر کی خو اگر نہ پیدا ہو دل میں اب بھی
خدا سے بیگانہ تھی طبیعت دلی ارادوں پہ تھا بھروسا — عزیمتیں فسخ ہو گئیں جب عرفت ربی عرفت ربی[2]

عالم وجد کی موت

ہر ایک کو ایک دن اجل آنی ہے — دنیا گذراں ہے ہیچ ہے فانی ہے
لیکن مرنا جو عالم وجد[3] میں ہو — گویا کہ شعاع نور یزدانی[4] ہے

دل کی آنکھ کا آپریشن

میں نے مرشد سے کیا جا کر یہ اک دن التماس — کار دنیا نے بہت مجھ کو کیا ہے اب اداس

---

[1] اشارہ ہے آیت قرآنی ولنبلونکم بشیٔ من الخوف الخ کی طرف یعنی یقیناً ہم امتحان لیں گے تمہارا خوف وغیرہ کے ذریعے۔
[2] اشارہ ہے حضرت علیؓ کے اس مقولہ کی طرف عرفت ربی بفسخ العزائم (میں نے اپنے رب کو اپنے ارادوں کے فسخ ہونے سے پہچانا۔
[3] حالت بے خودی و شیفتگی خصوصاً وہ جو عشق الٰہی میں طاری ہو [4] یزداں موجودہ فارسی اور اردو میں خدا کو کہتے ہیں۔ آتش پرست فاعل خیر کو یزداں اور فاعل شر کو اہرمن کہتے ہیں۔

جلوۂ دنیا نے مجھ کو کر دیا ہے بے بصر — آخرت پر اب نہیں باقی رہی میری نظر

فلسفے نے مجھ کو دکھلایا فقط دنیا کا فیکٹ[1] — میری چشمِ طبع کو عارض ہے غربی کیٹریکٹ[2]

میرے حق میں کوئی فکرِ سالویشن[3] کیجئے — ہو سکے تو مذہبی اک آپریشن[4] کیجئے

کی توجہ حضرتِ مرشد نے میرے حال پر — اک نظر ڈالی مرے اقوال اور اعمال پر

چشمِ باطن میں دیا نشتر نگاہِ تیز کا — کٹ گیا وہ رنگ محسوساتِ کفر انگیز کا

پھر درِ دل پر مرے تقوے کی ٹٹی باندھ دی

آنکھ پر شوقِ لقائے حق کی پٹی باندھ دی

باخبروں کی خاموشی

انورؔ سے کہا میں نے کہ خوش اتنے ہو کیوں تم — تقریر نہ تحریر، نہ غصہ، نہ خوشامد

بابو کے نہ دمساز، نہ یاروں کے ہم آواز — ماہی ہیں نہ ممتاز، نہ اشتر ہیں ہرآمد

کہنے لگے کیا آپ کو معلوم نہیں ہے — کاں[5] را کہ خبر شد خبرش باز نیامد

---

[1] انگریزی لفظ FACT بمعنی حقیقت [2] انگریزی لفظ CATARACT بمعنی موتیابند [3] انگریزی لفظ SALVATION بمعنی نجات۔

[4] انگریزی لفظ OPERATION بمعنی عملِ جراحی [5] یہ مصرع سعدی شیرازی کے اس قطعہ کا ہے؎

اے مرغِ سحر عشق ز پروانہ بیاموز — کاں سوختہ را جاں شد و آواز نیامد

ایں مدعیاں در طلبش بے خبرانند — کاں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد

ترجمہ: اے صبح کے پرندے! مرغِ عشق پروانہ سے سیکھ کہ جل کر جان دیدی پر بھی اس کی آواز نہیں نکلتی۔ جن کو طلب حق کا دعوی ہے وہ راہِ حق سے بے خبر ہیں جن کو راہِ حق کا پتہ مل جاتا ہے۔ وہ خود لاپتہ ہو جاتے ہیں۔

ننانوے ناموں کا ورد اور ننانوے کا پھیر

ترقی خواہ ہے تو صحن مسجد چھوڑ اے اکبر
کہا اُس نے ترقی ہے تو خود پہنچے گی مسجد تک
نود و نُہ[۱] نام اِدھر۔ ننانوے[۲] کا پھیر اُدھر۔ یعنی
انہیں سو تک پہنچنا ہے مجھے اللہ واحد تک

مُلّا اور صوفی

گو کہ دونوں ہی نظر آتے ہیں نیک
ایک ظاہر۔ ایک میں باطن کی ٹیک[۳]
میں نے پوچھا ایک اور اک کے ہوئے
دے جواب اس کا تمہاری طبع نیک
بے تکلف کہہ دیا مُلّا نے دو
حضرتِ صوفی یہ بولے پھر بھی ایک[۴]

خدا کے ساتھ اگر ہو تو پھر خدا ہی ہے

عجیب معنیٔ نازک ہیں اس مقولے میں
نظر وسیع جو ہو بندگی میں شاہی ہے
خدا[۵] کے ساتھ نہیں ہو تو کچھ نہیں ہو تم
خدا کے ساتھ اگر ہو تو پھر خدا ہی ہے

۱؎ نود و نہ یعنی ننانوے۔ باری تعالےٰ کے اسمائے صفات ننانوے ہیں جو صوفیائے کرام کے ورد میں رہتے ہیں اور ان ننانوے اسمائے صفات کے بعد اللہ اسم ذات ہے جو خدائے واحد کا مخصوص نام ہے۔ مرتبۂ ذات تک پہنچنے کے لئے مراتب صفات کو طے کرنا پڑتا ہے۔ یعنی ننانوے اسمائے صفات کی سیڑھی اللہ واحد تک رسائی ہوتی ہے۔ ۲؎ ننانوے کے پھیر میں پڑنا اردو زبان کا محاورہ ہے جس سے مُراد ہے روپیہ جوڑنے کی فکر میں رہنا یعنی ننانوے روپے جمع ہو جانے کے بعد اُن کو پورے سو کرنے کی کوشش کرنا۔ ۳؎ ٹیک لفظ ہندی ہے بمعنی سہارا ۴؎ یعنی مُلّا کی نظر ظاہر پر پڑتی ہے اور صوفی کی نظر باطن پر۔ اعداد کی ظاہری کثرت میں ایک کی وحدت مضمر ہوتی ہے۔ ایک اور ایک۔ بظاہر دو ہوتے ہیں۔ لیکن درحقیقت وہ ایک ہی کے دو چند کا نام ہے۔ ۵؎ مطلب یہ ہے کہ (باقی صفحہ ۶۲ پر)

بس خدا سے کام رکھو

لاتؔ و عزیٰ سے چھٹے تو زیدؔ و خالد میں پھنسے
فائدہ کیا خلق کو پہنچا درِ اسلام سے

انتظامِ دہر کہتا ہے کہ یہ اک بھید ہے
کام رکھ تو اپنے دل میں بس خدا کے نام سے

آغاز وہ تھا۔ انجام یہ ہے

آغاز یہ تھا کہ دل بڑھا تھا
جو بُت تھا نگاہ پر چڑھا تھا
انجام یہ ہے کہ مر رہے ہیں
اللہ اللہ کر رہے ہیں

(صفحہ ۶۱ کا بقیہ) جب تک انسان اپنی ہستی کو خدا کی ہستی میں محو و مدغم نہیں کر دیتا اور اپنے آپ کو خدا کا خلیفہ اور قائم مقام نہیں سمجھتا اُس وقت تک اس کی ہستی ایک خیالی ہستی سے زیادہ کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتی۔ لیکن جب انسان اپنی ہستی کو خدا کی ہستی میں گم کر کے خدا کا ہو جاتا ہے تو اس کی ہستی میں خدا کی خودی سما جاتی ہے اور مخلوق ہونے کے باوجود وہ خلیفہ الٰہی کی حیثیت سے خدائی اختیارات کا حامل ہو جاتا ہے۔

لہ لات خانہ کعبہ میں ایک بُت تھا اور عزیٰ ایک درخت۔ جنھیں مشرکین عرب پوجا کرتے تھے۔ اور جن کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے نیست و نابود کر دیا۔ سے زید و خالد سے مراد وہ سب غیر خدا ہیں جن کے ساتھ مسلمانوں نے خدا کا سا تعلق پیدا کر لیا ہے۔

اِسلام
سے
بیگانگی

شیخ بھی توحید کا کلمہ بھولے

تان اُس بت نے اُڑائی ہمیں بلما[1] بھولے
ہم تو کیا شیخ بھی توحید کا کلما بھولے

صنم ہند کو ہم یاد رہیں اے اکبر
غم نہیں ہے جو عرب میں ہمیں سلما[2] بھولے

حرص و حسد کی آگ

موقعے نکل آئے ہیں بہت کفر کی گوں[3] کے
افسوس مسلمان بہت دیر میں چوں[4] کے

ہے نفس بشر میں حسد و حرص کی آگ
شیطان ہی کا کام ہے اس آگ کو دھوں[5] کے

مسجد میں عالم خاموشی

مجلس میں خیال بادہ نوشی پایا
مکتب میں سر سخن فروشی پایا

مسجد میں اگرچہ امن تھا اے اکبر
لیکن اک عالم خموشی[6] پایا

۱ہ بلما یا بالم لفظ ہندی۔ بمعنی خاوند۔ عاشق۔ معشوق۔

۲ہ سلما اصل میں سلمیٰ ہے۔ عرب میں ایک حسین عورت کا نام تھا۔ مجازاً ہر محبوبہ کو کہتے ہیں۔

۳ہ گوں لفظ ہندی بمعنی مطلب۔ خواہش۔ ضرورت۔

۴ہ و ۵ہ چوں اور دھوں کے قافیوں کو گوں کی رعایت سے کے کی ردیف سے الگ کر کے لکھا گیا ہے۔ صحیح املا چونکے اور دھونکے ہے۔

۶ہ عالم خموشی سے مراد بے حسی ہے۔

گور پرستی و زور پرستی

بندوں نے بھلا دیا ہے وہ عہدِ الست[1] — نا فہمی و حرص میں ہیں اکثر بدمست
کیا زید و بکر پہ معترض ہوتا ہے — اک گور پرست ہے تو اِک زور پرست

ضعفِ مذہب کے ساتھ دولت و جاہ کی کمزوری

بھولے جاتے ہیں ہسٹری[2] بھی اپنی — مذہب کو بھی ضعیف پاتے ہیں ہم
ہے دولت و جاہ بھی کمی پر ہر روز — ظاہر یہ ہے کہ مٹتے جاتے ہیں ہم

مذہبی عقیدوں میں کمزوری

اس بزم سے سب کے سب اُٹھے جاتے ہیں — تسکین کے جو تھے سبب اُٹھے جاتے ہیں
اک قوتِ مذہبی عقیدوں سے تھی — وہ بھی تو دلوں سے اب اُٹھے جاتے ہیں

مسلمان ہیں کہاں؟

وہ غیرتیں، وہ صبر، وہ ایمان ہیں کہاں — حُسنِ عمل کے دل میں وہ ارمان ہیں کہاں

---

[1] عہد الست سے بنی آدم کی تصدیق ربوبیت باری تعالیٰ کا وہ عہد مراد ہے جس کا ذکر اس آیت کریمہ میں ہے اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ قَالُوْا بَلٰی ج شَہِدْنَا یعنی خدا تعالےٰ نے آدم کی اولاد کو پیدا کر کے اُن سے پوچھا تھا "کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں اور سب نے جواب دیا تھا کہ بے شک تو ہمارا پروردگار ہے اور ہم اس پر گواہ ہیں۔ [2] انگریزی لفظ "HISTORY" بمعنی تاریخ۔

اک غل مچا ہوا ہے کہ مسلم ہیں خستہ حال پوچھے ذرا کوئی کہ مسلمان ہیں کہاں

غیرتِ دینی کا فقدان

توحید اُن کے دلوں میں محفوظ نہیں اللہ کے ذکر سے یہ محظوظ نہیں
اس فرقۂ نو کو میں نے دیکھا اکبرؔ اِسلام اُن کی نظر میں ملحوظ نہیں

نماز اور وظیفہ کے ساتھ خلیفہ بھی رخصت

بنگلوں سے نماز اور وظیفہ رخصت کالج سے امامِ ابو حنیفہ[1] رخصت
صاحب سے سُنی ہے اب قیامت کی خبر قسطنطنیہ سے ہیں خلیفہ[2] رخصت

یہ خود سَری ہے یا خودکشی

جاتی رہی وعظ مذہبی کی قوت ہر سر میں سمائی خود سَری کی قوت
اطفال کو ناز ہے۔ مگر قومی آنکھ روتی ہے کہ ہے یہ خودکشی کی قوت

---

[1] ۔ امامِ اعظم ابو حنیفہ کوفیؒ جن کا اسمِ گرامی نعمان تھا اور جن کی طرف فقہ حنفی اور مسلک حنفی منسوب ہے۔

[2] ترکی سلطنت حضرت اکبر کے زمانہ میں مسلمانوں کی سب سے بڑی سلطنت تھی اور ترکی کے بادشاہ کو خلیفۃ المسلمین کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ سلطان عبدالحمید خاں ترکی کے (جس کا دارالحکومت قسطنطنیہ تھا) آخری بادشاہ اور خلیفہ تھے جن کو ۱۹۰۹ء میں خود اُن کی رعایا نے معزول کر دیا تھا۔ اُن کی معزولی کے بعد سے خلافت ترکی کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

شیخ پر لاحول

شیطان کا سنا جو شیخ صاحب نے یہ قول — بولے فضول تجھ کو آتا ہے یہ ہول
میں خود ہوں بدل گیا زمانہ کے ساتھ — پڑھتی ہے مجھی پہ اب تو دنیا لاحول[1]

اللہ کے نام کی تجارت

تحریک ضرورت معیشت ہے بہت — خرقے[2] کو بھی اب خیال خلعت[3] ہی بہت
خالق کے جمال کا تو سودا[4] کم ہے — اللہ[5] کے نام کی تجارت ہے بہت

از دست خویشتن فریاد

مذہب نے کہا کہ جان سے عاری ہیں — آپس ہی کے لوگ باعث خواری ہیں

---

[1] لاحول مخفف ہے لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللہ جس کے معنی ہیں۔ اللہ کے سوا کسی میں نہ قوت ہے نہ قدرت۔ یہ فقرہ مسلمان شیطانی وساوس و ترغیبات سے بچنے کے لئے بولا کرتے ہیں اور مجازاً کسی پر لاحول پڑھنے سے اس کا شیطانی اوصاف سے متصف ہونا مراد لیا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب شیطان کو لاحول سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ جو لاحول پڑھنے کی تلقین کیا کرتے ہیں ان کے اندر زمانہ کے اثر سے ایسی شیطانی صفتیں پیدا ہو گئی ہیں کہ دنیا خود ان پر اب لاحول پڑھنے لگی ہے۔ [2] و [3] خرقہ بمعنی گدڑی مجازاً اجامۂ درویشی۔ خلعت بمعنی۔ بادشاہوں یا امیروں کی طرف سے انعام میں عطا کیا ہوا لباس۔ مطلب یہ ہے کہ آج کل کے مذہبی پیشوا بھی زیادہ تر ارباب اقتدار کی خوشنودی اور دولتمندوں سے مالی منفعت حاصل کرنے کی فکر میں رہتے ہیں [4] سودا کے معنی عشق و محبت کے بھی ہیں اور خرید و فروخت کے بھی۔ یہاں مراد عشق و محبت ہے [5] یعنی ذکر خدا و رسول اور تقویٰ و تقدس کو زر اندوزی کا ذریعہ بنایا جا رہا ہے۔

گویا قزاق تھے ہوئے ہیں اب اسیر — اپنوں ہی میں کچھ گواہ سرکاری ہیں[1]

صلح و محبت کم ہونے کی وجہ

میں دیکھتا ہوں صلح و محبت ہے اٹھ گئی — ہر دل سے ہر گروہ سے ہر خاندان سے
اس کا سبب نہیں ہے سوا اس کے اور کچھ — یعنی کہ اٹھ گیا ہے خدا درمیان سے

آئینِ دین چھوڑنے کا نتیجہ

سوچا نہیں خود غرض کو آئینِ ثواب — جتنا چھوڑ دگے ہم کو تم ہوگے خراب
واللہ یہی نتیجہ ہوگا پیدا — دنیا میں حقارت اور عقبیٰ میں عذاب

مصروفیات دنیا اور مذہب

شیخ صاحب کا نکل سکتا ہے مطلب کیونکر — نظر آسکتی ہے اب رونق مذہب کیونکر
کارِ دنیا سے فراغت ہی عزیزوں کو نہیں — پھر کہیں ان سے اِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ[2] کیونکر

[1] گواہ سرکاری سے مراد ایسے گواہ ہیں جو معافی دیئے جانے کے وعدے پر اقبال جرم کرنے اور دوسرے شریک کار مجرم کے خلاف شہادت دینے کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ مذہبی طبقہ ہی میں کچھ لوگ ایسے پیدا ہو گئے ہیں جو پیروانِ مذہب کو اس کا قصوروار ثابت کر رہے ہیں کہ رہبری کی بجائے قوم کی رہزنی کرتے ہیں [2] تلمیح ہے آیات قرآنی فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَ اِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ ترجمہ (دنیاوی ترددات سے) کسی قدر فراغت ہو تو (عبادت کی) ریاضت کرو اور اپنے رب کی طرف (پورے پورے) متوجہ ہو جاؤ۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ رب کی طرف متوجہ ہونے کی تلقین ان مسلمانوں سے کیونکر کی جائے جن کو دنیا کمانے سے مہلت ہی نہیں ملتی۔

قبلہ و کعبہ[1] کی دیر نشینی

مجھے سنائے یہ کہتا تھا ایک طفلِ ذہین — یہ سچ ہے ہم میں وفا و ادب کی بو بھی نہیں
سبب ہے اِس کا مگر صرف ضعفِ ملت و دیں — جناب قبلہ و کعبہ ہیں خود ہی دیر نشیں

نوجوانوں کی تعلیم اور رہائش

پڑھے اُس جا جہاں تاثیرِ ملت جا نہیں سکتی — بسے اُس جا کہ آوازِ اذاں بھی آ نہیں سکتی
تمہیں کو ناز ہو اے نوجوانو اس طریقے پر — مری امید تو نغمہ خوشی کا گا نہیں سکتی

نہ وہ صورت ہے نہ وہ سیرت
نہ رنگ انجمن وہ ہے نہ وہ میکش نہ وہ ساقی
یہ دعوت کیا ہے بس ہے اک ادائے فرض اخلاقی
نہ وہ مکتب نہ وہ مُلّا نہ وہ صورت نہ وہ سیرت
سوا نام خدا کے اب رہا کیا قوم میں باقی

[1] قبلہ و کعبہ سے مراد ہادیانِ دین ہیں۔ یعنی جب ہمارے ہادیانِ دین خود ہی دین کے ساتھ وفاداری اور اس کا احترام نہیں کرتے تو بچوں سے ادب و وفا کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے۔

دین و دانش

بیلُون میں خدا سے باتیں

کیوں کرنے لگے وہ مجھ گدا سے باتیں — زوروں پہ ہیں کرتے ہیں ہوا سے باتیں
میں سجدے میں کہہ رہا ہوں سُبحان اللہ[1] — بیلُون[2] میں وہ کریں خدا سے باتیں

فہم اور وہم

حواسّ[3] و فہم میں اُلجھے ہوئے ہیں — براتؔ[4] و سہم میں اُلجھے ہوئے ہیں
خدا تک ہے رسائی سخت دشوار — سب اپنے وہم میں اُلجھے ہوئے ہیں

اللہ کی یاد سے اطمینانِ قلب

دنیا کرتی ہے آدمی کو برباد — افکار سے رہتی ہے طبیعت ناشاد
دو ہی چیزیں ہیں بس محافظ دل کی — عقبیٰ کا تصوّر اور اللہ کی[5] یاد

---

[1] سُبحان اللہ کہنے کے معنی ہیں، عیوب و نقائص سے اللہ کے پاک و مبرا ہونے کا اظہار کرنا؛ اور یہ کلمۂ مدح و تعجب بھی ہے۔ یعنی کسی اچھی اور عجیب چیز کو دیکھ کر اس کی تعریف میں بولا جاتا ہے [2] انگریزی لفظ BALLOON یعنی غبارہ۔ بیلُون میں اُڑ کر خدا سے باتیں کرنے کا مطلب ہے کہ چند رموزِ قدرت و خلقت کائنات سے واقف ہو کر خدا کی ہمسری کی ڈینگیں مارنا۔

[3] حواس و فہم سے مراد سائنس و فلسفہ ہے۔

[4] برات و سہم کے معنی تحلیل و تجزی، سائنس اور فلسفہ دونوں تحلیل و تجزی میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ عقل کی معراج ترقی یہی علوم ہیں اور خود ان علوم کا یہ حال ہے کہ اوہام سے آگے نہیں۔ (عبدالماجد دریابادی)

[5] بمصداق آیۂ کریمہ اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْب (یاد رکھو اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے)

عظمتِ دنیا کے احساس کا مقابلہ

کچھ منع نہیں ہر اک کی تحریر پڑھو — لیکن قرآن کی بھی تفسیر پڑھو
عظمت دنیا کی جب دبائے دِل کو — خالق کا کرو خیال تکبیر[1] پڑھو

تدبیر جزوِ تقدیر

ہے عقلِ بشر بھی تابعِ حکمِ خدا — بے فائدہ سب ہیں بحث و تقریر ہے یہ
تدبیر کے باب میں ہے اُن کو شبہ — کہدو اکبر کہ جزوِ تقدیر[2] ہے یہ

سب کچھ خدا کا ہے

رُکتا نہیں انقلاب چارا کیا ہے — حیراں ہیں ملک بشر بچارا کیا ہے
تسکیں کے لئے مگر ہے کافی یہ خیال — جو کچھ ہے خدا کا ہے ہمارا کیا ہے

[1] تکبیر پڑھنے کے معنی ہیں خدا کی بڑائی کا بیان کرنا۔ یعنی اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہنا۔

[2] تقدیر سے مراد وہ اندازہ ہے جو خدا تعالےٰ نے کائنات کے متعلق پہلے سے کر رکھا ہے۔ خدا نے انسانی عقل کو پیدا کرکے اس کا بھی اندازہ کر لیا تھا کہ انسان اسی کی پیدا کی ہوئی عقل کو بھی کام میں لایا۔ یعنی تدبیر سے بھی کام لیا کرے گا۔ اس لئے تدبیر بھی تقدیر میں شامل اور تقدیر ہی کا ایک جزو ہے۔

خدا کا قرآن اور شیطان کا فلسفہ

قرآں[1] میں ہمیں خدا نے سمجھایا ہے — شیطان نے فلسفے[2] میں اُلجھایا ہے
قسمت اب دیکھنی ہے دل کی اکبرؔ — معلوم نہیں کہ یہ کدھر آیا ہے

یہ سب ہے ایک ہستی کا ظہور

ایمان وجوش حق پرستی کیا ہے — یہ غفلت وکفر وجوش ہستی کیا ہے
لاریب یہ سب ہے ایک ہستی[3] کا ظہور — یہ مجھ سے نہ پوچھ پھر وہ ہستی[4] کیا ہے

رنج وراحت قابل وقعت نہیں

ہر قدم[5] در منزل ہستی مرا رنج وغمے است — حمد رب العالمین فرض است وایں ہم عالمے است
رنج وراحت را دریں دنیا نباشد وقعتے — ایں جہاں یک روزہ ہست وعمر ماہم یک دمے است

---

[1] و [2] یعنی قرآن میں تو خدا نے ہم کو یہ سمجھایا ہے کہ ہدایت یاب ہونا چاہتے ہو تو غیب پر ایمان لے آؤ اور شیطان سائنس وفلسفہ کے چکر میں ڈال کر ہم سے یہ کہہ رہا ہے کہ جو بات تمہاری عقل میں نہ آئے اُس کو نہ مانو۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارا دل ہدایت قرآنی کو قبول کرتا ہے یا تلقین شیطانی کو یعنی اس میں ایمان بالغیب کی صلاحیت ہے بھی یا نہیں۔ [3] و [4] یعنی یہ امر کہ تمام کائنات و مظاہر کائنات ایک ہی ہستی یا وجود مطلق کا ظہور ہے، نقلاً بھی ثابت ہے اور عقلاً بھی۔ رہا یہ سوال کہ وہ ایک ہستی کیا ہے اور کیسی ہے؟ اس کا جواب نہ تو انسان کی محدود عقل میں آسکتا ہے اور نہ محدود زبان واشارات سے دیا جاسکتا ہے۔ جلیل القدر انبیا نے بھی حقیقت ذات باری کا ادراک نہ کرسکنے میں اپنے عجز کا اظہار کیا ہے۔ بقول عارف شیراز رحمہٗ "خاصاں دریں رہ فرس راندہ اند — بہ لا اُحصی از تگ فرو ماندہ اند" اور "دریں ورطہ کشتی فرو شد ہزار — کہ پیدا نہ شد تختہ بر کنار" [5] ترجمہ ان اشعار کا یہ ہے:۔ منزل ہستی میں ہر ہر قدم پر رنج (باقی پر)

ذاتِ باری میں بحث بے سود ہے

جلوۂ ارض و سما دکھلا کے ہے نیچر بھی چپ ؎
لَا اِلٰہ اور قُلْ ھُوَ اللّٰہ کہہ کے پیغمبر بھی چپ

بحث اُس کی ذات میں کیوں کر رہا ہے فلسفی
ایسے ایسے چپ ہیں یہ ہوتا نہیں اس پر بھی چپ

نیچر کے مُرید

اللہ کا صدق دل سے جو طالب ہو
حیرت نہیں گر ملک ؎ کا ہم قالب ہو

ہرگز نہ بڑھیں گے اس سے نیچر کے مرید
ممکن نہیں جسم روح پر غالب ہو

(صفحہ ۷۵ کا بقیہ فٹ نوٹ) مجھے رنج و غم سے سابقہ پڑتا ہے۔ سب عالموں کے پروردگار کی حمد فرض ہے اور دنیاوی زندگی کا عالم بھی ایک عالم ہے۔ اس دنیا میں نہ راحت کوئی قابلِ وقعت چیز ہے اور نہ رنج و مصیبت۔ اس لئے کہ یہ جہان بھی چند روزہ ہے اور ہماری زندگی بھی۔ مطلب یہ ہے کہ دنیاوی رنج و مصیبت پر بھی ہمیں خدا کا شکر کرنا چاہیئے۔ اور یہ خیال کرنا چاہیئے کہ یہ دنیا اور اس کی تکلیفیں عارضی ہیں، دائمی راحت ہمیں دوسرے جہان میں ملنے والی ہے۔

؎ مطلب یہ ہے کہ جب نیچر یعنی مظاہرِ کائنات سے بھی اس کے سوا کچھ ظاہر نہیں ہوتا کہ ایک ہستی ہے جس کا ارض و سما میں یہ سارا ظہور ہے اور پیغمبر بھی ذاتِ باری کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکے کہ اللہ ایک ہے اور اُس کے سوا کوئی دوسری ہستی اللہ بننے اور کہے جانے کے قابل نہیں ہے تو تعجب ہے کہ نیچر اور پیغمبر جیسے رہنمایانِ عقل و نقل کی خاموشی کی صورت میں فلسفہ کی کتابوں میں وجودِ باری کے متعلق یہ فضول بحثیں کیوں کی جاتی ہیں۔ حالانکہ بقول حکیم شیراز نہ تو ہماری عقل و حس اِس کی ذات کی تہ تک پہنچ سکتی ہے اور نہ ہمارا غور و فکر اُس کی صفات کی گہرائیوں تک ؎

نہ ادراک تا کُنہہ ذاتش رسد
نہ فکرت بغور صفاتش رسد

؎ مطلب یہ ہے کہ صدقِ دل سے اللہ کے طلب کرنے والوں کے لئے تو یہ ممکن ہے کہ اُن کے خاکی جسم بھی فرشتوں کی طرح نوری ہو جائیں لیکن جو لوگ نیچر کو خدا بنائے ہوئے ہیں اُن کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنی مادی ترقیات سے روح کو مغلوب کر لیں

یورپ کا آسمانی باپ اور برق اور بھاپ

بھولتا جاتا ہے یورپ آسمانی[۱] باپ کو — بس خدا سمجھا ہے اُس نے برق[۲] کو اور بھاپ کو
برق[۳] گر جائے گی اک دن اور اُڑ جائے گی بھاپ — دیکھنا اکبر بچائے رکھنا اپنے آپ کو

وہ سیانے ہم کالے

سیکھ لی[۴] دیر کے چراغ کی ساخت — کفر آلود تھی دماغ کی ساخت
وہ سیانے ہیں اور ہم کالے — دونوں میں مشترک ہے زاغ (کوا) کی ساخت

نفس اور نیچر کو مخلوط نہ کرو

مخلوط کرو نہ نفس[۵] و نیچر کو بہم — گو نفس نے بھی لیا ہے نیچر سے جنم
جو بھوک لگے زبان کو وہ ٹھیک نہیں — نافع وہ طعام ہے کہ طالب ہو شکم

---

۱ عیسائی حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا مانتے ہیں۔ اس لئے وہ خدا کو بھی آسمانی باپ کہا کرتے ہیں ۲ برق اور بھاپ سے مراد برقی اور دخانی ایجادیں یعنی مشینیں وغیرہ ہیں۔ ۳ یعنی یہی برقی اور دخانی ایجادیں جن کو یورپ نے اپنا خدا بنا رکھا ہے ایک دن سب کو تباہ کر کے رکھ دینگی۔ ایٹم بم وغیرہ تباہ کن آلات جنگ کی ایجادوں سے اس پیشین گوئی کے پورا ہونے کے آثار نظر آ رہے ہیں۔ ۴ مطلب یہ ہے کہ مغرب میں سائنس و حکمت کی جو روشنی ہو رہی ہے ہم کو معلوم ہو گیا ہے کہ اس روشنی کے موجدوں کے دماغ کفر آلود ہیں۔ مغرب کے لوگ سیانے یعنی عیار و چالاک سہی مگر ہم بھی سیانے کوے کی ایک صفت اپنے اندر رکھتے ہیں یعنی کالے ہیں اس لئے دماغ کی کفر آلودگی کا پتہ چلا لیتے ہیں۔ ۵ نفس سے مراد یہاں شہوات و لذات ہیں۔ اور نیچر سے مراد خلق یا وجود۔ جن خواہشات طبعی کا پورا کرنا وجود یا زندگی قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے وہ خلقی یا نیچرل خواہشات ہیں اور جن خواہشات سے حصول لذت مقصود ہوتی ہے وہ خواہشاتِ نفس، یا نفسانی خواہشات ہیں۔ خواہشات نفس بھی اگرچہ طبیعت یعنی نیچر ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ مگر فرق یہ ہے کہ خلقی خواہشات پوری کئے بغیر زندگی باقی نہیں رہ سکتی۔ اور خواہشات نفس کا (باقی صفحہ ۷۸ پر)

علم و خرد کے بُت کی پرستش

اُس بت[1] نے کہا کہ تو ہے بے علم و خرد
کھول آنکھ زمانے کے موافق ہو جا
آخر میں کھُلا کہ اُس کا مطلب یہ تھا
اللہ کو چھوڑ مجھ پہ عاشق ہو جا

شیطان کا کوئی ممنون نہیں

سمجھے جو کوئی بُرا یہ مضمون نہیں
کوئی پہلو خلاف قانون نہیں
ہر چند کہ یہ مزے چکھاتا ہے بہت
شیطان کا کوئی شخص ممنون[2] نہیں

(صفحہ ۷۷ کا بقیہ فٹ نوٹ) پورا کرنا بقار زندگی کے لیے ہمیشہ ضروری نہیں ہوتا۔ حضرت اکبر نے خلقی اور نفسی خواہشات کے فرق کو دوسرے شعر میں شکم اور زبان کی بھوک کے لطیف و بلیغ پیرایہ سے ظاہر کیا ہے۔ پیٹ کی بھوک میں کھانا کھانا ایک خواہش خلقی کا پورا کرنا ہے اِس لیے ایسا کھانا عموماً نافع بلکہ ضروری ہوتا ہے۔ برخلاف اُس کھانے کے جو زبان کی بھوک رفع کرنے یعنی محض حصول لذت زبان کے چٹخارے کے لیے کھایا جائے کیونکہ یہ محض خواہش نفس کو پورا کرنے کے لئے کھایا جاتا ہے۔

[1] بُت سے مراد مغربی اقتدار کا بُت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ زمانہ جس علم و خرد کی طرف لیے جا رہا ہے وہ ہمیں خدا سے برگشتہ کرنے والا اور مغرب کا پرستار بنانے والا ہے۔

[2] یعنی شیطانی خواہشات سے لذت اندوز ہونے کے باوجود کوئی شیطان کا احسان نہیں مانتا۔ سب اُس پر لعن طعن ہی کرتے ہیں۔

زندگی کس کی مرضی پر ہے

دیکھے[1] جو حوادث سماوی ارضی — قائم کرلی ہیں تو نے باتیں فرضی
بھولا ہے خدا کو تو ذرا غور تو کر — زندہ رکھتی ہے تجھ کو کس کی مرضی[2]

ہم کو کس نے جِلا رکھا ہے

تو نے دل دہر سے ملا رکھا ہے — قایم غفلت کا سلسلہ رکھا ہے
کیا خود زندہ ہے اپنی طاقت سے تُو — آخر کس نے تجھے[3] جِلا رکھا ہے

انجام موت ہے

جہانِ فانی کے حادثوں کا خیال کب تک کیا کرے گا
جو ہو رہا تھا وہ ہو رہا ہے جو ہو رہا ہے ہوا کرے گا
کہاں تک اخبار ہوں گے شایع نہ کر عبادت کا وقت ضایع
کمیٹیاں[5] قبر میں نہ ہوں گی نہ تو ہمیشہ جیا کرے گا

---

[1] و [2] یعنی حوادث ارضی و سماوی سے لوگوں کو مرتا دیکھ کر ممکن ہے تو نے یہ خیال کیا ہو کہ مرنے والوں کو مارنے والا خدا نہیں بلکہ حوادث[4] ہیں لیکن ذرا اس پر بھی تو غور کر کہ تو زندہ کیا اپنی مرضی سے ہے یا کسی اور کی مرضی ہے اور وہ اگر خدا نہیں تو کون ہے [3] دیکھئے حاشیہ ۱ و ۲ [4] جمع حادثہ [5] انگریزی لفظ کمیٹی COMMITTEE بمعنی جلسہ۔

مرنا ہے ضرور اور قیامت برحق

دنیا میں جو ہو چکا ہے، کافی ہے سبق — کیا ہوگا قیاس[۱] کیوں اُلٹنا ہے ورق
فتنوں کی جگہ یہ ہے سمجھ تو اتنا — مرنا ہے ضرور، اور قیامت برحق

فلسفہ اور دین کی دشمنی

فلسفہ حریف کا دین کا ہے عدو بنا — اُس طرف ہے کیدِ سخت اور تیرا بچنا
صبح و شام صدق سے کر دعا کہ رَبَّنَا[۲] — لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ اِذْ ھَدَیْتَنَا

دعوئے خدائی نہ کرو

نیکی کے حق میں کج ادائی نہ کرو — اللہ کے ساتھ بے وفائی نہ کرو
نیٹو[۳] بھی رہوگے اور مروگے بھی ضرور — کہتا ہوں کہ دعوئے[۴] خدائی نہ کرو

---

۱ یعنی ماضی کے واقعات سامنے ہوتے ہوئے آیندہ کے متعلق قیاس آرائیوں کی کیا ضرورت ہے۔

۲ رَبَّنَا کے لفظ سے تیسرے مصرع کے آخر تک آیت قرآنی ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:- اے ہمارے پروردگار ہم کو راہ راست پر لائے پیچھے ہمارے دلوں کو ڈانواڈول نہ کر۔

۳ لفظ انگریزی NATIVE بمعنی باشندۂ ملک۔ دیسی۔ انگریز ہندوستانیوں کو تحقیراً نیٹو کہا کرتے تھے۔

۴ دعوئے خدائی سے مراد خدا سے سرکشی کرنا ہے۔

مذہب کے قبول میں زیادہ دخل کس کو ہے؟

اکبر اس باب میں نہ کر فکر بہت — منطق[1] کے گھر میں کچھ نہیں اس کا علاج
مذہب کے قبول میں زیادہ ہیں دخیل — سوشل[2] افراد اور افتادِ مزاج

مادّے میں شعور کیسے پیدا ہوا؟

اک امر ہے پوچھنا ہمیں اُن سے ضرور — منکر ہیں روح کے جو یہ اہلِ غرور
ہے فہم و خرد کا تم کو دعویٰ یہ کہو — پیدا[3] ہوا مادّے میں کیونکر یہ شعور

عقل رازِ ازل تک نہ پہنچ سکی

عشق میں بے خود نہ تھا ابتر رہا مضطر رہا — دل دلیلوں کا تھا ساتھی ہر طرف ششدر[4] رہا
گو ترقی کی خرد نے پھر بھی پستی میں رہی — جس جگہ پہنچی سمجھ رازِ[5] ازل برتر رہا

---

[1] منطق سے علوم حکمت مراد ہیں [2] Social بمعنی معاشرتی و تمدنی یعنی کسی مذہب کے قبول کرنے نہ کرنے میں آدمی کی اُفتاد طبع اور اُن لوگوں کا بڑا دخل ہوتا ہے جن کے ساتھ ہم رہتے سہتے ہیں [3] یعنی بے جان مادّے میں عقل و شعور کا پیدا ہونا ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا کوئی حل آج تک حکمائے مادی پیش نہیں کر سکے۔ [4] یعنی اپنی محدود عقل پر بھروسہ کرنے والوں کو کبھی یکسوئی حاصل نہیں ہوتی۔ اُن کے دل ہمیشہ غیر مطمئن اور پراگندہ رہتے ہیں۔ [5] علم و عقل میں جتنی ترقی ہوتی ہے اتنا ہی اپنی لاعلمی و بے عقلی کا احساس ہوتا ہے اور علم کی ہر سیڑھی پر چڑھنے کے بعد اُس سے اوپر کی سیڑھی پر چلنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ یہی اوپر کی سیڑھی رازِ ازل کی سیڑھی ہے جو طے کردہ منازلِ علمی سے ہمیشہ بلند تر ہوتی ہے۔

ہستی سے قطع تعلّق نہیں کیا جا سکتا

پھری بھی رُت[1] تو میں نشو و نما کو کیا کرتا — نہ تھی وہ نکہت گل پھر صبا کو کیا کرتا
ارادہ تھا کہ میں ہستی سے کر لوں قطع نظر — نہ ہو سکا مگر ایسا خدا[2] کو کیا کرتا

جوشِ طاقت دلیلِ درازیٔ عمر نہیں

عمومی ہے خلقت نوازیٔ عمر — ہر اک کھیل لیتا ہے بازیٔ عمر
مگر یاد رکھ جوشِ طاقت فقط — نہیں ہے دلیلِ[3] درازیٔ عمر

خیالِ عقبےٰ اور نار و جنّت

اِس طرف تُو نے ہسٹری رٹ لی — اُس طرف جا کے فلسفہ پھانکا
لیکن اکبر خیالِ عقبےٰ سے — نار و جنّت کو بھی کبھی جھانکا

---

[1] و [2] رُت لفظ ہندی بمعنی فصل و موسم۔ مطلب غالبًا یہ ہے کہ موسم نشو و نما کا یعنی زمانہ ترقیات کا آیا بھی تو میرے لئے بے کار تھا۔ اس لئے کہ اُس نکہتِ گل کی یعنی میری روح دینی کی نشو و نما نہیں ہوتی تھی اس لئے میں اپنی ہستی ہی سے ایسا بیزار ہو گیا تھا کہ چاہتا تھا کہ اس کا خیال بھی نہ کروں مگر یہ میرے اختیار میں نہیں بلکہ خدا کے اختیار میں تھا اور خدا کی مرضی یہ نہیں تھی کہ ایسا کروں۔ یا یہ کہ میری ہستی میں خدا کی ہستی سمائی ہوئی تھی اور اپنی ہستی سے منہ موڑنا گویا خدا سے منہ موڑنا تھا۔

[3] یعنی محض طاقت کا جوش ہونے سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ عمر بھی طویل ہو گی۔ پہلوانوں کی عمریں عمومًا زیادہ نہیں ہوا کرتیں۔

لامذہبی

پونی اور خرِ بے دُم

مذہب جس کی نظر سے بالکل گم ہے — کیوں کر میں کہوں وہ داخلِ مردُم ہے
شائستہ جو ہو تو اس کو پونی[1] سمجھو — ایسا جو نہ ہو تو اک خرِ بے دُم ہے

منکرِ خدا کے فہم کا قصور

منکر کے خیال میں پریشانی ہے — اُس کا منشا فقط ہوس رانی ہے
دنیا فانی ہے وہ بھی ہے اِس کا مُقر — لیکن نہ سمجھ سکا کہ کیوں[2] فانی ہے

سرکار، پھٹکار اور بے رونقیِ دربار

مذہب کے جو ہو رہیں تو سرکار کا خوف — مذہب سے اگر پھریں تو پھٹکار کا خوف
دونوں سے اگر بچیں تو احباب کو ہے — بے رونقیِ دوکان و دربار[3] کا خوف

---

[1] لفظ انگریزی - PONY - بمعنی ٹٹو۔ یعنی چھوٹے قد کا گھوڑا۔ مطلب یہ ہے کہ لامذہب آدمی کو آدمی تو کہا نہیں جا سکتا۔ اگر وہ پڑھا لکھا ہے تو اُسے اُچھلنے کودنے والا ٹٹو کہہ سکتے ہو، ورنہ وہ بے دم کا گدھا یعنی بالکل ہی کودن ہے۔

[2] یعنی منکرِ مذہب دنیا کے ذاتی ہونے سے یہ نتیجہ نہیں نکال سکا کہ جو چیز فانی ہے اُس کا وجود اُس کے اختیار میں نہیں، کسی دوسرے کے اختیار میں ہے

[3] یعنی جو شخص نہ مذہبی ہو نہ لامذہب اُس کے لئے آج کل دنیاوی کامیابیوں کا حاصل کرنا بہت مشتبہ ہے۔

فتح مذہب کی ہوگی

سائنس سے زیادہ ہے مذہب کی جڑ بڑی
توپوں کی مار سے بھی خدا کی پکڑ بڑی
بابو یہ کہتے ہیں کہ دھرم جیت جائے گا
اس وقت گو ملکش[1] نے ڈالی ہو گڑبڑی

اللہ کو نکال رہے ہیں دلوں سے آپ

لامذہبی سے ہو نہیں سکتی فلاح قوم
ہرگز گذر سکیں گے نہ ان منزلوں سے آپ
کعبے سے بُت نکال دیئے تھے رسولؐ نے
اللہ کو نکال رہے ہیں دلوں سے آپ

توحید نہیں ہوگی تو الحاد ہوگا

باوجود علم رہ سکتا نہیں راحت میں ہند
وجہ یہ ہے مبتلا ہے شرک کی شامت میں ہند
جب نہ ہو توحید[2] تو الحاد غالب آئے گا
بُت پرستی کے سبب رہ جائے گا آفت میں ہند

---

[1] لفظ ملکش ہندی بمعنی ملحد اور ناستک۔ یہاں مراد انگریز ہیں۔

[2] موحدوں کو خدائے واحد کا پورا یقین اور اس کی قدرت کاملہ پر پورا بھروسہ ہوتا ہے۔ اور مشرکوں کے دل بہت سے معبودوں کی طرف متوجہ ہونے سے ڈانواڈول رہتے ہیں۔ اس لئے شرک کا مذہبی قلعہ توحید کے قلعہ کے مقابلہ میں کمزور ہوتا ہے اور اُس پر الحاد رہے دیتی اکا قبضہ زیادہ آسانی سے ہو سکتا ہے۔

دھرم نہیں رہا تو ذات بھی نہیں رہے گی

دل دھرم سے اُٹھا ہے تو اب ذات بھی توڑو
ویراں ہوئی کھیتی تو عمارات بھی توڑو

برباد کرو خوب منوجیؒ کے چمن کو
باقی نہ رہے پھول تو اب پات بھی توڑو

مست ہونے سے بے ہوش رہنا اچھا

شیطاں واعظ ہے پنبہؒ در گوش رہو
غالب ہے اسی کی بات خاموش رہو

بدلا پاتا ہوں مجلسِ دہر کا رنگ
مستی کی ہوس نہ ہو تو بے ہوشؒ رہو

دنیا نے دین کو بھلا رکھا ہے

دنیا نے دین کو بھلا رکھا ہے
غفلت کی نیند میں سُلا رکھا ہے

اِس دور میں خوش نصیب وہ ہے اکبرؔ
جس نے قرآن کو کھُلا رکھا ہے

لہ منوجی ہندوؤں کے دھرم شاستر کے بانی یعنی واضع قوانین ہوئے ہیں۔ ہندوؤں میں ذات پات کی تفریقیں اور بندشیں ان ہی کی عائد کی ہوئی ہیں مطلب یہ ہے کہ جب ہندو مذہب ہی نہیں رہے گا تو ذات پات کی تفریق جسے پُرانے خیال کے ہندو اب تک بہت مفید اور ضروری سمجھتے ہیں وہ بھی نہیں رہے گی اور مذہب کا سارا انتظام بگڑ جائے گا ۲ کانوں میں روئی ٹھونسے رہو یعنی کان بند رکھو ۳ یعنی شیطانی تلقینوں سے بے خبر و بے ہوش رہنا اس سے اچھا ہے کہ تم شیطان کے ورغلانے میں آکر مست اور آپے سے باہر ہو جاؤ۔

دنیا طلبی کا ہنگامہ

اللہ کا حق اگر تلف ہوتا ہے — اس کے لئے کون سربکف[1] ہوتا ہے
دنیا طلبی میں ہے یہ ہنگامہ و شور — حاصل پھر اس سے کیا شرف ہوتا ہے

شیطانی فلاسفی کی دی ہوئی آزادی

انساں چاہے جو بات، اچھی چاہے — بدیوں سے محترز ہو۔ نیکی چاہے
شیطاں[2] سے وہ فلاسفی ہے منسوب — جس کا مطلب ہے۔ کرو جو جی[2] چاہے

دین میں دل کو چھپا لیا

زاہد کی طبع دیکھ کے اُس بت کو لچ[3] گئی — وہ کیا تمام ملک میں اک دھوم مچ گئی
اکبر ہی تھا کہ دین[4] میں دل کو چھپا لیا — وہ بھی کہاں بچا یہ کہو جان[5] بچ گئی

۱۔ سربکف ہونے کے معنی ہیں ہتھیلی پر سر رکھنا۔ یعنی جان دینے پر آمادہ ہونا۔
۲۔ شیطانی فلسفہ یہ ہے Eat, drink and be happy for thou shalt not come again
یعنی کھاؤ، پیو اور خوش رہو۔ کیونکہ دوبارہ تمہیں یہاں آنا نہیں ہے۔ اس فلسفہ کا خلاصہ یہی ہے کہ جو جی چاہے کرو مرنے کے بعد کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔
۳۔ لچنا۔ یعنی جھکنا۔ گرویدہ ہونا۔ بُت سے مراد نئی روشنی کا بُت ہے۔
۴۔ دین میں دل کو چھپانے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے مذہبی عقیدوں کو اتنا مضبوط رکھا کہ دل پر نئی روشنی کا اثر نہیں ہو سکا۔
۵۔ یعنی نئی روشنی کے اثرات سے بالکل محفوظ رہنا تو اکبر کے لئے ممکن نہیں تھا۔ مگر یہ غنیمت ہو، کہ اس کے دل پر لامذہبی کا اثر نہیں ہوا اور وہ ہلاکت سے بچ گیا۔

شعر

شیعہ سُنی کی تفریق

بھائی مجھے کل یہ بات بی مُنی[۱] کی — تفریق اُڑا دو شیعہ[۲] و سُنی کی
جیسا موقع ہو بس بٹھا دو وہ نگیں — ہیرے کی نہ شرط ہو نہ ضد حُبی کی

(ہیرے: مشہور قیمتی جوہر — حُبی: ساخوردہ لعل کا چھوٹا)

چار یار اور پنج تن کی نیک نامی

شیعہ و سنی میں جنگ اک دھوم دھامی ہوگئی — چار یار[۳] اور پنج تن[۴] کی نیک نامی ہوگئی
کیا شرف بخشیں گی تم کو عرش پر یہ کاوشیں — جب زمیں پر تم کو غیروں کی غلامی ہوگئی
ایک قرآں ایک قبلہ ایک اللہ اک رسولؐ — بدنصیبی ہے کہ تفریق دوامی ہوگئی

---

۱ بی مُنی سے مراد متوسط طبقہ کی بھولی بھالی دین دار مسلمان عورت ہے۔

۲ شیعہ مسلمانوں کے اُس مذہبی فرقہ کو کہتے ہیں جو خلفائے اربعہ میں سے صرف حضرت علیؓ کی خلافت کا قائل ہے اور سنی اُن مسلمانوں کو جو چاروں خلفاء کو مانتے ہیں۔

۳ و ۴ چار یار سے حضرت محمدؐ رسول اللہ کے چار رفیق و خلفاء مراد ہیں۔ یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ۔ حضرت عمر فاروقؓ۔ حضرت عثمان غنیؓ۔ اور حضرت علی مرتضےٰؓ رضی اللہ عنہم۔ اور پنج تن سے مراد اہل بیت ہیں۔ یعنی حضرت محمد رسول اللہؐ۔ آپ کی صاحبزادی حضرت سیدہ فاطمہ زہراؓ۔ آپ کے چچازاد بھائی اور داماد حضرت علی مرتضےٰؓ اور آپ کے دو نواسے حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ۔ نیک نامی کا لفظ یہاں طنزاً لکھا گیا ہے۔ مقصد بدنامی ہے۔ یعنی شیعہ سنی آپس میں لڑ کر خلفاء کو بھی بدنام کر رہے ہیں اور اہل بیت کو بھی۔ کیونکہ فرقہ وارانہ تعصب کے جوش میں اکابر بزرگان دین کو دونوں طرف سے برا بھلا کہا جا رہا ہے اور بدنام کیا جا رہا ہے۔

مومنانِ امن جو[1] کو دیر کی سوجھے گی اب ۔۔۔ جب حرم کے صحن میں بدانتظامی ہوگئی
اشتعالِ[2] آتشِ افسردہ اس طوفان میں ۔۔۔ پختہ طبعوں سے الٰہی کیوں یہ خامی ہوگئی

جس نے کھولی بہرِ صلح و آشتی اپنی زباں
پیشِ حق مقبول اس کی خوش کلامی ہوگئی

بناءِ شیعہ کالج

مرے عزیز ہیں شیعہ میں کس طرح یہ کہوں ۔۔۔ کہ میں ہوں خوش جو ہوئی اُن کی درسگاہ[3] جُدا
دلی دعا ہے مگر یہ کہ رکنِ قوم رہیں ۔۔۔ گریجویٹ[4] وہ ہوں سب کے ساتھ خواہ جُدا
بناءِ کالجِ شیعہ الگ ہوئی بھی تو کیا ۔۔۔ وہی ہے منزلِ مقصود گو ہے راہ جُدا
برائے دولت و آبرو ہے ایک ہی مرکز ۔۔۔ نہیں ہے اب بھی طریقِ حصولِ جاہ جُدا
یہ دونوں سایۂ الطافِ مغربی[5] میں ہیں ۔۔۔ نہیں ہے فضلِ الٰہی سے بادشاہ جُدا

[5] یعنی زیرِ اثرِ تہذیبِ مغرب

---

[1] یعنی اسلام میں شیعہ سنی کے ان تفرقوں اور جھگڑوں کو دیکھ کر امن پسند مسلمانوں کے دل غیر مسلموں کی طرف مائل ہونے لگیں گے۔

[2] یعنی پکّے دیندار مسلمانوں میں یہ خامی اور کمزوری خبر نہیں کیسے پیدا ہوگئی کہ اُنھوں نے مغربی لادینی کی شورش کے اس طوفان میں شیعہ سنی کے اختلافات کی دبی ہوئی آگ کو پھر بھڑکا دیا۔

[3] شیعہ حضرات نے فرقہ پرستی کے جوش میں علی گڑھ کالج میں سنّیوں کا زیادہ دخل پاکر لکھنؤ میں ایک شیعہ کالج اپنا الگ قائم کیا تھا۔ مگر مقاصد اس کے بھی تقریباً وہی تھے جو علی گڑھ کالج کے تھے، یہ قطعہ اسی شیعہ کالج کے قائم ہونے پر لکھا گیا۔

[4] گریجویٹ Graduate یعنی کسی علمی یا فنّی درسگاہ کا سند یافتہ۔ عام طور پر بی۔اے اور ایم۔اے پاس کے لئے بولا جاتا ہے۔

جو نسخہ تھا رزولیشن کا ہے اِدھر بھی وہی
نہ کوئی حصن جدا ہے نہ ہے سپاہ جدا

یہ دونوں اب بھی بدستور پیر بھائی ہیں
نہیں ہے حرج جو ہو جائے خانقاہ جدا

ٹرین ایک ہے پھر کیا جو دو ٹکٹ گھر ہوں
کہ اپنا بیگ سنبھالیں ملے پناہ جدا

وہ شیخ کی تھی ترقی یہ مجتہد کا عروج
نئے طریق کے ہیں خوب دو گواہ جدا

شبِ وصال کے نغمے الگ چھڑے دو سمت
جنہیں ہے ہجر وہ کرلیں گے اپنی آہ[۵۱] جدا

عجب نہیں جو بلندئ و اتحاد بڑھے
دکھائے رنگ جو دنیا کا انتباہ[۵۲] جدا

ہزار دور ہوں، اپنے جو ہیں وہ اپنے ہیں
کسی کی آنکھ سے ہوتی نہیں نگاہ جدا

مگن ہیں ٹیچر و انجینیر، رہے ذاکر[۵۳]
وہ کرہی لیں گے کسی طور سے نباہ جدا

ثوابِ نیک خیالی بھی پائے گا اکبر
سوسائٹی میں بزرگوں کی واہ واہ جدا

---

۵۱ مطلب یہ ہے کہ سُنیوں نے علی گڑھ میں اور شیعوں نے لکھنؤ میں اپنے اپنے کالج قائم کرکے معشوق مغربی سے وصال کے ذریعے نکال لئے اور وہ اپنی ان کامیابیوں پر نازاں اور مگن ہیں۔ مگر اکبر جیسے لوگ اپنے ہم قوموں کے اس وصال تہذیب مغربی کو دین وملت سے ہجر سمجھ کر اس پر افسوس کر رہے ہیں۔

۵۲ یعنی ممکن ہے کہ دنیا کوئی ایسا رنگ بدلے جس سے متنبہ ہوکر ان فرقہ وارانہ درسگاہوں کے قائم کرنے والوں کے خیالات بلند ہوجائیں اور اِن میں اتحاد بڑھ جائے۔

۵۳ ذاکر یعنی ذکر کرنے والے یعنی خدا کی دل سے یاد کرنے اور اُس سے بندگی کا سچا تعلق رکھنے والے۔ شیعوں میں شہادت امام حسینؑ کا ذکر کرنے والے

بھی ذاکر کہلاتے ہیں۔

شیعہ سُنّی کے جھگڑے پر فیصلے

گئے برہمن کے پاس لے کر جو اپنے جھگڑے کو شیعہ سُنّی
بگڑ کے بولا کہ جاؤ بھاگو ملکش تم بھی ملکش وہ بھی
بڑھی جو تکرار تو وہ لے کر انہیں فرنگی کے پاس پہنچا
وہ بولا بس دور ہو یہاں سے کہ تم بھی نیٹو[1] ہو وہ بھی نیٹو
فلک[2] نے آخر ہر اک کی سُن کر کہا کہ تم سب ہو مست غفلت
سمجھ لو اس کو کہ تم بھی فانی ہو وہ بھی فانی ہے یہ بھی فانی

[1] " Native " ، دیسی۔ تحقیراً کالے آدمی۔

[2] فلک سے مراد قدرت ہے۔

پند
و
موعظت

شراب شیطان کی پرائیویٹ سکریٹری

پاکیزگیٔ نفس کی دشمن مے ہے — انسان کو خراب کرنیوالی شے ہے
شیطان کی ہے پرائیویٹ سکریٹری (شراب) — مسلم اور اس کو منہ لگائے ہے ہے (افسوس!)

سعیٔ بازو اور حسن تدبیر

باپ سے مانگو نہ عشرت نہ چچا سے مانگو — سعیٔ بازو پہ کرو تکیہ خدا سے مانگو
حسن تدبیر بڑی چیز (فرد کو بڑی) ہے اس دنیا میں — مدد اس کام میں تم عقلِ رسا (حقیقت آشنا) سے مانگو

ناصح بہت، عامل مفقود

اس عہد میں یہی ہے بس داخل نکوئی — مذہب پہ نکتہ چینی ملت کی عیب جوئی
شوقِ عمل نہیں ہے فکرِ اجل نہیں ہے — ناصح بنے ہیں اکثر عابد (عبادت کرنے والے) نہیں ہے کوئی

بال سفید عمل سیاہ

افسوس سفید ہو گئے بال ترے — لیکن ہیں سیاہ اب بھی اعمال ترے

لہ انگریزی لفظ Private Secretary بمعنی پیشکار کے۔ شیطان کی پرائیویٹ سیکریٹری ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس میں بھی وہ تمام خرابیاں موجود ہیں جو شیطان میں ہیں، مگر ذرا دبی اور چھپی ہوئی۔ یعنی شراب کو منہ لگانے اور اس کا عادی ہو جانے سے شرابی کے اندر بھی رفتہ رفتہ تمام شیطانی خصلتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

تو زلفِ بتاں بنا ہوا ہے اب تک — دنیا پہ ہنوز پڑتے ہیں حبال[1] ترے

پتلون کو لنگوٹی کر دینے والی شراب

جو عقل کھری تھی، کی وہ کھوٹی اس نے — اچھے اچھوں سے چھینی روٹی اس نے
مستوں پہ شراب فاقہ مستی لائی — پتلون کو کر دیا لنگوٹی[2] اس نے

کینہ پروری بڑی بری چیز ہے

اونچا نیت کا اپنی زینہ رکھنا — احباب سے صاف اپنا سینہ رکھنا
غصہ آنا تو نیچرل[3] ہے اکبر — لیکن ہے شدید عیب کینہ رکھنا

ذلت کے جینے سے مرنا اچھا

غفلت کی ہنسی سے آہ بھرنا اچھا — افعالِ مضر سے کچھ نہ کرنا اچھا
اکبر نے سنا ہے اہلِ غیرت سے یہی — جینا ذلت سے ہو تو مرنا اچھا

۱؎ یعنی تیرے سفید بال بھی زلفِ بتاں کی طرح دنیا کو اپنے جال میں پھنسا رہے ہیں۔ ۲؎ یعنی جو خوشحال و فارغ البال تھے شراب کے عادی ہو کر بھوکے ننگے ہو گئے۔ ۳؎ لفظ انگریزی NATURAL یعنی طبعی یا اقتضائے طبعی۔

رشوت، عیاشی، خوشامد، اور گستاخی

رشوت ہے گلوئے نیک نامی کا چھرا[۱]　　عیاشی ہے بدی کے پہیئے کا دُھرا[۲]
ہر چند کہ بے محل خوشامد ہے بُری　　گستاخ مگر خوشامدی سے بُرا[۳]

بے حیا سے مکار اچھا[۴]

آزاد سے دیں کا گرفتار اچھا　　شرمندہ ہو دل میں وہ گنہگار اچھا
ہر چند کہ زُور بھی ہے اک خصلت بد　　واللہ کہ بے حیا سے مکار اچھا

وَتَبَتَّلْ اِلَیْہِ تَبْتِیْلًا

کر رحم حق پہ رکھ نظر اپنی　　جو عقیدہ ترا نہ ہو ڈھیلا
آسرا سب کا چھوڑ دے اکبر　　وَتَبَتَّلْ اِلَیْہِ تَبْتِیْلًا[۵]

---

[۱] یعنی رشوت لینے سے نیک نامی کے گلے پر چھری پھر جاتی اور آدمی بدنام ہو جاتا ہے۔

[۲] دھرا۔ لوہے کی اُس سلاخ یا ڈنڈے کو کہتے ہیں جس پر پہیہ پھرتا ہے۔ یعنی عیاشی سے بدچلنی کا راستہ کھل جاتا ہے۔

[۳] و[۳] یعنی گستاخ بے محل تعریف کرنے والے خوشامدی سے بھی بُرا ہوتا ہے۔ اس لیے کہ گستاخی کا محرک جذبہ سرکشی ہوتا ہے اور خوشامد کا محرک احساس کم تری و فروتنی۔

[۴] بے حیا سے مکار کو اس لیے اچھا کہا گیا ہے کہ بے حیا میں احساس ندامت و شرمندگی باقی نہیں رہتا اور مکار میں یہ احساس موجود ہوتا ہے۔ اسی لیے مکار اپنی غلطیوں اور کمزوریوں کو چھپانے کی کوشش کیا کرتا ہے۔

[۵] یہ آیت قرآنی ہے جس کا مفہوم ہے "ہر طرف سے بے تعلق ہو کر اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہو جاؤ"۔

ہم رنگ سے ارتباط، بے میل سے احتراز

مذموم ہے رمز[1] و طعنہ و کبر و حسد (ذرا سی بھونک) — رکھو یہ روش کرے جو اللہ مدد
ہم رنگ سے ارتباط با صدق و صفا (دوستی، خلوص) — بے میل[2] سے احتراز بے کینہ و کد (پرہیز، بے رقابتی)

مرنے کے بعد

فرمانِ اجل کا آگیا وقتِ صدور (جاری ہونا) — ہوں گے کوئی دم میں شاملِ اہلِ قبور
دیکھیں منکر نکیر[3] کیا کہتے ہیں — یاں سب مجھے کہتے ہیں خداوند حضور

حاسد[4] کا احساسِ پستی

حاسد تجھ پر اگر حسد کرتا ہے — کر صبر کہ خود وہ کارِ بد کرتا ہے
اپنی پستی کو کر رہا ہے محسوس — اور تیری بلندیوں سے کد کرتا ہے (برقابتی)

---

[1] ہم رنگ بمعنی ہم خیال و ہم مذاق و ہم مشرب۔ ایسے شخص سے تعلقات بڑھانے چاہئیں مگر سچائی اور خلوص کے ساتھ۔

[2] بے میل۔ یعنی جو ہم مذاق و ہم مشرب نہ ہو اُس سے میل جول نہیں بڑھانا چاہیے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس سے کینہ و پرخاش رکھا جائے۔

[3] منکر نکیر۔ جن کو نکیرین بھی کہتے ہیں۔ اُن دو فرشتوں کا نام ہے جو مرنے کے بعد مردہ سے اُس کے ایمان و عقائد کے بارے میں سوالات کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ دنیاوی زندگی میں تو سب مجھے خداوند حضور کہہ کر مخاطب کرتے ہیں یعنی بڑی تعظیم و تکریم سے پیش آتے ہیں مگر نہیں کہ مرنے کے بعد منکر نکیر میرے ساتھ کیسا سلوک کریں گے۔ کیونکہ مرنے کے بعد تو دنیاوی عزت کی نہیں بلکہ نیک اعمال ہی کی پرسش ہوتی ہے۔

[4] حسد کسی کی ترقی و خوشحالی سے جلنے اور اس کے زوال کی آرزو کرنے کو کہتے ہیں۔ حسد کا مرض حاسد میں اپنی پستی کے احساس اور محسود (جس سے حسد کیا جائے) کی ترقی کو دیکھ کر کڑھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ حاسد اپنی کم ہمتی سے خود تو ترقی نہیں کر سکتا اور ہمیشہ محسود کی ترقی سے جلا کرتا ہے۔ اس لئے حسد کا نقصان محسود کے مقابلہ میں حاسد کو

رَبِّ یَسِّر اور تَمَّت بالخَیر

بے سود ہے یہ شکوۂ و لفاظی و سیر — افسوس ہے مخلصوں کو اور ہنستے ہیں غیر

چلیے اکبر رَبِّ یَسِّر[1] کہہ کر — ہو سکتی ہے تب امید تَمَّت بالخَیر[1]

اثر انداز کہنا اور سننا

کہنے سننے کی گرم بازاری ہے — مشکل ہے مگر اثر پرائے دل میں

ایسا سنیے کہ کہنے والا اُبھرے — ایسی کہیے کہ بیٹھ جائے دل میں

اللہ پر بھروسہ رکھو

خاطر مضبوط دل توانا رکھو — امید اچھی خیال اچھا رکھو

ہو جائیں گی مشکلیں تمہاری آساں — اکبر اللہ پر بھروسا رکھو

اصلی دولت، زینت اور عزت

تحصیلِ علوم کر کہ دولت ہے یہی — اخلاق درست کر کہ زینت ہے یہی

اکبر کی یہ بات یاد رکھ اے عشرت[2] — محفوظ ہو معصیت سے عزت ہے یہی

---

[1] رَبِّ یَسِّر اور تَمَّت بالخَیر ماخوذ ہے دعاءِ قدسی رَبِّ یَسِّر وَلَا تُعَسِّر وَتَمِّم بالخَیر سے جس کا ترجمہ ہے "اے رب میرے آسان کر دے اور مشکل نہ کر اور خیریت سے انجام کو پہنچا دے۔ تَمَّت بالخَیر کے معنی ہیں ختم ہو گیا ساتھ خیریت کے۔

[2] سید عشرت حسین مرحوم حضرت اکبر کے بڑے صاحبزادے تھے۔

خوشی سے مرنا سیکھو

اعمال کے حُسن سے سنورنا سیکھو　　اللہ سے نیک امید کرنا سیکھو

مرنے سے مفر نہیں ہے جب اے اکبؔر　　بہتر ہے[۱] یہی خوشی سے مرنا سیکھو

جائے پناہ

اللہ کو دل میں بساؤ

دنیائے دنی کی یہ ہوس جلنے دو　　گلچیں ہو اگر تو خار و خس[۲] جانے دو

ذلیل　　کانٹا　　گھاس پھونس

مالک کے بغیر گھر کی رونق نہیں کچھ　　اللہ کو اپنے دل میں بس جانے دو

ایمان کو مضبوط رکھو

مرد کو چاہیئے قائم رہے ایمان کے ساتھ　　تا دمِ مرگ رہے یادِ خدا جان کے ساتھ

میں نے مانا کہ تمہاری نہیں سنتا کوئی　　سُر[۳] ملانا تمہیں کیا فرض ہے شیطان کے ساتھ

---

[۱] یعنی ایسی زندگی بسر کرو کہ مرنے کے خیال سے تم کو رنج نہیں بلکہ خوشی ہو۔

[۲] یعنی اگر دنیا کے گلچیں ہو یعنی دنیاوی زندگی سے عقبیٰ کا فائدہ اٹھانا چاہتے ہو تو اس کے خار و خس یعنی ایسی چیزوں کے پیچھے نہ پڑو جن سے تکلیف پہنچے یا جو عقبیٰ میں کام نہ آئیں۔

[۳] شیطان کے ساتھ سُر ملانا بمعنی ہم نوا ہونا۔ یعنی شیطانی حرکتیں کرنا۔

خدا کی یاد میں دونوں جہان کا نفع

تسبیح و دعا میں جس نے لذت پائی — اور ذکر خدا سے دل نے راحت پائی
(سبحان اللہ کہتا)
کوئی نہیں خوش نصیب اُس سے بڑھ کر — بس دونوں جہاں کی اُس نے نعمت پائی

صوفی اور مُلّا کا اختلاف

ہستی[1] نے جگایا ہے، کیونکر کہوں سو رہیے — اتنی ہی نصیحت ہے اللہ کے ہو رہیے
اے صوفی و اے مُلّا، اتنی ہی گذارش ہے — معنٰی[2] میں رہے وحدت الفاظ میں دو رہیے

تم کو خدا نے دیا ہے تو دوسروں کو بھی دو

ہو علم اگر نصیب تعلیم بھی کر — دولت جو ملے تو اس کو تقسیم بھی کر
اللہ عطا کرے جو عظمت تجھ کو — جو اہل ہیں اس کے اُن کی تعظیم بھی کر

نمودِ بے سود اور اچھل کود کو چھوڑ

یہ بھی غلطی دیا جو معبود کو چھوڑ — اصلاح یہ ہے، نمودِ بے سود کو چھوڑ
(خود نمائی)

[1] یعنی جب خدا نے زندگی دی ہے تو میں یہ کیونکر کہوں کہ مر جاؤ۔

[2] یعنی مقصد میں اختلاف نہیں ہونا چاہیئے۔ خواہ مسلک الگ ہوں۔

بزمِ ملت کا نافیت جو ہے اگر	اللہ کے آگے جُھک اچھل[1] کود کو چھوڑ
(اقبال)

ماں باپ کی رضا جوئی

کہہ دو کہ میں خوش ہوں رکھوں گر آپ[2] کو خوش	بجلی چمکاؤں[3] اور کروں بھاپ کو خوش
سیکھوں ہر علم و فن مگر فرض یہ ہے	ہر حال میں رکھوں اپنے ماں باپ کو خوش

قومی عزت نیکیوں سے ہے

حاصل کرو علم، طبع کو تیز کرو	باتیں جو بُری ہیں اُن سے پرہیز کرو
قومی عزت ہے نیکیوں سے اکبر	اس میں کیا ہے نقل انگریز کرو

نفسِ حریص کی غلامی

دنیا طلبی میں عاجزی کی تو نے	دینی اکرام کیا کیا، کچھ نہ کیا
بس نفسِ حریص کا رہا تو خادم	اللہ کا کام کیا کیا، کچھ نہ کیا

---

[1] اچھل کود سے یہاں مراد روشِ بندگی کی بجائے روشِ آزادیِ جدید کا اختیار کرنا ہے۔

[2] آپ سے مراد پیروانِ مغرب ہیں۔

[3] یعنی برقی اور دخانی مشینوں سے کام لے کر اسبابِ راحت و عیش مہیا کروں۔

اخلاق
و
معاشرت

اصلی اور نقلی معاشرت

آگاہ ہوں معنیٔ خوش اقبالی سے
واقف ہوں بنائے رتبۂ عالی سے
شرطیں عزت کی اور ہیں اے اکبر
چلتا نہیں کام صرف نقالی[1] سے

معیارِ عزت عمل نیک ہے

سمجھیں نہ حضور تھرڈ[2] والوں کو حقیر
انجن تو وہی ہے جس کی ہم سب کو ہے آس
اسٹیشن گور تک ہے یہ فسٹ و سکنڈ
بعد اس کے موافق عمل ہوگا کلاس

---

[1] یعنی محض بڑے لوگوں کے لباس یا چال ڈھال وغیرہ کی نقل کرنے سے کوئی بڑا آدمی نہیں بن جاتا۔ بڑا اور معزز آدمی بننے کے لئے بڑے آدمیوں کی سی قابلیتیں اپنے اندر پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

[2] تھرڈ THIRD بمعنی تیسرا۔ فسٹ FIRST کا ہند بمعنی پہلا۔ سیکنڈ Second بمعنی دوسرا۔ کلاس Class بمعنی درجہ۔ یہ سب انگریزی الفاظ ہیں۔ ریلوں میں مسافروں کی حیثیتوں کے لحاظ سے تین درجے ہوا کرتے ہیں۔ اعلیٰ حیثیت کے مسافر درجہ اول میں اُن سے کم حیثیت کے درجہ دوم میں اور سب سے کم حیثیت کے درجۂ سوم میں سفر کرتے ہیں۔ مگر ریل کا چلانے والا انجن جس کے بغیر کوئی مسافر منزل مقصود پر نہیں پہنچ سکتا ایک ہی ہوتا ہے۔ ان شعروں میں انسانی زندگی کو ریل سے اور اس کے چلانے والے، یعنی حکم خدا کو انجن سے تشبیہ دی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ دنیاوی زندگی میں اعلیٰ۔ ادنیٰ اور بڑے چھوٹے کی جو تفریق ہم کو نظر آرہی ہے وہ اسی وقت تک ہے جب تک کہ زندگی کی ریل اپنے اسٹیشن یعنی قبر تک نہیں پہنچ جاتی یعنی جب تک کہ موت نہیں آجاتی۔ مرنے کے بعد مدارج و مراتب کی سب تفریقیں ختم ہوجاتی ہیں اور اس کے بعد جو درجہ انسان کو ملتا ہے وہ اس کے عمل کے مطابق ملتا ہے اور یہی درجہ خدا کے نزدیک معتبر ہوتا ہے حسب ارشاد۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ یعنی تم میں سب سے زیادہ ذی عزت وہ ہے جو خدا کے نزدیک سب سے زیادہ نیک عمل ہے۔

دولت ولذّت، راحت وعزّت

دولت وہ ہے جو عقل و محنت سے ملے ‏ لذّت وہ ہے کہ جوشِ صحت[1] سے ملے

ایماں کا ہو نور دل میں وہ راحت ہے ‏ عزّت وہ ہے جو اپنی ملّت (قوم) سے ملے

ترقیٔ باطن

انبساطِ[2] نفس الگ ہے، روح[3] کا وجد اور ہے ‏ دشتِ[4] وحشت اور ہے، اور وادیٔ[5] نجد اور ہے

ہو جو باطن کی ترقی تجھ کو منظورِ نظر ‏ یاد رکھ اکبر تکبّر[6] اور ہے، تمجّد[7] اور ہے

رذیل فطرت کثیف دل

جس کو خدا سے شرم ہے وہ ہے بزرگِ دیں ‏ دنیا کی جس کو شرم ہے مردِ شریف ہے

---

[1] جوشِ صحت سے صحت کا اتنا زیادہ اچھا ہونا مراد ہے کہ خود اپنی صحت ہی سے انسان کو لذت حاصل ہونے لگے۔

[2] و [3] و [4] و [5] اس شعر کے دوسرے مصرع میں صنعت لف ونشر غیر مرتب ہے۔ یعنی دشت وحشت جس کا مصرع دوم میں پہلے ذکر ہے اس کا تعلق پہلے مصرع میں روح کے وجد سے ہے اور وادیٔ نجد جس کا ذکر دوسرے مصرع کے بعد میں ہے اس کا تعلق انبساط نفس سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انبساطِ نفس یعنی نفس کی خوشی اور روح کا وجد ایک نہیں بلکہ دو الگ الگ کیفیتیں ہیں۔ انبساط نفس کی کیفیت تو وہ تھی جو لیلےٰ کے عاشق قیس کو لیلےٰ کے مسکن وادیٔ نجد میں حاصل ہوتی تھی اور جس میں قیس کو لذت عشق محسوس ہوتی اور اس کے ہوش وحواس بجا رہتے تھے۔ اور روح کے وجد کی کیفیت وہ تھی جو قیس کو وارفتہ وبے خود کر کے صحرا نوردی پر آمادہ کر دیتی تھی اور جس میں نہ تو لذتِ عشق کا احساس باقی رہتا تھا اور نہ خارِ مغیلان اور دشت پیمائی کی تکلیف کا۔

[6] و [7] تکبّر کے معنی ہیں اپنے آپ کو بڑا سمجھنا۔ گھمنڈ اور غرور کرنا۔ اور تمجّد کے معنی ہیں بزرگوار ہونا۔ بڑا ہونا۔ ظاہر کی ترقی سے تکبر یعنی بزرگی کی نمایش کا احساس ہوتا ہے۔ اور باطن کی ترقی سے تمجد یعنی اپنی خودی کی برتری وبزرگی کا۔

جس کو کسی کی شرم نہیں اس کو کیا کہوں   فطرت[1] میں وہ رذیل ہے دل کا کثیف ہے

علالتِ اخلاق

خلقت جو کہیں ذلیل ہو جاتی ہے   بے غیرت و بے دلیل[2] ہو جاتی ہے
گو جسم میں ظاہرا توانائی ہو   اخلاق میں[3] وہ علیل ہو جاتی ہے

دولت و شہرت بڑھنے کا سودا

سب کو سودا ہے یہی دولت بڑھے شہرت بڑھے   اس کا کیا غم، چپکے[4] ہی چپکے اگر شامت (بدبختی) بڑھے
اب کہاں اگلی لگاوٹ (محبت)، اور وہ اظہارِ نیاز   بات[5] یہ ہے، وقت بدلا، میں گھٹا حضرت بڑھے

[1] یعنی جس کو نہ خدا کی شرم ہے نہ دنیا کی وہ فطرتاً ہی رذیل و بے شرم واقع ہوا ہے۔

[2] دلیل کے معنی رہبر کے بھی ہیں۔ یعنی جو قوم دنیا کی نظروں میں ذلیل ہو جاتی ہے اس کا ضمیر بھی اس کی رہنمائی کرنا چھوڑ دیتا ہے اور اس میں شرم و غیرت کا احساس باقی نہیں رہتا۔

[3] یعنی اس میں اخلاقی بیماریاں اور بداطواریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

[4] یعنی غیر محسوس طور پر زندگی کو گھن لگتا رہے۔

[5] یعنی دوستوں میں پہلی سی محبت و نیازمندی نہ رہنے کی وجہ یہ ہے کہ میری حالت گر گئی اور وہ بڑے آدمی ہو گئے۔

رنگین اور سادہ جھوٹ

تصدیق ادھر بشوق اُدھر بالارادہ جھوٹ — اس سے زیادہ مکر نہ اس سے زیادہ جھوٹ
عارض نہ ان کا گل ہے نہ دل میرا آئینہ — رنگین جھوٹ وہ ہے اگر یہ ہے سادہ جھوٹ

حرص، قناعت اور محنت

حصہ حریص کا ہے بے دینی و غلامی — قانع کے واسطے ہے اعزاز و نیک نامی
محنت ہی کے لیے ہے تفریح قلب و روزی — مقبول دوستاں ہے اکبر کی خوش کلامی

۵۱۔ ۵۲۔ ۵۳۔ یعنی اُدھر تو بالارادہ جھوٹ بولا جاتا ہے۔ اور اِدھر نہایت شوق سے اس کی تصدیق کی جاتی ہے ایسے جھوٹ سے بڑھ کر کوئی جھوٹ نہیں اور ایسی تصدیق سے بڑھ کر کوئی مکر نہیں۔

محبوب کے رخسار کو گُل کہا جائے یا اپنے دل کو آئینہ، دونوں باتیں حقیقت سے بعید یعنی جھوٹی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلا جھوٹ (بہ رعایتِ گل) رنگین ہے اور دوسرا جھوٹ (بہ رعایت آئینہ) سادہ۔ غرضیکہ ہم خواہ ان کی تعریف کریں یا اپنی صاف بیانی کا دعوٰے، دونوں غلط ہیں۔ حضرت اکبر کا یہ قطعہ حسب معمول عاشقانہ الفاظ میں سیاسی طنز کا حامل ہے اور اُس طبقے کا ترجمان جو انگریز کی سہو دانستہ غلط بیانی کی پُرزور تائید پر آمادہ رہا کرتا تھا۔ اس "تصدیق" کی عادت کا مفہوم ایک اور شعر میں اس طرح ادا کیا ہے:

جو کہا اُس نے، کیا منظور، کیسا حرف نفی — ہم سراپا اب تو اس محفل میں جی ہاں ہو گئے (راشد ملتانی)

۵۴۔ حریص کے معنی ہیں بڑا لالچی۔ یعنی لالچ جب حد سے بڑھتا ہے تو آدمی اپنا دین بھی بیچ دیتا ہے اور اپنی آزادی بھی۔ برخلاف اس کے قانع یعنی وہ جو اپنی حالت پر راضی اور مطمئن ہوتا ہے اس کی عزت و نیک نامی برقرار رہتی ہے۔

لیاقت، وجاہت اور شرافت

انساں[1] میں معتبر لیاقت بھی ہے — محسوب اس وزن میں وجاہت بھی ہے
اندازِ[2] سخن سے بھی ہے اندازِ طبیع — ایک جزوِ قوی مگر شرافت بھی ہے

حد سے بڑھی ہوئی حرص اور خود بینی

شیطان سے دل کو ربط ہو جاتا ہے — دشوار انسان کو ضبط[3] ہو جاتا ہے
حد سے جو سوا ہو حرص یا خود بینی — اکثر ہے یہی کہ خبط[4] ہو جاتا ہے

حرص و ہوس سے بے غیرتی پیدا ہوتی ہے

ہے حرص[5] و ہوس کے فن کی مجھ کو تکمیل — غیرت نہیں میری بزمِ دانش میں دخیل
ہیں نفس کی خواہشیں بہت مجھ کو عزیز — جب چاہیں کریں خوشی سے مجھ کو وہ ذلیل

---

[1] مطلب یہ ہے کہ اچھا انسان بننے کے لئے لیاقت کی بھی ضرورت ہے۔ وجاہت کی بھی۔ خوش کلامی کی بھی اور سب سے زیادہ شرافت کی۔

[2] یعنی بات کرنے کے طریقہ سے بھی بات کرنے والے کی طبیعت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

[3] ضبط بمعنی روکنا۔ یعنی شیطان سے میل ہونے کے بعد پھر انسان اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکتا۔

[4] یعنی حد سے بڑھے ہوئے لالچ اور غرور کا نتیجہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ آدمی پاگل ہو جاتا ہے۔

[5] یعنی حرص و ہوس میری اس قدر بڑھ گئی ہے کہ غیرت سے کام لینے کی ضرورت ہی میں نہیں سمجھتا۔ بس میری خواہشیں پوری ہو جانی چاہئیں خواہ مجھے کوئی کتنا ہی ذلیل کیوں نہ کرے۔

بے شرم و سرد مہر حسین

دل کش نہیں وہ حسیں جسے شرم نہیں
رونق نہیں اس کی جس کا دل گرم[۱] نہیں
سختی[۲] میں بھی ہو گداز طینت ہو جو صاف
پگھلی ہے برف گو کہ وہ نرم نہیں

مذہب، ادب اور خاکساری

تہذیب وہ ہے کہ رنگ مذہب بھی ہو
آزاد وہ ہے کہ جو مؤدب بھی ہو
تزئین (زیب و زینت) وہ ہے کہ خاکساری بھی ہو ساتھ
اسپیچ (تقریر) وہ ہے کہ جس میں یا رب بھی ہو

دل داریٔ و طلب گاریٔ دنیا

دل وہ ہے، محو ہو ہر دم طلب باری میں
زندگی وہ، جو کٹے موت کی تیاری میں
حسن اخلاق ہے دل داریٔ[۳] دنیا کرنا
خطرہ جو کچھ ہے، وہ دنیا کی طلب گاری[۴] میں

---

۱ گرم دل سے مراد پسیجنے والا یعنی غیرت و ہمدردی کا احساس رکھنے والا دل ہے۔

۲ یعنی جس کی طینت صاف اور باطن کثافت سے پاک ہوتا ہے وہ برف کی طرح بظاہر سخت ہونے کے باوجود پگھلنے والا ہوتا ہے یعنی دوسروں کے دکھ درد سے متاثر ہوتا ہے۔

۳ و ۴ دل داری دنیا سے مراد ہے دنیا والوں کے دکھ درد میں شریک ہونا۔ اور طلبگاری دنیا سے مراد ہے دنیا کی الفت و محبت رکھنا جو خطرناک ہے۔

بصائر
و
حکم

نورِ لاہوت اور بھوت

عبرت، عرفاں (معرفتِ خدا)، سوزِ دل (تڑپ) جس کا تھا شغل — روح اس کی نکل کے نورِ لاہوت[1] بنی
خوانِ برگڈ[2] پہ جو رہا مثلِ مگس (مکھی) — جان اس کی کسی گودام کی بھوت[3] بنی

فطری اور مصنوعی خوبی

فطری خوبی ہے مبتلا فالج[4] میں — بلبل داخل ہے میوزیکل[5] کالج میں
داخل میں نوائے (آواز) ساز کی کس کو ہے خبر — رعشہ[6] (لرزہ، حرکت) ہر سُر کو ہے مگر خارج میں

[1] لاہوت عالمِ ذاتِ الٰہی کو کہتے ہیں، جہاں پہنچنے پر سالک راہِ طریقت کو مرتبۂ فنا فی اللہ (اللہ کی ذات میں فنا ہو جانا) حاصل ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو خدا کے خاص بندے انقلاباتِ جہاں سے عبرت حاصل کرتے اور معرفتِ الٰہی میں کوشاں اور حصولِ دیدارِ الٰہی کے لئے تڑپتے رہتے ہیں مرنے کے بعد اُن کی روح فنا فی اللہ یعنی ذاتِ حق سے واصل ہو جاتی ہے [2] لفظ انگریزی "BRIGADE" بمعنی پیدل اور رسالہ کی ملی جلی فوج جو ایک بریگیڈیر جنرل کی ماتحتی میں ہو۔ یہ لفظ کلامِ اکبر میں اکثر جگہ استعمال ہوا ہے، اس سے مراد غالباً انگریزوں کی فوجی چھاؤنیاں ہیں جن کی خوراکی اور دوسری ضروریات کے بہم پہنچانے پر بہت سے ہندوستانیوں کی معیشت کا دار و مدار تھا [3] بھوت خبیث رُوح یا آسیب کو کہتے ہیں جو مرنے کے بعد بھی دنیا میں اٹکی اور پھنسی رہتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ حصولِ دنیا میں جائز و ناجائز کی پرواہ نہیں کرتے اور مکھیوں کی طرح ذرائعِ معیشت سے ساری عمر چمٹے رہتے ہیں۔ مرنے کے بعد بھی ان کی روحوں کو دنیا سے آزادی نہیں ملتی اور سکون و اطمینان نصیب نہیں ہوتا۔ [4] فالج ایک مشہور بیماری ہے جس میں انسان کا پورا جسم یا جسم کا کوئی حصہ بے حس و بے حرکت ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مصنوعی ذرائعِ ترقی یعنی ایجادات و اختراعات کی وجہ سے انسان کی فطری قابلیتیں اور خوبیاں مفلوج یعنی شل ہو کر رہ گئی ہیں اور فطری کمالات کی قدر بہت کم ہو گئی ہے [5] لفظ انگریزی " Musical college " بمعنی درسگاہِ موسیقی مطلب یہ ہے کہ بلبل جیسے خوش الحانوں کے بھی فطری گانوں کی قدر نہیں رہی اور ان کو بھی گانا سیکھنے کے لئے موسیقی کی درسگاہوں میں داخل ہونے کی ضرورت پیش آ گئی۔

(باقی صفحہ ۱۱۶ پر)

درعمل کوش ہرچہ خواہی پوش

بی شیخانی بھی ہیں بہت ذی ہوش
کہتی ہیں شیخ سے بجوش و خروش

خواہ لنگی[1] ہو خواہ ہو تہمد
درعمل کوش ہرچہ خواہی پوش[2]

مذہبی غول بندی

پوچھا میں نے کہ تیرا مذہب کیا ہے
کہنے لگے اس سے تیرا مطلب کیا ہے

میں نے یہ کہا کہ غول بندی[3] کے لئے
بولا کہ شکست کھا چکے اب کیا ہے

پیر فرنگ کی حکمت

رندی و شراب و بزم شاہد بھی ہے
منطق بھی ہے دلیل ملحد بھی ہے

لیکن قربان حکمت پیر مغاں[4]
دو مولوی بھی ہیں ایک مسجد بھی ہے

(صفحہ ۱۱۵ کا بقیہ فٹ نوٹ) [6] مطلب یہ ہے کہ فطری اور اندرونی قابلیتوں کو کوئی نہیں دیکھتا اس لئے سب اپنے خارجی اور مصنوعی کمالات کی نمائش کر رہے ہیں۔ [1] لنگی اور تہمد دونوں قریب قریب ایک ہی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ یعنی وہ کپڑا جو عموماً پاجامہ کی بجائے ستر پوشی کے لئے کمر سے باندھا جاتا ہے۔ مگر یہاں لنگی سے مراد غالباً دھوتی ہے جو ہندوؤں کا پہناوا ہے۔ [2] یہ مصرع شیخ سعدیؒ کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو چاہے پہنو مگر نیک کردار رہو۔ [3] غول بندی یعنی اپنی جماعت یا ٹولی بنانا۔ مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کا مقصد مذہبی بننے سے محض ایک ٹولی یا قومیت کو مضبوط کرنا تھا۔ ان کو تو دوسری ٹولیوں نے شکست دیدی ہے۔ اب تو ضرورت دنیا کے لئے نہیں بلکہ دین کے لئے اور نمائشی نہیں بلکہ سچے مسلمان بننے کی ہے۔ [4] پیر مغاں کے لفظی معنی ہیں آتش پرستوں کا پیر۔ استعمال اس کا زیادہ تر رند مشرب اور چالاک پیروں کے لئے ہوتا ہے۔ یہاں اس سے مراد انگریز ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ انگریز ایسے عقلمند اور مدبر حکمران ہیں کہ ان کی حکومت میں رندی و عیاشی بھی ہو رہی ہے اور سائنس و فلسفہ اور لامذہبی و آزاد منشی کی تبلیغ بھی۔ مگر اس کے ساتھ ہی مسجدیں بھی موجود ہیں اور مولوی بھی۔ اور ایک مسجد کے لئے ایک ہی نہیں بلکہ دو دو مولوی تاکہ وہ خدا پرستوں کو آپس میں لڑاتے بھی رہیں۔

کام میرا نام آپ کا

میں نے جو کہا کُل انتظام آپ کا ہے ہے فائدہ آپ کا یہ کام آپ کا ہے
کہنے لگے مُسکرا کے یہ سب ہے صحیح لیکن خوش ہو جئے کہ نام[1] آپ کا ہے

مُردہ زندگی

انسان جو عمر ختم کر چکتا ہے خوش ہو چکتا ہے آہ بھر چکتا ہے
فانی دنیا کا دیکھ لیتا ہے رنگ زندہ جو رہا بھی وہ تو مر[2] چکتا ہے

ذلیل اور بے غیرت دنیا

دنیا کو بہت ذلیل پایا میں نے بے غیرت و بے دلیل[3] پایا میں نے
اخلاقی پہلوؤں سے جانچا اکبر شدت ہے اسے علیل پایا میں نے

---

[1] مطلب یہ ہے کہ ہوم رول یا حکومت خود اختیاری مل جانے کے بعد بھی حکومتی پرزوں کے چلانے والے اور حکومت سے فائدہ اٹھانے والے تو انگریز ہی ہیں۔ نام البتہ ہندوستانیوں کا ہے کہ وہ اپنے ملک کی حکومت آپ چلا رہے ہیں [2] یعنی پیر فانی یا ایسا شخص جو عمر طبعی کو پہنچ چکا ہو۔ اگر زندہ بھی رہے تو اس کی زندگی بیکار ہے اور وہ زندہ درگور کہلانے کا مستحق ہے [3] دلیل کے معنی رہنما کے بھی ہیں اور حجت و بحث کے بھی۔ بے دلیل سے یہاں مراد ایسے اکھڑوں سے ہے جو بلا کسی وجہ معقول کے دوسروں سے اُلجھتے اور اپنی بات منوانا چاہتے ہیں۔ دنیا میں جہاں ذلیل و بے غیرت لوگ بہت ہیں وہاں اکھڑ اور کٹھ حجتی بھی کافی ہیں۔

جینا اور مرنا

جینا تھا جس قدر ہمیں دنیا میں جی لئے — ساغر کئی طرح کے ملے اور پی لئے
غم بھی رہا خوشی بھی تحیر بھی فکر بھی — جاتے ہیں اب کہ آئے تھے ہم[1] بس اسی لئے

طاقت و عزت اور تعلیم و تربیت

طاقت وہ ہے با اثر جو سلطانی ہے — اُس جا ہے چمک جہاں زر افشانی[2] ہے
تعلیم وہ خوب ہے جو سکھلائے ہنر — اچھی ہے وہ تربیت جو روحانی ہے

حاضر و غائب خدا

یہ دربار ہے خالق دو جہاں کا — ادب اپنا سکہ بٹھلائے ہوئے ہے
نہ سمجھو کہ حاضر نہیں حق تعالیٰ — یہ عالم[3] خود آنکھیں جھکائے ہوئے ہے

---

[1] مطلب یہ ہے کہ زندگی اسی کا نام ہے کہ آدمی زندگی کے ہر رنگ کو دیکھے۔ ہر دور میں سے گذرے اور عمر طبیعی کو پہنچ کر ختم ہو جائے۔

[2] زر افشانی سے مراد ہے دولت مندی و فیاضی۔ یعنی عزت ایسے ہی لوگوں کی ہوتی ہے جو دولت مند بھی ہوں اور فیاض بھی۔

[3] مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ موجود تو ہر شے میں اور ہر جگہ ہے۔ مگر اس کی ذات ایسی باعظمت و بارعب ہے کہ کسی کو اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی بھی جرأت نہیں ہوتی۔ یعنی خود عظمت و جلال خداوندی ہی نے اس کو مخلوق کی نظروں سے چھپا رکھا ہے۔

عالم و عاقل

عالم نے یہاں قبول[1] و ردّ کو جانا ۔۔۔ دیکھا دنیا کو نیک[2] بد کو جانا
عاقل وہ ہے کہ جس نے ہنگام عمل ۔۔۔ اپنی قوت[3] کو اپنی حد کو جانا

واقفیت کی آخری منزل

ہر اک سے سنا نیا فسانا ہم نے ۔۔۔ دیکھا دنیا میں اک زمانا ہم نے
اول یہ تھا کہ واقفیت پہ تھا ناز ۔۔۔ آخر یہ کھلا کہ کچھ نہ[4] جانا ہم نے

وہی غفلتیں اور وہی کلیلیں

یہ ہو سکا تو پھر کیا، وہ ہو گیا تو پھر کیا ۔۔۔ خواب لحد میں انساں جب سو[5] گیا تو پھر کیا

---

[1] یعنی یہ معلوم کیا کہ کونسی چیزیں قابل قبول یعنی اختیار کر لینے کے قابل ہیں اور کون سی "ردّ" کر دینے یعنی چھوڑنے کے قابل۔
[2] یعنی جن چیزوں کے متعلق علم سے یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ اختیار کی جا سکتی ہیں ان کے اختیار کرنے اور ان سے کام لینے میں بھی یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ آیا ہماری قوت اور ہمارے حالات بھی ان کو اختیار کرنے کی اجازت دیتے ہیں یا نہیں اور اجازت دیتے ہیں تو کس حد تک۔ یہ فیصلہ کرنا عقل کا کام ہے اور عالم و عاقل میں فرق یہی ہے کہ عالم کو صرف علم ہوتا ہے اور عاقل اسی علم سے کام لینے کے آداب اور موقع و محل کو بھی سمجھتا ہے۔ [3] یعنی جب تک آدمی کا علم ناقص اور عقل خام رہتی ہے وہ اپنی معلومات اور واقفیت پر فخر کیا کرتا ہے لیکن دنیا کے نشیب و فراز کو دیکھنے اور نئے نئے تجربے حاصل کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اُسے کچھ نہیں آتا۔ (باقی ۱۲۰ پر)

پھر غفلتیں وہی ہیں اور پھر وہی کلیلیں (اچھل کود) — مجلس میں آ کے دم بھر وہ رو گیا تو پھر کیا

الفاظ سے غلط فہمی

غلط فہمی بہت ہے عالمِ الفاظ میں اکبرؔ — بڑی مایوسیوں کے ساتھ اکثر کام چلتا ہے
یہ روشن ہے کہ پروانہ ہے اسکا عاشقِ صادق — مگر کہتی ہے خلقت شمع سے پروانہ جلتا ہے[۱]

ظاہر اور باطن

دنیا کی طمع میں وہ پھسلا اور میں نے خدا کا نام لیا[۲] — لغزش سے وہ خاک آلود ہوا اور صبر نے مجھ کو تھام لیا
ظاہر کا ادب ملحوظ رہا، باطن بھی مگر محفوظ رہا — واعظ سے اِدھر اک بات سُنی، ساقی سے اُدھر اک جام لیا[۳]

(صفحہ ۱۱۹ کا بقیہ فٹ نوٹ) یعنی جتنا انسان کا علم اور تجربہ بڑھتا ہے اتنا ہی اس کو اپنی لاعلمی اور بے عقلی کا سبق حاصل ہوتا ہے اور سب سے بڑا درجہ اسی عالم کا ہوتا ہے جو بہت کچھ جاننے پر بھی یہ جانتا ہے کہ میں کچھ نہیں جانتا۔

[۱] مطلب یہ ہے کہ الفاظ سے کبھی بڑی غلط فہمیاں ہو جاتی ہیں اور ان کا مطلب کچھ کا کچھ نکال لیا جاتا ہے۔ مثلاً پروانہ کے شمع پر قربان ہونے کو شمع سے پروانہ کا جلنا کہا جاتا ہے۔ جس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ پروانہ شمع سے جلتا یعنی یا اُس سے حسد رکھتا ہے۔ حالانکہ سب جانتے ہیں کہ پروانہ شمع کا عاشق ہوتا ہے اس کا جلنا سوزِ عشق کا ہوتا ہے نہ کہ سوزِ حسد کا۔ [۲] یعنی دنیاوی حرص و ہوس میں انسان راہِ مستقیم سے پھسل جاتا اور ذلیل و رسوا ہو جاتا ہے مگر جو لوگ صبر و قناعت سے کام لیتے اور خدا پر بھروسہ رکھتے ہیں دنیاوی حرص و طمع سے ان کے پائے استقامت میں لغزش نہیں پیدا ہوتی۔ [۳] اس شعر کا پہلے شعر سے کوئی معنوی تعلق نہیں ہے۔ اس میں طنزاً ان لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جو ظاہر میں تو شرعی ادب و آداب کو ملحوظ رکھتے ہیں لیکن درپردہ حظِّ نفس کے لئے معصیتوں کا بھی ارتکاب کر لیتے ہیں۔

ماضی و حال

زبانِ خلق صرفِ داستاں بود — کہ در دنیا چنیں بود و چناں بود
نگاہم بود محوِ جلوۂ حال[1] — بطبعم آنچہ آمد میہماں بود

حُسن کی طاقت سے مجبوری

شوقِ شہرت بھی بُرا زر کی بُری چاہ بھی ہے — نفرت انگیز نظر میں ہوسِ جاہ بھی ہے
ہاں مگر حسنِ بتانِ زہرہ جبیں آفتِ دیں — اس سے مجبور تو یہ بندۂ درگاہ[2] بھی ہے

بے ہوش اور منہ سیئے ہوئے باہوش

اکثر وہی بزرگ ہیں جو ہیں پئے ہوئے — باہوش کم ہیں اُن کے بھی منہ ہیں سئے ہوئے

---

[1] مطلب یہ ہے کہ لوگوں کی زبان پر عام طور پر گذشتہ زمانہ کے قصے رہتے ہیں کہ دنیا میں یہ ہوا تھا اور وہ ہوا تھا مگر میری آنکھیں تو حال کے جلوؤں یعنی اُن واقعات کے دیکھنے میں محو ہیں جو اِس وقت گزر رہے ہیں۔ واقعات حاضرہ کے علاوہ کسی پچھلی بات کا خیال دل میں آتا بھی ہے تو وہ ایک عارضی میہمان کی حیثیت سے آتا ہے یعنی اُس کا کوئی مستقل اثر دل قبول نہیں کرتا۔

[2] بندۂ درگاہ سے مراد غالباً وہ حضرات صوفیہ ہیں جو حسن پرستی کا بھی ذوق رکھتے ہیں۔ حضرت اکبر کہتے ہیں کہ ان کو دوسرے مذہبی پیشواؤں کی طرح جاہ و شہرت کی ہوس تو نہیں ہوتی اور نہ زر و مال کی محبت لیکن دل ربا مہ جبینوں اور حسین نازنینوں کے حسن پر وہ بھی مفتون و مدہوش ہو جاتے ہیں۔ پھر نہ انہیں ننگ و ناموس کی پرواہ ہوتی ہے اور نہ زہد و تقویٰ کی۔ بقول حضرت حافظ شیرازیؒ ؎

شیخِ کنعاں خرقۂ رہن خانۂ خمار داشت

کیوں اپنے آپ کو ہے پریشاں کئے ہوئے　　ہرگز کوئی کھے گا نہ اس انجمن[١] کا راز

اچھا رنگ ڈھنگ

بجائے جو نگاہ کو وہی رنگ اچھا　　لائے جو راہ پر وہی ڈھنگ اچھا
قرآن و نماز سے اگر دل نہ ہو گرم (اثر پذیر)　　ہنگامۂ رقص[٢] (چہل پہل، مجلس آرائی، ناچ) و مطرب (گانے والا) و چنگ (ایک باجہ) اچھا

چشم بینا کا قحط

غفلت ہی میں آدمی کو ڈوبا پایا　　کیا تم سے کہیں جہاں کو کیسا پایا
آنکھیں تو بے شمار دیکھیں لیکن　　کم تھیں بخدا کہ جن کو بینا (صاحب بصیرت انجام بیں) پایا

---

[١] اس انجمن سے مراد یہ کائنات یعنی ساری مخلوقات خدا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ کائنات اور اس کی خلقت اور اس کے خالق کا راز معلوم کرنے کے درپے ہیں وہ اس بے سود کوشش میں فضول پریشان ہوتے ہیں۔ یہ راز جن خدا رسیدہ بزرگوں کو معلوم ہے ان میں سے اکثر بیہوش یعنی عرفان الٰہی کی شراب سے مست و بے خود ہیں۔ اور بعض جو ہوش میں ہیں اُن کے منہ سی دیئے گئے ہیں۔ یعنی اُن کی زبان سے افشائے راز کی قدرت سلب کرلی گئی ہے۔ بقول حضرت سعدیؒ کے۔ ع کاں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد

[٢] مطلب یہ ہے کہ انسان کے دل میں خدا کی محبت و اطاعت کا جذبہ پیدا ہونے کی ضرورت ہے۔ سب سے بہتر ذریعہ تو اس کے لئے تلاوت قرآن اور پابندی نماز ہی کا ہے لیکن اگر ان ذریعوں سے کسی کا دل خدا کی طرف متوجہ نہیں ہوتا اور ناچ و رنگ اور گانے بجانے ہی سے اس کے اندر ذوق عبادت الٰہی پیدا ہوتا ہے تو پھر اسے حصول مطلوب کا ذریعہ رقص و سرود ہی کو بنانا چاہیئے۔ چنانچہ رہ و رسم پارسائی کی مشکلات سے گھبرا کر کبھی عراقیؒ جیسے طالبان خدا کو بھی رہ قلندری کا کوئی رہنما ڈھونڈنے کی ضرورت پیش آئی ہے۔ جیسا کہ اُن کے اس مشہور شعر سے ظاہر ہے۔

صنمارہ قلندر سزد ار بمن نمائی　　کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

کامل کم اہلِ ارشاد بہت

کامل کم ہیں اور اہلِ ارشاد (رہنما، مرشد) بہت — ساحر[1] کم ہیں اور ملیں گے صیّاد (شکاری) بہت
ہے بزمِ سخن کا حال یہ اے اکبر — شاعر کم ہیں مگر ہیں استاد[2] بہت

انقلاباتِ جہاں

انقلابِ جہاں کو دیکھ لیا — حُبِّ دنیا سے قلب پاک ہوا
کل کلی کھل کے ہو گئی تھی پھول — پھول کمھلا کے آج خاک ہوا[3]

سب خدا کے محتاج ہیں

کہنے کو تو شاہ سب ہیں مہاراج ہیں سب — مالک دولت کے۔ مالکِ تاج ہیں سب
لیکن کھولو جو چشمِ تحقیق اکبرؔ! — بے بس ہیں سب، خدا کے محتاج ہیں سب

---

[1] ساحر یعنی جادو گر، سے یہاں مراد ایسے لوگ ہیں جو اپنے علمی یا روحانی کمال سے دلوں کو مسخر اور اپنا تابع کر سکتے ہوں۔ اور صیاد شکاری کو کہتے ہیں خاص کر چڑیمار یا مچھلی کا شکار کرنے والوں کو جو چال بازی اور دھوکے سے پرندوں اور جانوروں کو پکڑتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایسے صاحب کمال تو بہت کم ہیں جو اپنی قابلیت اور کمال سے لوگوں کو اپنا معتقد اور گرویدہ کر سکیں۔ زیادہ تر ایسے ہیں جنہوں نے مکاری و ریاکاری کا جال بچھا رکھا ہے اور چال بازی سے لوگوں کو اپنا معتقد بنا رہے ہیں۔ [2] استاد سے مراد شاعری کے وہ استاد ہیں جو خود تو شعر کہہ نہیں سکتے مگر دوسروں کے شعروں پر اصلاح دیا کرتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ کامل اور قابل لوگ تو کم ہوتے جا رہے ہیں۔ خود نما، ریاکار اور دھوکہ باز بڑھ رہے ہیں [3] یعنی جس دنیا کی یہ کیفیت ہو کہ اس میں دن رات عروج و زوال اور پیدائش و موت کے انقلابات آتے رہتے ہوں۔ جہاں پھول آج کھلتا اور کل مرجھا جاتا ہو اس سے دل لگانا کسی اہلِ بصیرت اور عقلمند کا کام نہیں ہے۔

راحت، عزت اور آدمیت

گر جیب میں زر نہیں تو راحت بھی نہیں
بازو میں سکت نہیں تو عزت بھی نہیں
گر علم نہیں تو زور و زر ہے بے کار
مذہب جو نہیں تو آدمیت[۱] بھی نہیں

غفلت اور عبرت

راحت کا سماں بندھا تو غفلت بھی ہوئی
حسرت کا کھنچا جو سین[۲] عبرت بھی ہوئی
دنیا میں جسے جو پیش آیا اکبرؔ
بس اس کے مطابق اس کی حالت بھی ہوئی

زینت دنیا

یہ زینتِ دنیا ہے کہ مٹی پہ ہے پنّی[۳]
بچوں کے سوا کون ہوا اس کا متمنی
گوشِ شنوا ہو تو سنو اس کے ترانے
اس بزم میں اکبرؔ سا نہیں کوئی مغنی

---

۱ یعنی بغیر پیروی و پابندی مذہب کے انسان میں وہ خصائل حسنہ پیدا نہیں ہو سکتے جو انسانیت اور آدمیت یعنی اشرف مخلوق ہونے کا امتیاز قائم رکھنے کے لیے ضروری ہیں ۲ سین لفظ انگریزی Scene بمعنی منظر۔ تماشا۔ تھیٹر کا پردہ۔ اس شعر میں مفہوم ہے اس آیہ کریمہ کا وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِيْضٍ ○ جب آدمی پر ہم اپنا فضل و کرم کرتے ہیں تو وہ ہماری طرف سے منہ پھیر لیتا اور ہم سے کنارہ کش ہو جاتا ہے (یعنی غفلت برتتا ہے) اور جب اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو لمبی چوڑی دعائیں کرنے لگتا ہے۔ یعنی عبرت و نصیحت حاصل کر کے پھر ہماری طرف متوجہ ہو جاتا ہے ۳ یعنی زینت دنیا کی مثال ایسی ہے جیسے کسی نے مٹی پر پنّی (یعنی چمکدار، روپہلا یا سنہرا کاغذ) چڑھا دی ہو۔ ہے تو وہ مٹی ہی مگر جس طرح بچوں کو مٹی کے چمکدار کھلونوں سے بڑی دلچسپی ہوتی ہے اسی طرح ناسمجھ لوگ دنیا کی حقیقت کو بھول کر اس کے زیب و زینت یعنی عیش و راحت پر فریفتہ ہو جاتے ہیں۔

دورِ فنا میں ہر بات برائے نام

منظور اے دل ہماری عرضی ہوگی — اس وقت کہ جب خدا کی مرضی ہوگی
اس دورِ فنا میں ہوگی لیکن جو بات — وہ صرف برائے نام و فرضی ہوگی

ہنسنے والے ہنستے ہیں رونے والا کوئی نہیں

آمادہ حریف ہیں ستانے کے لئے — اور دکھ میں شریک ہونے والا نہ رہا
زندہ ہوں تو مجھ پہ ہنسنے والے ہیں بہت — مرجاؤں تو کوئی رونے والا نہ رہا

(یعنی دشمن — مذاق اڑانے والے)

قدرشناس کی تحسین اور ناقدر شناس کی شاگردی

مبتلا ہو کر اگر دنیا کو پہچانا تو کیا — دام میں پھنس کر اگر صیاد کو جانا تو کیا
تھوڑی سی تحسین[۲] بھی اہلِ نظر کی ہی بہت — بے بصیرت نے اگر استاد بھی مانا تو کیا

(تحسین: داد، تعریف — اہلِ نظر: سمجھدار — بے بصیرت: نا سمجھ)

---

[۱] مطلب یہ ہے کہ اگر انسان کبھی دنیاوی راحت یا عزت کے لئے خدا سے دعا کرے گا۔ اگر خدا کی مرضی ہوئی تو وہ دعا قبول تو ہو جائے گی لیکن راحت یا عزت جو اس دارِ فنا میں حاصل ہوگی وہ محض نام کی اور فرضی راحت و عزت ہوگی۔ حقیقی راحت و عزت تو آخرت ہی میں ملے گی۔ [۲] اس شعر کا پہلے شعر سے کوئی معنوی تعلق نہیں ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ جو شخص کسی کام میں اپنی کوئی قابلیت دکھاتا ہے۔ اگر کوئی اس قابلیت کو سمجھنے والا کام کی تھوڑی سی بھی تعریف کر دے تو اس سے کام کرنے والے کا دل بڑھتا ہے لیکن اگر کوئی ایسا شخص جو قابلیت کو سمجھ ہی نہ سکتا ہو وہ قابلیت ظاہر کرنے والے کو اپنا استاد بھی بنا لے تو اس سے کام کرنے والے کو کوئی خوشی نہیں ہوتی۔

چمن دہر کو گلے کا ہار نہ بناؤ

حضور عرض کروں میں جو ناگوار نہ ہو   وہ یہ کہ موت ہی بہتر ہے جب قرار نہ ہو
الٰہی یہ چمن دہر مجھ پہ بار نہ ہو   دکھا دے دور سے رنگت گلے کا ہار[1] نہ ہو

عزم و عمل کی کمزوری

وقت میں ہیں سب، اک کا منہ تکتا ہے   خاموش کوئی ہے، اور کوئی بکتا ہے
ہونا[2] ہی چاہیئے، کہوں یہ کیونکر   لیکن یہ کہوں گا، ہو[3] بھی سکتا ہے

نہ دل پر میرا بس ہے نہ زبان پر

حالت پہلی سی کہاں اب میری ہے   حیرت انگیز داستاں میری ہے
سینہ[4] میرا ہے دل نہیں ہے میرا   میری نہیں بات گو زباں میری ہے

---

[1] گلے کا ہار ہو جانا محاورہ ہے یعنی پیچھا نہ چھوڑنا۔ وبال جان ہو جانا وغیرہ۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا کی نعمتوں کو جو مجھے حاصل ہوں میں گلے کا ہار بنانا نہیں چاہتا کہ وہ میرے لئے وبال جان ہو جائیں۔ اس لئے خدا مجھے ایسی توفیق دے کہ میں صرف دنیاوی ضرورتیں ان سے پوری کروں۔ دل میں اُن کی محبت نہ رکھوں۔

[2] و [3] مطلب یہ ہے کہ ہمارا عزم و عمل اور قوت فیصلہ اس قدر کمزور ہو گئی ہے کہ ہم خاموش رہ کر یا فضول بحثیں کر کے صرف یہ سوچا کرتے ہیں کہ جو بات ہم چاہتے ہیں کہ ہو وہ ہو بھی سکتی ہے یا نہیں۔ یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ وہی ہونا چاہیئے کہ جو ہم چاہتے ہیں۔ [4] یعنی دل میرے سینہ میں ضرور ہے مگر میرے اختیار میں نہیں ہے۔ اس لئے کہ جو جذبات میں اس میں پیدا کرنا چاہتا ہوں وہ اس میں پیدا نہیں ہوتے (باقی صفحہ ۱۲۷ پر)

گرم جوشی ختم سودائے خود فروشی رخصت

باقی نہیں رہی وہ دنیا سے گرم جوشی ۔۔۔ اب میں ہوں اور عزلت اور عالم خموشی
اپنے ہی دل کے ہاتھ اب بک گیا ہوں[1] اکبر ۔۔۔ سر میں نہیں رہا وہ سودائے خود فروشی

آبادی پر طاعون کا ٹیکس

افسوس[2] ہے بدگمان کی آزادی پر ۔۔۔ خالق کبھی خوش نہ ہو گا بربادی پر
طاعون سے کیوں ہے اتنی وحشت اکبر ۔۔۔ یہ تو اک ٹکس ہے اس آبادی پر

تغیرات و انقلابات

جہاں[3] نے ساز بدلا ساز نے نغموں کی گت بدلی ۔۔۔ گتوں نے رنگ بدلا رنگ نے یاروں کی مت بدلی
فلک نے دور بدلا دور نے انسان کو بدلا ۔۔۔ گئے ہم تم بدل قانون بدلا سلطنت بدلی

(صفحہ ۱۲۶ کا بقیہ فٹ نوٹ) یعنی دل دماغ کا ساتھ نہیں دیتا اور زبان بھی اگرچہ ہے تو میری لیکن جو بات میں کہنا چاہتا ہوں وہ زبان سے نہیں نکلتی بلکہ وقت اور حالات کی مصلحتوں کو دیکھ کر ایسی باتیں زبان سے کہنی پڑتی ہیں جو میرے دل و دماغ کی ترجمانی نہیں کرتیں۔

[1] یعنی جب تک دل زندہ تھا اور اس میں گرم جوشی موجود تھی۔ اسی وقت تک تو دنیا کی خارجی دلچسپیوں میں اپنے آپ کو محو کر دینے کا مجھے جنون ہوا کرتا تھا لیکن اب ایسی افسردگی طاری ہوئی ہے کہ میں کسی اور کے ہاتھ بکنے کی بجائے خود اپنے دل کے ہاتھ بک گیا ہوں یعنی سوائے اپنے دل کے مجھے اور کسی چیز سے دلبستگی و دلچسپی نہیں ہوتی۔ [2] غالباً ان اشعار میں مصنف نے عام لوگوں کے اس خیال کو کہ طاعون (گلٹی کی وبائی بیماری) ایک عذاب الٰہی ہے اور اس کے نازل کرنے سے خدا کا مقصد اپنی مخلوق کو تباہ کرنا ہے۔ غلط فہمی اور بدگمانی سے تعبیر کیا ہے اور یہ کہہ کر اس خیال کی تردید کی ہے کہ کوئی بنانے والا اپنی بنائی ہوئی چیز کے مٹانے اور برباد کرنے سے خوش نہیں ہوتا۔ طاعون کے متعلق یہ دلچسپ شاعرانہ بات کہی ہے کہ وہ آبادی پر ایک ٹیکس ہے۔ یعنی جس طرح بقدر نصاب مال و زر رکھنے پر اس کا کچھ حصہ
(باقی ۱۲۸ پر)

(اس صفحہ کا نوٹ نمبر ۳ صفحہ ۱۲۸ پر ہے)

سچی دوستی قابل قدر

جب لطف وکرم سے پیش آئے محبوب — اگلے رنجوں کو بھول جانا اچھا
جب مثل نسیم وہ گلے سے لگ جائے — مانند کلی[1] کے پھول جانا اچھا

(بہار کی خوشگوار ہوا)

کہتا ہے کم آل جس کو حاصل ہی کمال

دل ہو جو وسیع اور روشن ہو خیال — ہر رنگ دکھائے تجھ کو خالق کا جمال
ساری دنیا ہے اس کو پیاری اکبر — کہتا ہے کم آل[2] جس کو حاصل ہی کمال

لغزش بے ارادہ

خواہان علم نہ طالب گنج ہیں ہم — بے کینہ و بے ریا و بے رنج ہیں ہم

(صفحہ ۱۲۷ کا بقیہ فٹ نوٹ) خدا کے نام پر دینا پڑتا ہے۔ جس کو زکوٰۃ یا مال کا خدائی ٹیکس کہتے ہیں۔ اسی طرح جب آبادی زیادہ بڑھ جاتی ہے تو اس میں سے بھی خدا اپنا حصہ طاعون وغیرہ وبائی بیماریوں کے ذریعہ سے لیتا ہے۔ عقلی توجیہہ اس شاعرانہ خیال کی یہ کی جا سکتی ہے کہ وبائی بیماریاں عموماً آبادی کی کثرت کی وجہ سے ہوتی ہیں یعنی جب کسی شہر یا قصبہ وغیرہ کی آبادی اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ اس میں لوگ حفظان صحت کی پابندی کر کے نہیں رہ سکتے تو وہ طاعون وغیرہ وبائی بیماریوں کا شکار ہوتے ہیں۔ (صفحہ ۱۲۷ کا فٹ نوٹ نمبر ۲) یعنی زمانہ کا رنگ بدلا تو ہمارے اطوار و اخلاق بھی بدل گئے اور ہماری عقل و فہم بھی۔ اور جب ہمارے اندر یہ اہم تبدیلیاں ہو گئیں تو ضروری تھا کہ قانون اور حکومت بھی بدلے۔

[1] یعنی جس طرح بہار کی خوشگوار ہوا کے ہم آغوش ہونے سے کلیاں کھل کھل کر پھول ہو جاتی ہیں [2] کم آل۔ دو انگریزی لفظ ہیں all come جن کے معنی ہیں آ جاؤ سب۔ مطلب یہ ہے کہ حصول کمال سے جن کے دل وسیع اور باطنی آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں ان کو اچھے اور برے ہر رنگ میں خدا ہی کا جلوہ نظر آتا ہے اور وہ موافق و مخالف سب سے یہی کہتے ہیں کہ تم سب ہمارے ہو آؤ اور ہم سے ملو۔ کسی سے پرہیز اور نفرت نہیں کرتے۔ کمال میں کم آل کی لفظی ہی نہیں بلکہ روحانی تجنیس کا پیدا کرنا ایک اکبری کمال ہے۔

لغزش ہو کوئی تو دوست فرمائیں معاف
آزاد ہیں مست ہیں سخن سنج ہیں ہم

چرب زبانی اور خلوص

انوار اس دور کے دل فیروز ہیں کم
گویا کہ شبیں بہت ہیں اور روز ہیں کم

ہر چرب[1] زباں نہیں ہے شمعِ اخلاص
جلنے والے بہت ہیں دل سوز ہیں کم

نیکی اور بدی زندگی اور موت

بارہا[2] جوشِ جنوں میں مجھے آیا ہے خیال
کہ تماشا (کھیل) ہے یہ ہنگامۂ نیکی و بدی

نظر[3] عشق میں ہے زندگی و موت اکبرؔ
اضطراب (بے قراری) نفس (سانس) چند و سکونِ ابدی (دائمی)

رازِ دہر نہ کھلنے کا شکوہ

ہنگامۂ شکر و شکوہ دنیا میں ہے گرم
لیکن مرے دل سے یہ صدا آتی ہے

---

[1] چرب زبان یعنی چکنی چپڑی باتیں کرنے والا۔ یعنی زبان سے ہمدردی کرنے والے تو اس زمانہ میں سب ہیں جو یہ دکھلاتے ہیں کہ وہ تمہاری تکلیف اور مصیبت سے کڑھ رہے اور جل رہے ہیں۔ مگر حقیقتاً ان میں دل سوزی یعنی تمہارے ساتھ دلی ہمدردی نہیں ہوتی۔

[2] یعنی جب عقل نیکی اور بدی کی حقیقت اور اس کی غرض و غایت کو نہیں سمجھ سکی تو دماغ پر مایوسی سے ایک جنونی کیفیت طاری ہوئی اور یہ خیال پیدا ہوا کہ نہ نیکی کوئی حقیقت رکھتی ہے اور نہ بدی بلکہ قدرت نے دنیا کے سٹیج پر نیکی اور بدی کے غیر حقیقی مناظر کا ایک تماشا دکھایا ہے۔

[3] یعنی جب زندگی اور موت کو ایک عاشقِ حق کی نظر سے دیکھا اور یہ کیفیت ہم پر طاری ہوئی کہ زندگی نے ہم کو ہماری اصل یعنی ذات باری سے چھڑا دیا اور دور کر دیا ہے اور موت پھر ہم کو اسی سے واصل کرنے والی ہے جس کے ہم ہیں ہمارے دل میں اپنی اصل یعنی ذات باری سے واصل ہونے کا ایک اضطراب پیدا ہو جاتا ہے۔ اور فانی زندگی کے جو دن بھی گزرتے ہیں اسی اضطراب میں گزرتے ہیں کہ کب موت آئے اور کب سکونِ ابدی حاصل ہو۔

کھلتا[1] نہیں رازِ دہر شکوہ ہے تو یہ　　اور شکر یہ ہے کہ موت آجاتی ہے

کام کا علم

انسان[2] یا تو بہت سے دلوں کو ملا سکے　　یا کوئی شے مفید خلائق بنا سکے
ہم تو اسی کو علم سمجھتے ہیں کام کا　　پڑھنے کو مستعد ہیں جو کوئی پڑھا سکے

تقدیر اور اتفاقات

لکچر[3] سے نہ ہے نہ کچھ خیالات سے ہے　　تہذیب سے ہے نہ ترک عادات سے ہے
اکبر بخدا یہ کامیابی ساری　　تقدیر سے اور اتفاقات سے ہے

---

[1] یعنی یوں تو دنیا میں سب کو تکلیفیں بھی پہنچتی ہیں اور راحتیں بھی۔ لوگ خدا کی شکایتیں بھی کرتے ہیں اور خدا کا شکر بھی۔ لیکن مجھے تو سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ رازِ دہر نہیں کھلتا یعنی یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس دنیا کے پیدا کرنے سے خدا کا مقصد کیا ہے اور سب سے زیادہ قابل شکر یعنی دل کو راحت پہنچانے والی چیز مجھے یہ معلوم ہوتی ہے کہ انسان زندگی کی الجھنوں میں مبتلا رہنے کے لئے ہمیشہ زندہ نہیں رہتا اور مرنے کے بعد اس کو سکون ابدی حاصل ہو جاتا ہے۔ [2] یعنی کام کا علم یا تو وہ ہے جس پر عمل کر کے انسان میں ایسے خصائل حسنہ پیدا ہوں کہ لوگ اس کے گرویدہ ہو جائیں یا جس کے ذریعے سے وہ کوئی ایجاد و اختراع کر سکے جس سے خلق خدا کو فائدہ پہنچے۔

[3] یعنی جن قومی اور سیاسی کامیابیوں کو ہم اپنی کامیابی سمجھ رہے ہیں وہ نہ تو جلسوں اور لکچروں کا نتیجہ ہیں اور نہ پرانی عادات چھوڑ کر نئی تہذیب اختیار کرنے کا۔ بلکہ یہ کامیابیاں محض اس وجہ سے ہو رہی ہیں کہ دنیا کے سیاسی حالات اتفاق سے ہمارے موافق ہو گئے ہیں یعنی ان کامیابیوں میں تدبیر کو نہیں بلکہ تقدیر کو دخل ہے۔

سلطان مسلمان اور شیطان

تھا سر میں کمال وہ تو سلطان بنا — تھا دل میں جمال وہ مسلمان بنا
لذت طلبی سے نفس رندی پہ جھکا — تھا پیٹ بہت حریص شیطان بنا

(رندی: مذہب سے آزادی)

منزل عدم کیلئے ریل بیکار

دنیا سے میل کی ضرورت ہی نہیں — مجھ کو اس کھیل کی ضرورت ہی نہیں
درپیش ہے منزل عدم اے اکبر — اس راہ میں ریل کی ضرورت ہی نہیں

(منزل عدم: یعنی موت) (ریل: یعنی مادی ذرائع سفر)

موت کے بعد صرف اعمال کام آتے ہیں

کہا احباب نے یہ دفن کے وقت — کہ ہم کیونکر وہاں کا حال جانیں
لحد تک آپ کی تعظیم کردی — اب آگے آپ کے اعمال جانیں

(لحد: قبر)

انسان، ایمان اور مسلمان

اُلفت اور ادب نہیں تو انسان نہیں — بے صبر و سکوں جو ہو تو ایمان نہیں[۱]

---

[۱] یعنی اگر انسان بے صبر اور غیر مطمئن ہو تو سمجھنا چاہیئے کہ اس کا ایمان کمزور ہے۔ یعنی اُسے خدا پر پورا بھروسہ اور پورا یقین نہیں ہے۔

جو غیر خدا کو مانتا ہو قادر ‏ اکبرؔ بخدا کہ وہ مسلمان نہیں[1]

شوقِ عزت، ذوقِ زینت، زورِ ملّت

جب علم گیا تو شوقِ عزت معدوم ‏ دولت رخصت تو ذوقِ زینت معدوم
مسجد[2] سے یہ آئی گوشِ اکبرؔ میں صدا ‏ مذہب جو ہٹا تو زورِ ملت معدوم

دل، ایمان اور عاقبت

خبر[3] دل کی مِس (نا کتخدا لڑکی) دل خواہ جانے ‏ خبر ایماں کی حبِ جاہ جانے
رہی اب عاقبت کی بحث اکبرؔ ‏ تو اس کا حال تو (بجز) اللہ جانے

خلق خدا سے ملو مگر خدا کے واسطے

کچھ شک نہیں کہ خلق سے ملنا ضرور ہے ‏ جو اس سے اختلاف کرے حق (یعنی راہِ حق) سے دور ہے

---

[1] اس لئے کہ خدا کی یکتائی اور اس کی قدرت کاملہ پر ایمان ہی پر اسلام کی ساری بنیاد ہے اور خدا کے سوا کسی اور کو قادر ماننے کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی قدرت کاملہ پر یقین نہیں ہے۔

[2] مسجد سے صدا آنے کا مطلب یہ ہے کہ مسجدوں کے آباد اور غیر آباد ہونے سے پتہ چل جاتا ہے کہ مذہب سے وابستگی بڑھ رہی ہے یا گھٹ رہی ہے اور باجماعت نمازوں کی صفوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملت اسلام میں کتنا زور اور کتنی قوت ہے۔

[3] مطلب یہ ہے کہ آج کل کے مسلمانوں کے دلوں میں تو خدا کی محبت کی بجائے لڑکیوں کا عشق بسا ہوا ہے اور ایمان کی کیفیت یہ ہے کہ خدا پر بھروسہ رکھنے کی بجائے دنیاوی اقتدار اور عزت ہی کو سب کچھ سمجھ رہے ہیں۔ ایسے مسلمانوں کا انجام کیا ہونا ہے اس کا حال اللہ ہی کو معلوم ہے۔

لیکنؔ خدا کے واسطے خلقِ خدا سے مل | سمجھے گا اس کو وہ جو اہلِ شعور ہے

دل بہ یار - دست بہ کار

دولت بھی ہے فلسفہ بھی ہے جاہ بھی ہے | لطفِ حسنِ بتانِ دل خواہ بھی ہے
سبؔ سے قطع نظر ہے مشکل لیکن | اتنا سمجھے رہو کہ اللہ بھی ہے

بڑے عمل کا مقصد بھی بڑا ہونا چاہیئے

اعلیٰ مقصود چاہیئے پیشِ نظر | کوشش تری گو ہو لطفِ ذاتی کیلئے
فرہادؔ پہاڑ پر عمل کرتا تھا | شیریں کے لئے کہ ناشپاتی کیلئے

فرہاد کی محبوبہ — مشہور پھل

لہ مطلب یہ ہے کہ رہبانیت یعنی ترک دنیا تو اسلام کا شعار نہیں ہے۔ اس لئے مسلمانوں کا خلق خدا سے تعلق رکھنا ضروری ہے۔ لیکن سچا اور باشعور مسلمان وہ ہے جو خلق خدا سے تعلق تو رکھتا ہے مگر اپنی ذاتی اغراض کے لئے نہیں بلکہ خدا کے لئے یعنی حسب ارشاد حدیث قدسی اَلْخَلْقُ عِیَالُ اللّٰہِ خلق خدا کو خدا کا کنبہ سمجھتا اور اس کنبہ کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے دوسرے افراد خاندانی کے متعلق اپنی مذہبی معاشری ذمہ داریوں کو پورا کرتا ہے۔

سلہ یعنی دنیا میں رہ کر عام انسانوں کے لئے یہ تو بہت مشکل ہے کہ وہ دولت و عزت۔ عشق و محبت اور علوم عقلیہ سے کوئی تعلق نہ رکھیں لیکن ان چیزوں سے تعلق رکھنے کے ساتھ اگر اس کا بھی احساس اور یقین رہے کہ خدا بھی ہے۔ یعنی دنیا کی دلچسپیوں میں خدا کو نہ بھلا دیا جائے تو یہ بھی بہت غنیمت ہے۔

سلہ فرہاد جس کو کوہکن بھی کہتے ہیں فارس کا ایک سنگ تراش تھا جو بادشاہ خسرو پرویز کی ملکہ شیریں پر عاشق ہو گیا تھا۔ اور شیریں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اگر بذات خود ایک پہاڑ کو کھود کر اس میں سے شیریں کے محل میں نہر نکال لائے تو شیریں اس کی ہو جائے گی۔ فرہاد نے شیریں کی محبت میں پہاڑ کھود کر نہر تو نکال دی مگر شیریں کے حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوا۔ اور سر میں تیشہ مار کر مر گیا۔ مطلب اشعار کا یہ ہے کہ انسان اپنے لطف ذاتی کے لئے بھی اگر کسی بڑے کام میں ہاتھ ڈالے تو اس کا مقصد بھی کام کی اہمیت کے لحاظ سے اہم اور بڑا ہونا چاہیئے۔ فرہاد نے جو پہاڑ میں سے نہر کے کھودنے میں اتنی تکلیفیں اور مصیبتیں برداشت کیں وہ کسی معمولی مقصد مثلاً ناشپاتی حاصل کرنے کیلئے نہیں کیں بلکہ ایک ایسے مقصد کے لئے تھیں جو فرہاد کو

اپنی جان سے زیادہ عزیز تھا اور جس کے حاصل نہ ہونے پر اس نے زندہ رہنے کی ضرورت نہیں سمجھی

خدا کا دفتر دیکھو

دینی پہلو کو اے برادر دیکھو — کانٹوں[1] سے ہو محترز گل تر دیکھو
(پرہیز کرنے والے)

نظم اکبر ہوئی ہے منقوشِ قلوب — آنکھیں ہوں اگر خدا[2] کا دفتر دیکھو

جو میسر ہے اس پر قانع رہو

اب اُن[3] قصوں کا کیا حاصل اب ان باتوں کا کیا رونا

یہی مرضی خدا کی تھی یہی قسمت میں تھا ہونا

کہاں کی دولت و ثروت کہاں کی عزت و حشمت

میسر ہیں تجھے دو روٹیاں بس گھر کا لے کو تا
(نصیب) (شکر سے زندگی گزار یعنی عمرہ)

---

[1] یعنی جو لوگ حوادث دنیاوی کو دینی نظر سے دیکھتے ہیں ان کی نظریں حوادث کے کانٹوں یعنی تکلیف دہ پہلوؤں پر نہیں پڑتیں بلکہ وہ حوادث کے گل تر یعنی روح کو شاد و مسرور کرنے والے پہلوؤں کو دیکھتے ہیں۔ یعنی ان کی نظر انجام و عاقبت کی راحتوں پر رہتی ہے۔

[2] خدا کا دفتر سے مراد، مناظر قدرت خدا ہیں۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ اکبر کی نصیحتیں تو تم نے دل میں بٹھالیں مگر اُن سے معرفت الٰہی کا فائدہ حاصل کرنے کے لئے تمہیں اپنی بصیرت یعنی دل کی آنکھوں سے مناظر قدرت کا بھی مطالعہ کرنا چاہئیے۔ بقول عارف شیراز ؎

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار — ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

[3] یعنی یہ رونا رونے سے اب کیا نتیجہ کہ ہم اور ہمارے بزرگ ایسے تھے ویسے تھے۔ قسمت کا لکھا پورا ہوا۔ خدا کی مرضی پر شاکر رہنا چاہئیے۔

خود سوچنے اور سمجھنے کی ضرورت

اوروں کی کہی ہوئی جو دوہراتے ہیں ۔۔۔ وہ فونوگراف[1] کی طرح گاتے ہیں
خود سوچ کے حسب حال مضمون نکال ۔۔۔ انسان یونہی ترقیاں پاتے ہیں

اصلی طاقت و عزت اور صحیح تعلیم و تربیت

طاقت[2] وہ ہے با اثر جو سلطانی ہے ۔۔۔ اس جا ہے چمک جہاں زر افشانی ہے
تعلیم وہ خوب ہے جو سکھلائے ہنر ۔۔۔ اچھی ہے وہ تربیت جو روحانی ہے

(سخاوت۔ فیاضی)

فنا اور بقا کا راز

غنچہ رہتا ہے دل گرفتہ پہلے ۔۔۔ رنگ چمن فنا سے گھبراتا ہے
کہتی ہے نسیم آکے راز فطرت ۔۔۔ سنتے ہی پیام دوست کھل جاتا ہے

---

[1] فونوگراف Phono Graph ایسے آلۂ صوتی کو کہتے ہیں جس میں آوازیں خود بخود منقوش ہو جاتی اور پھر ویسی ہی اس میں سنی جا سکتی ہیں۔ یعنی جو لوگ اپنی عقل اور سمجھ سے کام نہیں لیتے بلکہ جو دوسرے لکھ گئے یا کہہ گئے ہیں۔ وہی لکھتے یا کہتے ہیں ان کی مثال فونوگراف کی سی ہے جس میں سے وہی آوازیں نکلتی ہیں جو اس میں بھری جاتی ہیں۔ خود اس کی کوئی مستقل آواز نہیں ہوتی۔ ایسی میکانکی تقلید سے قومیں ترقی نہیں کیا کرتیں۔ قومی ترقی کے لیے ضرورت اس کی ہے کہ اقتضائے زمانہ کے مطابق دماغ سے بھی کام لیا جائے اور مشین کی طرح دوسروں کے اشاروں پر نہ چلا جائے۔ [2] یعنی طاقت وہی کارگر ہوتی ہے جس کی پشت پر حکومت ہو اور ناموری و شہرت ان ہی کی زیادہ ہوتی ہے جو فیاض اور سخی ہوں۔ اچھی تعلیم وہ ہے جس سے کوئی ہنر یعنی کوئی مفید کام کرنے کی

(باقی ۱۳۶ پر)

(اس صفحہ کا نوٹ نمبر ۳ صفحہ ۱۳۶ پر دیکھیے)

دنیائے دنی کی محبّت

دنیائے[1] دنی محلّ آفات بھی ہے　　فکرِ روزی مخلّ اوقات بھی ہے
طرّہ پھر اس پہ یہ کہ مرنا بھی ضرور　　جیتا رہے آدمی تو اک بات بھی ہے

بتخا پھران سب
باتوں سے بڑھ کر

(صفحہ ١٣٥ کا بقیہ فٹ نوٹ) علمی قابلیت حاصل ہو اور اچھی تربیت یہ ہے کہ روح کی تربیت ہو یعنی انسان اخلاق حسنہ سے متصف اور اس کے دل میں خشیت الٰہی پیدا ہو۔

(صفحہ ١٣٥ کا نوٹ نمبر٣) اس شعر میں استعارتاً فنا اور بقا کے راز کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یعنی جو بھی نئی ہستی دنیا میں آتی ہے وہ فلک کے جھونکوں کے ڈر سے غنچہ (کلی) کی طرح اپنی تمام خلقی قابلیتوں اور خوبیوں کو اپنے اندر چھپائے رکھتی ہے اور گویا یہ سوچ کر دل گرفتہ و مغموم رہتی ہے کہ ؎

کہ کشید دامنِ فطرتت کہ بقید مادو من آمدی　　تو بہار عالمِ دیگری زکجا بہ ایں چمن آمدی

(تیرے دامنِ فطرت کو کس نے کھینچا کہ تو ہم اور میں کے پنجرے میں پھنس گئی۔ تو تو کسی اور ہی چمن کی بہار ہے۔ چمن دنیا میں کیسے پہنچ گئی)، لیکن جب اسے اس دنیا کی ہوا لگتی ہے تو جس طرح نسیم سے غنچہ کھل کر پھول ہو جاتا ہے اسی طرح نو آمدہ ہستی کی وجودی قابلیتیں بھی نمایاں ہو جاتی ہیں گویا کوئی اس نو آمدہ ہستی کو اس راز فطرت سے آگاہ کر دیتا ہے کہ یہ عالم فانی بھی در اصل عالم باقی یعنی تجلیات ذاتِ حق ہی کا ایک ظہور ہے اور خلق کی پیدائش سے مقصود ذاتِ خالق ہی کی صفاتی نمایش ہے۔ حسب مضمون حدیث قدسی كُنْتُ كَنْزاً مَخْفِيًّا فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ۔ میں (یعنی ذات باری عز اسمہٗ) ایک چھپا ہوا خزانہ تھا۔ میں نے چاہا کہ معروف و مشہور ہوں تو میں نے مخلوقات (کائنات) کو پیدا کر دیا۔ یعنی جو وجود اس جہان میں فانی شکلوں کے روپ میں ظاہر اور نمایاں ہوا ہے وہ وہی کنز مخفی ہے جو بے صورتی کے پردہ میں چھپا ہوا تھا اور جو صورتوں کے فنا ہونے کے بعد پھر اسی بے صورتی سے واصل ہو جائے گا۔ بقول حضرت مولوی معنویؒ ؎ صورت از بے صورتی آمد بروں　　باز شد انّا الیہ راجعوں۔ یعنی صورت بے صورتی سے برآمد ہوئی اور پھر اسی بے صورتی کی طرف لوٹ گئی۔ لہٰ حاصل ان اشعار کا یہ ہے کہ یہ ذلیل دنیا دل لگانے کی جگہ نہیں ہے۔

حدِّ ادب

سُنئے حکمت جو مری گفتار میں ہے — اک حدِّ ادب ہر ایک سرکار میں ہے
پروانے نے شمع سے لپٹنا چاہا[1] — پہلے تھا نور میں اب نار میں ہے

باپ دادا پر بے جا فخر

ڈارون[2] صاحب حقیقت سے نہایت دور تھے — میں[3] نہ مانوں گا کہ مورث آپ کے لنگور تھے
اپنی حالت کے مطابق چاہیئے طرزِ عمل — اس سے کیا ہوتا ہے دادا قیصر[4] و فغفور تھے
اس تقرب پر ہمیں کچھ فخر کا موقع نہیں — پاس گو بیٹھے تھے لیکن اُنکے دل[5] سے دور تھے

---

[1] مطلب یہ ہے کہ ملت میں فرق مراتب اور ادب و آداب کے اصول کا لحاظ رکھنا ضروری ہے جو لوگ اپنی حیثیت و قابلیت کی حدود سے آگے بڑھ کر بڑے لوگوں کی ہمسری کی ہوس کرتے ہیں وہ نقصان اٹھاتے ہیں۔ دیکھو پروانہ اس عشق و وارفتگی کے باوجود جو اس کو شمع کے ساتھ ہے جب اپنی حیثیت کو بھول کر شمع سے لپٹنا چاہتا یعنی حدِ ادب سے تجاوز کرتا ہے تو شمع کی روشنی میں وصل کی جو لذت اسے حاصل ہوتی ہے اس سے بھی محروم ہوجاتا اور جل کر خاک ہوجاتا ہے [2] ڈارون صاحب کا پورا نام چارلس رابرٹ ڈارون Charles Robert Darwin) پیدائش ۱۸۰۹ء وفات ۱۸۸۲ء) یہ انگلستان کے مشہور محقق سائنس داں تھے۔ جنہوں نے ارتقاء انواع کا نظریہ نکالا تھا اور یہ دعویٰ کیا تھا کہ کوئی نوع اپنی زمی شکل میں عدم سے وجود میں نہیں آئی ہے۔ بلکہ وہ کسی پہلے سے موجود اور اتقاریافتہ نوع کی جدید ارتقائی شکل ہے۔ اسی نظریہ کے ماتحت ڈارون صاحب کی تحقیق میں نوعِ انسانی بھی کسی ارتقایافتہ نوعِ حیوانی یعنی لنگور یا بندر کے ارتقاء سے پیدا ہوئی ہے۔ [3] ڈارون کا نظریہ ارتقاء انواع اسلامی عقیدہ کے خلاف ہے۔ اس لئے حضرت اکبر یہ تسلیم نہیں کرتے کہ اُن کے مورث لنگور تھے یعنی یہ کہ لنگور کے نوعی ارتقاء سے انسان نمودار ہوا ہے [4] قیصر لقب تھا شاہان روما کا اور فغفور لقب تھا شاہان ملک چین کا۔ یہاں ان دونوں لفظوں سے بادشاہ اور حکمران مراد ہیں [5] یعنی ایسی عزت اور آؤ بھگت قابلِ فخر نہیں ہے کہ بڑے آدمی اپنے پاس تو بٹھائیں مگر دل میں نفرت رکھیں۔

شکوہ اور شکایت کا وقت ختم

نہ حرفِ شکوہ بہتر ہے نہ اچھا اشک بہنا
ہمارے دن یہی ہیں رنج سہنا اور چپ رہنا
خدا کے واسطے اکبرؔ کوئی ذکر اور ہی چھیڑو
سنی[1] باتوں کا کیا سننا کہی باتوں کا کیا کہنا

ذہنی انقلاب نے بیجابات کو بجا کر دیا

عجب حیرت آگیں (عجب خیز) ہے یہ انقلاب
ہماری سمجھ کیا سے کیا ہوگئی
سمجھتے تھے سب جس کو بیجا (نامناسب، غلط) صریح (صاف طور)
وہی بات بالکل[2] بجا (مناسب، ٹھیک) ہوگئی

شراب اور خودکشی

قوم سے مے (شراب) کی سفارش کیا کروں
نیک کو شیطان کر دیتی ہے یہ
ایک جوہر (خاصیت) ہے فقط اس میں مفید
خودکشی[3] آسان کر دیتی ہے یہ

---

[1] یعنی حکومت سے جو تکلیفیں پہنچ رہی ہیں وہ سب کو معلوم ہیں اس لئے ان کے متعلق داویلا کرنے اور بارہا ان کے کہنے اور سننے سے کیا نتیجہ۔ [2] یعنی ذہنی انقلاب سے ہماری عقلوں نے بھی ایسا پلٹا کھایا ہے کہ جو باتیں ہم کو صریحاً بے جا اور نامناسب معلوم ہوا کرتی تھیں ان ہی کو اب ہم بالکل بجا اور ٹھیک سمجھ رہے ہیں۔

[3] خودکشی آسان کر دینے، کے دو مطلب نکل سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ شراب کے نشہ میں مدہوش ہو کر انسان آسانی سے خودکشی کر لیتا ہے۔ دوسرے یہ کہ زیادتی شراب سے انسان عمر طبعی تک پہنچنے سے بہت پہلے ہی مرجاتا ہے اور اس کو یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ شراب کا عادی ہو کر گویا خودکشی کر رہا ہے۔

ابتدا سے رنجیدگی انتہا سے بے حسی

اس دورِ فلک میں کوئی کیا دیکھے گا   جو کچھ دکھلائے گا خدا، دیکھے گا
رنجیدہ ہے جس نے ابتدا دیکھی ہے   بے حس[1] ہو گا جو انتہا دیکھے گا

"ہم" کا تصور چھوڑ دو "میں" پر نظر رکھو

اثر سب پر پڑا ہے انقلابِ رنگِ عالم کا   نہ اب ہے طعن کا موقع نہ ہے اب وقت ماتم کا
بسر کر با قناعت زندگانی کنجِ عزلت (گوشۂ تنہائی) میں   نظر[2] "میں" پر مناسب ہے تصور چھوڑ دے "ہم" کا

فضول بحث اور دنیا پسندی

فضول بحث میں وقت اپنا کھو نہیں سکتا   زیادہ اب شبِ غفلت میں سو نہیں سکتا
گذر گیا دلِ دنیا پسند دنیا سے   اُس[3] انجمن کا میں اب رکن ہو نہیں سکتا

---

[1] مطلب یہ ہے کہ جس بُرے انجام کی ابتدا یا آغاز دیکھ کر ہمیں اس وقت رنج ہو رہا ہے اُس انجام کے پیش آنے تک رنج کا یہ احساس بھی جاتا رہے گا۔ اور ہمیں یہ خیال بھی نہیں ہو گا کہ ہم کس انجام کو پہنچ گئے۔

[2] یعنی ہم میں کوئی ایسا نہیں ہے جس پر انقلابِ زمانہ کا بُرا اثر نہ پڑا ہو۔ اس لئے اب دوسروں کی حالت پر افسوس کرنا یا اُن پر طعن کرنا بیکار ہے۔ اب ہم سب کو "ہم" کا یعنی ابنائے قوم کی تباہ حالی کا خیال چھوڑ کر "میں" کا خیال یعنی اپنی ذاتی اصلاح و بہبود کی فکر کرنی چاہیئے۔

[3] یعنی دنیا کی تلخ کامیوں کا مجھے کافی تجربہ ہو چکا ہے اور غفلت کی نیند سے میری آنکھ کھل گئی ہے۔ اب میں دنیا سے تعلق پیدا نہیں کر سکتا۔

مغرب مغرب ہے، اور مشرق مشرق

بل کھاؤ ہزار خواہ چھانٹو منطق | نیچر[1] تو ہے اپنی اصل ہی پر عاشق
لکھی ہے صحیح اک فرنگی نے یہ بات | مغرب[2] مغرب ہے اور مشرق مشرق

جب تھے تو خوب تھے

ممدوح[3] شرق و غرب و شمال و جنوب تھے | تعریف تھی ہنر کی بَری از عیوب تھے
اب کچھ نہیں تو کیا کہیں تم سے کہ کیسے ہیں | ہاں اس میں شک نہیں ہے کہ جب تھے تو خوب تھے

افسانہ گو خود افسانہ ہو گیا

اک بحرِ بے کراں ہے حوادث کا سلسلہ | الجھا جو ذہن اس میں وہ دیوانہ ہو گیا
اُٹھے مورخین زمانہ میں گم ہوئے | افسانہ گو جو تھا وہ خود افسانہ ہو گیا

(حوادث: انقلابات، واقعات — مورخین: بلا انتہا، لا تعداد)

---

[1] یعنی یہ قدرت کا قاعدہ اور قانون ہے کہ ہر چیز اپنی اصلیت سے محبت رکھتی اور اسی کی طرف کھنچ کر جاتی ہے اَلْجِنْسُ یَمِیْلُ اِلَی الْجِنْسِ یعنی جنس اپنی جنس کی طرف جھکتی ہے۔ کسی فارسی شاعر کا مشہور مصرع ہے۔ "کند ہم جنس با ہم جنس پرواز"۔ [2] یہ قول کسی مغربی ہی کا ہے کہ "مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب"۔ یعنی مغرب کے باشندوں کی فطرت کبھی مشرقی نہیں ہو سکتی۔ اور نہ مشرقی باشندوں کی فطرت مغربی۔ اس لئے مشرقیوں کی یہ کوشش کہ وہ مغربی رنگ میں رنگ جائیں، صرف ظاہری تقلیدی رنگ میں تو ممکن ہے کہ کامیاب ہو جائے۔ مگر ان میں اہل مغرب کی سی طبعی اور اخلاقی خصوصیات اور اہل مغرب کے دلوں میں ان کی وہ محبت اور قدر پیدا نہیں ہو سکتی جس کے وہ آرزومند ہیں۔ [3] یعنی ساری دنیا ہماری

قابلیتوں اور خوبیوں کی مداح تھی [4] مطلب یہ ہے کہ دنیا میں اتنے بے شمار اور ایسے ایسے عظیم انقلابات آئے ہیں اور آتے رہتے ہیں کہ باقی صفحہ پر

عمرِ امروز و فردا ہی میں کٹتی ہے

صبح کو کہتا ہوں دیکھوں کس طرح کٹتا ہے دن
شام اسے ایسا بھلا دیتی ہے گویا کچھ نہ تھا

عمر یونہی کٹ گئی آخر ہوا معلوم یہ
عرصۂ ہستی ١؎ بجز امروز و فردا کچھ نہ تھا
یعنی زمانۂ زندگی — آج — کل

لبِ خنداں زیادہ، دیدۂ تر کم

جینے والوں کی ترنگیں ہیں فقط پیش نظر
مرنے والوں کے مصائب کی بہت کم ہے خبر

یہی باعث ہے کہ غفلت میں پھنسی ہے دنیا
لبِ خنداں ٢؎ کی ہے کثرت عوضِ دیدۂ تر
چشم پرنم

نگاہوں میں زمانے، زبانوں پر فسانے

خبر کیا انقلابِ دہر کی ان نوجوانوں کو
نئی حالت نئی آنکھیں نئے ان کے ترانے ہیں

بڑی عمریں ہیں جن کی اُن سے سنیے حالِ دنیا کا
نگاہوں میں ٣؎ زمانے ہیں زبانوں پر فسانے ہیں

(صفحہ ١٤٠ کا بقیہ فٹ نوٹ) کہ جو مؤرخ اُن کی چھان بین اور اُن کے اسباب و نتائج کی تحقیق کے چکر میں پڑتا ہے خود اس کی عقل چکر کھانے لگتی ہے اور وہ اپنی اس فلسفیانہ تاریخی تحقیقات کی بھول بھلیاں میں ایسا چکراتا ہے کہ اس میں گم ہو کر رہ جاتا ہے اور اس کی تاریخ نگاری کا قدم آگے نہیں بڑھتا۔ بجائے اس کے کہ وہ دوسروں کے حالات و واقعات کے فسانے سنائے خود فسانہ بن جاتا ہے۔ یعنی اس کی تاریخ نگاری کا واقعہ بھی ایک اہم تاریخی واقعہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے ١؎ اس مضمون کا ایک اور مشہور اردو شعر ہے ؎

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر یونہی تمام ہوتی ہے

غور سے دیکھا جائے تو زندگی اسی کا نام ہے کہ صبح کو انسان شام کی سوچے اور شام کو آنے والی صبح کی اور آج اور کل کہتے ہی کہتے عمر ساری ختم ہو جائے ٢؎ یعنی رونے والے کم ہیں اور ہنسنے والے زیادہ بمصداق ارشادِ خداوندی ولیضحکوا قلیلا ولیبکوا کثیرا یعنی (مرنے کے بعد کے حالات اور قیامت کا ذکر سن کر) تم ہنستے ہو اور تم کو رونا نہیں آتا۔ ٣؎ یعنی بڑی عمر کے لوگوں نے ہر قسم کا زمانہ اور بہت سے انقلابات دیکھے ہیں اور ان زمانوں اور انقلابوں کے ایسے حالات وہ سناتے رہتے ہیں جن کی نوجوانوں کو خبر نہیں۔ نوجوانوں کے سامنے صرف نیا زمانہ اور نئے حالات ہیں اور ان ہی کے ترنگ میں وہ گا رہے ہیں۔

صبر و قناعت کا حظ

گوشۂ صبر و قناعت ہی میں اب محظوظ ہوں
شہد[1] سے محروم ہوں تو زہر سے محفوظ ہوں

گو حریفوں کی نظر میں رنگ پھیکا ہو مرا
نرگس[2] مستانۂ ساقی کا میں ملحوظ ہوں

ہمسر، ہمہ — مجازاً چشم معشوق — یعنی منظور نظر

ہم کچھ بھی نہیں ہیں

ہر خاک[3] کے پتلے کو ابھارا ہے فلک نے
یکتائی کے اظہار میں مست اہل زمیں ہیں

ہر اک کو یہ دعوےٰ ہے کہ ہم بھی ہیں کوئی چیز
اور ہم کو ہے یہ ناز کہ ہم کچھ بھی نہیں ہیں

یعنی انسان

بجز ترقی میں خود ہی بہے جاتے ہیں

طعنے سنتے ہیں مگر شعر کہے جاتے ہیں
داد کے شوق میں بیداد سہے جاتے ہیں

تعریف واہ داہ — ظلم تکلیف

[1] یعنی صبر و قناعت اور مرنجاں مرنج کی زندگی میں اگرچہ وہ شہد کی سی شیرینی یعنی وہ لذت و عزت نہیں ہے جس کے ہوس پرست دل دادہ ہوتے ہیں۔ لیکن ایسی زندگی زہر آلود بھی نہیں ہوتی یعنی اس زندگی میں ان تکالیف و مصائب اور بد انجامی کے خطرات کا اندیشہ بھی نہیں ہوتا جس کا ہوس پرستوں کو ہر وقت سامنا رہتا ہے۔

[2] ساقی سے مراد ہے مطلوب حقیقی حق تعالیٰ۔ مطلب یہ ہے کہ صبر و قناعت کی زندگی بسر کرنے سے دنیا والوں کی نظر میں گو میری کوئی عزت و وقعت نہ ہو۔ لیکن میرا محبوب و مالک حقیقی میرے اس پر بھروسہ رکھنے کے اس رویہ کو نظر پسندیدگی سے دیکھتا اور اچھا سمجھتا ہے۔

[3] پتلا۔ یعنی مجسمہ۔ مورت۔ انسان حسب ارشاد باری تعالیٰ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِیْنٍ (اس ذات پاک نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے) خاک کا پتلا یا خاک کی مورت ہے۔ مگر خاکی ہونے کے باوجود اس کے دماغ میں یہ غرور سمایا ہوا ہے کہ جو کچھ ہوں میں ہی ہوں۔ میرا ہمسر کوئی نہیں ہے۔ لیکن جن انسانوں نے اپنی ہستی کی حقیقت کو سمجھ لیا ہے۔ ان کو اپنے کچھ ہونے پر نہیں بلکہ کچھ نہ ہونے پر ناز ہے۔ یعنی ان کو اس پر فخر ہے کہ ان کی ہستی ان کی نہیں بلکہ خدا کی ہے اور جس نے اپنی ہستی کو خدا کی ہستی میں فنا کر دیا ہے وہ جانتا ہے کہ ساری خدائی اسی کی ہے۔ ؎ چوں از وگشتی ہمہ چیز از تو گشت

رزولیوشن۱؎ ہی کے تختے کا سہارا ہے فقط — بحرِ تدبیرِ ترقی میں بہے جاتے ہیں
ملک الموت۲؎ نے نوٹس نہ دیا تھا افسوس — اس کمیٹی کے بہت کام رہے جاتے ہیں
آپ۳؎ فرماتے ہیں ہو لہر ترقی کی تو آ — موجیں کہتی ہیں کہ یہ خود ہی بہے جاتے ہیں

(موت کا فرشتہ — اطلاع — امنگ)

فلسفہ پرست بدھو

گرجا میں لاٹ صاحب مسجد میں شیخ صاحب — بدھو۴؎ فلاسوفی کے کمرے میں ٹر رہے ہیں
خاک اُڑ رہی ہے گھر میں ڈیوڑھی میں غل مچا ہے — مذہب کے ہیں مخالف بھائی سے لڑ رہے ہیں

۱؎ یعنی سوائے جلسوں میں رزولیوشن (تجویزیں) پاس کر دینے کے کوئی تعمیری کام ایسا نہیں کرتے جو قومی ترقی کے لئے مفید ہو۔ ترقی کی آرزو کے دریا میں کود تو پڑے ہیں مگر چونکہ سوائے رزولیوشنوں کے تختہ کے اور کوئی سہارا نہیں ہے۔ اس لئے ترقی کی رو میں بہے جا رہے ہیں اور راہ سے بے راہ ہو رہے ہیں۔

۲؎ آج کل انجمنوں اور کمیٹیوں کے کام اسی طرح ہوتے ہیں کہ جلسہ میں جو کارروائیاں ہونے والی ہوتی ہیں اُن کی اطلاع ممبروں کو پہلے سے دیدی جاتی ہے مگر موت کے آنے کی کسی کو خبر نہیں ہوتی اور کوئی اس کی پہلے سے تیاری نہیں کرتا۔ اس لئے بہت سے دنیاوی اور اخروی کام ادھورے اور ناتمام رہ جاتے ہیں۔ ۳؎ یعنی آج کل کے ترقی پسند جس کو ترقی سمجھ کر اپنا ر قوم کو اس کی دعوت دے رہے ہیں وہ ترقی درحقیقت ترقی نہیں ہے بلکہ نئی تہذیب اور نئے زمانہ کی غلامی ہے۔ کہ زمانے کی موجیں جس طرف بہیں بہائے لئے جا رہی ہیں اسی طرف ہم بہے چلے جا رہے ہیں اور مرکز قومیت سے وابستہ نہیں رہے۔ ۴؎ بدھو سے مراد نئی روشنی کی اندھا دھند تقلید کرنے والے ناعاقبت اندیش مسلمان ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ بڑے بڑے انگریز حکام تو گرجاؤں میں اور سچے مسلمان مسجدوں میں خدا کی عبادت کر کے اپنی عاقبت سنوار رہے ہیں لیکن نئی روشنی کے ناعاقبت اندیش مسلمان فلسفہ کی ادھوری تعلیم حاصل کر کے مذہب کو خیرباد کہہ رہے ہیں اور اپنی دنیا اور عاقبت کو خراب کر رہے ہیں۔ ان کے گھروں کے اندر تو ادبار و فلاکت چھائی ہوئی ہے مگر بھائیوں بھائیوں میں مذہب کی موافقت و مخالفت پر لڑائیاں ہو رہی ہیں۔

تعلّی اور خاکساری

تعلّیوں[۱] (ڈینگوں شیخیوں) کو طبیعت رجکٹ (ناپسند) کرتی ہے
جو دل شکستہ (منکسرالمزاج) ہیں اُن کو سلکٹ (پسند) کرتی ہے

ملا ہوں خاک میں خود اس سبب سے میری نظر
گرا کے قصر (محل) بگولے ارکٹ (تعمیر) کرتی ہے

عارف کو بیہوشی زیبا، عاقل کو خاموشی زیبا

آزادی کا شور مبارک
یہ تقلیدی زور مبارک

میرا تو ہے اور ہی منظر
میں تو یہ کہتا ہوں اکبر

عارف[۲] کو بے ہوشی زیبا
عاقل کو خاموشی زیبا

زبان زندہ دل مردہ

بے کار جگر ہے مضمحل (کمزور) گردہ ہے
جس دوست کو دیکھئے وہ افسردہ ہے

---

[۱] رجکٹ لفظ انگریزی Reject بمعنی ناپسند کرنا۔ مسترد کرنا۔ سلیکٹ لفظ انگریزی Select بمعنی پسند کرنا انتخاب کرنا۔ ارکٹ ERECT بمعنی تعمیر کرنا۔ بنانا۔ بگولہ یعنی ہوا کا وہ حلقہ جو غبار آلود ہوا کے ایک ہی جگہ چکّر لگانے سے بنتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی ہستی کو خاک میں ملا دینے اور ہیچ سمجھنے سے میری طبیعت شیخی بازوں سے متنفر ہو گئی اور منکسر المزاجوں کو پسند کرنے لگی ہے اور محلوں کے خواب دیکھنے کی بجائے میرے ذہن میں بگولوں کے تصوّرات آتے ہیں کہ مٹی کے ذرّوں کو کس طرح ہوا چکّر میں ڈال دیتی ہے۔ [۲] یعنی مغربی تقلید میں ہر طرف آزادی کا شور مچ رہا ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ شور وغل کرنے والے نہ تو آشنایانِ حقیقت ہیں البتہ صاحبِ عقل وفہم۔ کیونکہ حقیقت آشنا تو اپنے ہوش میں نہیں رہتے۔ اور عقلمندوں کا شیوہ خاموشی ہوتا ہے۔

گو نبض[1] زباں سے زندگی ہے ظاہر — دل کو جو ٹٹولیے تو وہ مردہ ہے

خضر نہیں غول بیابانی

خضر سمجھے ہو جسے غول[2] بیابانی ہے — غلط اہیے کے جنگل میں تھکا مارے گا
جاں ستانی میں نہ چھوڑے گا دقیقہ باقی — دل ستانی کے لیے لافِ وفا مارے گا

(جان لینا — کسر — دل لینا — ڈینگ)

اقبال مندی کا طاعت کی طرف میلان

ہوئے جمع بہر دعا و سلام — کلیسا میں انگریز عالی مقام
کہا میں نے ہوں میں تو مسجد سے دور — تو گرجا میں اُن کا ہے کیوں اژدہام

(جمگھٹا)

---

[1] یہ آج کل کے نوجوانوں کی جسمانی حالت کا نقشہ ہے کہ معاشری بے اعتدالیوں کی وجہ سے اُن کے جگر بے کار۔ گردے کمزور۔ دل مردہ اور امنگیں افسردہ ہیں۔ ساری علامتیں مردوں کی سی ہیں البتہ اُن کی زبانیں چل رہی ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کچھ زندگی ان میں باقی ہے۔ نبض رگ کی حرکت کو کہتے ہیں۔ جس سے زندگی کا پتہ چلتا ہے۔

[2] غول بیابانی۔ جن اور دیو جو جنگلوں اور بیابانوں میں رہتے ہیں۔ اشارہ قوم کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ جن لیڈروں کو اپنا خضر یعنی خواجہ خضر جیسا مقدس رہنما سمجھ رہے ہیں وہ دراصل رہنما نہیں بلکہ جنگلی جن ہیں جو انسانیت اور مقاصد تخلیق انسانی سے نا آشنا ہیں وہ اپنی خیر خواہی و وفاشعاری کی ڈینگیں مار کر نوجوانوں کے دلوں کو لبھانے کی تو بہت کوشش کر رہے گئے لیکن غلط توقعات میں مبتلا کر کے اور غلط رستوں پر چلا کر اُن کو تھکا ماریں گے اور اُن کی روح کے فنا کر دینے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھیں گے۔

خدا جانے آئی کدھر سے صدا — کہ اے بے خرد (بے وقوف) مسلم نا تمام (ادھورے مسلمان)

کسے را کہ اقبال باشد غلام[1]

بود میل خاطر (میلان طبع) بہ طاعت مدام

اپنے مٹنے کا بتدریج تماشا دیکھو

کیوں جلا رکھا ہے اس دور نے پیری میں مجھے — ستم غیر ضروری یہ فلک کا دیکھو

کہا گردوں (آسمان) نے نہیں غیر ضروری یہ بات — [2]اپنے مٹنے کا بتدریج (آہستہ آہستہ، درجہ بدرجہ) تماشا دیکھو

صیاد کے لئے طرز نو کے جال

بانیٔ طرز نو (موجد نئی تہذیب کے) کے طریقوں کے متبع (پیرو) — خلق نکو (نیک خصائل) نہ چھوڑیں گے اولاد کے لئے

---

[1] یہ شعر حضرت سعدی شیرازیؒ کا ہے جس کا ترجمہ ہے:۔ جس کسی کا اقبال (خوش نصیبی) غلام ہوتا ہے اس کا میلان طبع ہمیشہ خدا کی فرمانبرداری کی طرف ہوتا ہے۔ مطلب اشعار کا یہ ہے کہ عالی مرتبہ انگریزوں کا گرجا میں عبادت کرنا اُن کی اقبال مندی کی نشانی ہے۔ اور مسلمانوں کا مسجدوں سے دور رہنا اُن کی بدنصیبی اور ادبار کی علامت۔

[2] یعنی اس بڑھاپے میں جو تکلیفیں اور مصیبتیں سہنے کے لئے قدرت نے مجھے زندہ رکھا ہے اس کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنے تدریجی زوال کے ساتھ اپنی قوم کے بھی آہستہ آہستہ فنا ہونے کا تماشا دیکھ لوں اور مجھے یہ اندازہ ہو جائے کہ جس طرح افراد کی زندگیاں آہستہ آہستہ ختم ہوا کرتی ہیں اسی طرح اقوام کو بھی بتدریج فنا کی منزلوں میں سے گزرنا پڑتا ہے۔

البتہ ان بناؤں سے جن کے لئے ہے سعی ۔۔۔ کچھ جال چھوڑ جائیں گے صیاد کیلئے
(بنیادیں) (کوشش) (شکاری)

بنگلہ نشینوں سے قدر شناسی کی امید نہیں

چھائی جاتی ہے مرے دل پہ اداسی کیسی ۔۔۔ ہم نشیں ہے یہ بڑی بات ذرا سی کیسی
(افسردگی)
کیا ملے داد سخن بنگلہ نشینوں سے مجھے ۔۔۔ وہ سمجھتے ہی نہیں قدر شناسی کیسی
(تحسین۔ تعریف) (دل دادگان تہذیب جدید)

سرِ ازل اور بادہ فروش

حیرت سے مجھ کو دیکھ کے اس خضر نے پڑھا ۔۔۔ حافظ کا اک یہ شعر جو معنی کو تھا مفید
(حافظ شیرازی)

"سرِ ازل کہ عارفِ سالک بہ کس نہ گفت

در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید"

؎۱ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ نئی تہذیب کی بنیادیں رکھ رہے ہیں اور نئی روشنی کے طریقوں پر قوم کو چلا رہے ہیں وہ اپنی اولاد کو خصائل حسنہ کے ورثہ سے تو محروم کر ہی جائیں گے۔ لیکن کچھ خصلتیں ایسی بھی اُن میں پیدا کر جائیں گے جو مغربی شکاریوں کے واسطے اُن کے پھنسانے کے لئے جال کا کام دیں گی۔

؎۲ یعنی دل دادگان تہذیب مغرب جو مشرقی شاعری کے محاسن کو سمجھ بھی نہیں سکتے اُن سے قدر دانی اشعار و شعراء کی کیا امید کی جا سکتی ہے اور قومی کیرکٹر کی یہ تبدیلی کوئی معمولی نہیں بلکہ بڑی بات ہے جس سے قوم کی آئندہ فلاح و بہبود کی طرف سے مایوسی پیدا ہوتی ہے۔

؎۳ ترجمہ شعر حافظ "جو راز ازل عارف سالک نے بھی کسی سے نہیں کہا۔ مجھے حیرت ہے کہ بادہ فروش (شراب بیچنے والے) نے کہاں سے سن لیا۔" عارف سالک سے مراد وہ خدا رسیدہ بزرگ ہیں جو راہ طریقت یعنی سلوک کے ذریعہ سے مرتبۂ عرفان حق تک پہنچے ہیں اور بادہ فروش سے مراد دار فتگان عشق الٰہی ہیں جن کا مذہب رندی و عشق اور مسلک جوش و خروش ہے۔ عارفان سالک آداب طریقت و شریعت کے

(باقی صفحہ پر)

نہ وہ نعرہ نہ وہ نالہ

کہاں اب وہ دل اور وہ طبع بلند — جنہیں کہہ گئے سعدیؒ ارجمند
بیک[1] نعرہ کوہے زجا بر کنند — بیک نالہ ملکے بہم بر زنند

غم اور خوشی کا سچا احساس

اصلی غم وشادی کا نہیں قوم میں اب حس — چشمِ عقلا سے یہ بصیرت ہوئی مفقود
پابند ہیں اُس کے رزولیوشن جو ہوا پاس — ہنسنے[2] پہ بھی تیار ہیں رونے کو بھی موجود

(صفحہ ۱۴۷ کا بقیہ فٹ نوٹ) ملحوظ رکھنے کی وجہ سے رازہائے حقیقت کو زبان پر نہیں لاتے بلکہ ان رازوں کے انکشاف میں بھی وہ حدودِ شریعت سے آگے بڑھنے کی جرأت نہیں کرتے برخلاف عارفان رندمشرب کے کہ وہ وارفتگیٔ عشق میں سب کچھ جان لیتے اور سب کچھ کہہ ڈالتے ہیں۔ اکبر فرماتے ہیں کہ کبھی کبھی میں بھی اپنے اشعار میں ایسے عارفانہ رموز بیان کر دیتا ہوں جن پر عارفان سالک وہادیان راہِ طریقت کو تعجب ہوتا ہے کہ جو رازہائے حقیقت ہماری زبان سے آج تک نہیں نکلے وہ اکبر کو کہاں سے معلوم ہو گئے۔

[1] شیخ سعدیؒ کے اُس شعر کا ترجمہ یہ ہے وہ ایک نعرہ سے پہاڑ کو اپنی جگہ سے اکھیڑ کر پھینک دیتے ہیں۔ اور اپنے ایک نالہ سے ملک کو زیر وزبر کر دیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایسے صاحب دل اور بلند حوصلہ لوگ اب کہاں ہیں۔ [2] یعنی قوم کی جن باتوں پر ہم کو رونا یا خوش ہونا چاہیئے اُن کی طرف تو ہمارے دلوں کو توجہ نہیں ہوتی۔ جلسہ کی تجویزوں ہی کے ہم پابند ہیں۔ اور جو تقریریں ان تجویزوں کے منظور کرانے کے لئے کی جاتی ہیں ان پر رونے کے لئے بھی تیار رہتے ہیں اور ہنسنے کے لئے بھی یعنی اپنے احساسات حقیقت اور فہم وبصیرت سے کام نہیں لیتے۔ محض دوسروں کی رایوں اور باتوں سے متاثر ہوتے ہیں۔

بے ثباتیِ دنیا سے عبرت

بہ چشمش بو و رنگ بے ثباتی ... بہار آورد و گلہا را، خزاں برد
بہ عبرت زندگانی کرد اکبر[1] ... براں زاد و براں بود و براں مُرد

شخصی اور قومی زندگی

یہ لیڈر خود ہی مضطر ہیں مگر عشوے[2] دکھاتے ہیں ... جو شخصی زندگی ہے اس کو یہ قومی بناتے ہیں
بجز الفاظ کے حسّادی[3] نہیں کُلّی[4] یہ کام اُن کے ... یہ خود جزئی ہیں لیکن گیت کُلّی کا سناتے ہیں

زورِ قلم کے سوا اور کوئی طاقت نہیں

کفر[5] پر غصہ نہیں فطرت پہ کچھ حیرت نہیں ... خانہ جنگی کے سوا بس اور کچھ رغبت نہیں
قوتِ انشا کو آخر صرف کرنا ہے ضرور ... کیا کریں زورِ قلم ہے اور کچھ طاقت نہیں

---

[1] ترجمہ، توضیح:- اکبر کی نظروں میں ہمیشہ ناپائیداری دنیا کا یہ منظر رہا کہ بہار نے پھولوں کو پیدا کیا اور خزاں نے اُن کو فنا کر دیا۔ ایسی ہی عبرت آموزی کی زندگی اکبر نے بسر کی۔ عبرت ہی کی فضا میں پیدا ہوا۔ اسی فضا میں جیا اور اسی فضا میں مرا۔ [2] ... [3] ... [4] کلّی اور جزئی علم منطق کی اصطلاحیں ہیں۔ کلّی اس مفہوم کو کہتے ہیں جس کے ایک ذات سے زیادہ پر صادق ہونے کو عقل جائز رکھے جیسے انسان پہاڑ وغیرہ۔ اور جزئی وہ مفہوم ہے جس کا صرف ایک ہی ذات پر اطلاق ہو سکے جیسے زید، بکر وغیرہ۔ یہاں کلّی سے مراد قوم ہے اور جزئی سے مراد کوئی خاص فردِ قوم۔ مطلب یہ ہے کہ قومی تحریکوں کے نام سے جو تحریکیں ہمارے قومی لیڈر چلا رہے ہیں وہ دراصل کلّی تحریکیں یعنی ایسی تحریکیں نہیں ہیں جو قوم کے تمام افراد کی ضروریات و مفاد کو مدِ نظر رکھ کر شروع کی گئی ہیں بلکہ جزئی تحریکیں ہیں۔ جنہیں لیڈروں نے خود اپنی ضروریات اور اپنے مفاد کو سامنے رکھ کر قومی تحریکوں کے نام سے شروع کیا ہے ان تحریکوں کو چلانے کی ضرورت لیڈروں کو اپنے ذاتی مفاد کی وجہ سے پیش آتی ہے مگر نام ان کا قوم کو مغالطہ میں ڈالنے[...] اپنے غمزے دکھلانے کے لئے لیڈروں نے قومی

تحریکیں رکھ دیا ہے۔ [5] یعنی مسلمانوں کو سوائے اس کے کہ آپس میں لڑیں اور کوئی کام نہیں نہ ان کو اس پر غصہ آتا ہے کہ بیدینی اور کفر کیوں رہا (باقی صفحہ ۱۵۰ پر)

پہلی کتابیں ردّی صاحب کا قول سچا

انساں کا علم کامل سابق میں تھا نہ اب ہے
لیکن نئی طرح کا اک بحر بہہ رہا ہے

مرزا غریب چُپ ہیں اُن کی کتاب ردّی
بدھو اکڑ رہے ہیں صاحب نے یہ کہا ہے

دوسروں کے عمل دیکھ لئے خود کچھ نہ کیا

یہی بحثیں رہیں سب میں وہ کیسے ہیں وہ کیسے تھے
یہی سنتے ہوئے گزری وہ ایسے ہیں وہ ایسے تھے

عمل اوروں ہی کے دیکھا کئے یہ نیک یہ بد ہیں
ترقی خود نہ کی کچھ رہ گئے ویسے کہ جیسے تھے

اندھیرے میں پامال ہونے سے جل کر مرجانا اچھا

پوچھا پروانے سے کہ اے ناداں
آگ میں گر کے کیوں گنواتا ہے جاں

جل کے بولا کہ اے خرد دشمن (عقل کے دشمن)
سن لے مجھ سے یہ معنیِ روشن

شعلے[۳] سے طالب وصال اچھا
یا اندھیرے میں پائمال اچھا (برباد، کچلا ہوا)

(صفحہ ۱۴۹ کا بقیہ فٹ نوٹ) پھیل رہا ہے نہ اس پر حیرت ہوتی ہے کہ ہماری فطرت میں نئی روشنی کا تغیر کیسے ہو گیا ہے۔ سوائے زورِ قلم کے اُن میں اور کوئی طاقت نہیں رہی اور اس زورِ قلم یا قوّتِ انشار کو کہیں نہ کہیں صرف کرنا ہے اس لئے اس کو آپس کی خانہ جنگی ہی میں صرف کیا جا رہا ہے۔

[۱] مطلب یہ ہے کہ جس علم کی معاون و سرپرست حکومت ہو جاتی ہے وہی سب علموں سے فائق رہتا ہے اور باوجودیکہ علم نہ کبھی پہلے کامل تھا نہ اب ہے لیکن حکومت کی سرپرستی میں آجانے والے علم کو بے عقل کامل سمجھنے لگتے ہیں اور پہلے علوم کی کتابیں ردّی ہو جاتی ہیں [۲] یعنی ہم ہمیشہ دوسروں ہی کی اچھائیوں اور برائیوں کو دیکھتے رہے اور اپنی حالت کی اصلاح کی طرف کبھی توجہ نہیں کی۔ [۳] یعنی ان دونوں میں کون اچھا، وہ جو پروانہ کی طرح شعلہ سے وصال کی طلب میں جل جائے۔ یا وہ جو رینگنے والے کیڑے کی طرح اندھیرے میں پیروں سے روند دیا جائے۔ قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ انسان کسی اہم اور محبوب مقصد کے حصول کی جدوجہد میں جان دے دے یہ کیا کہ گھر میں دبک کر بیٹھ جائے اور امراض و آلام کا شکار ہو کر مر جائے۔

زورِ حکومت کے بغیر مذہب محض ایک فلسفہ ہے

یہ شیخ اکبر سے اتنا کیوں خفا ہے ۔۔۔ یہ کیوں غیض و غضب جور و جفا ہے
نہیں ہے اس میں جھگڑے کی کوئی بات ۔۔۔ یہ اک قولِ حکیمِ[1] باصفا ہے
نہ ہو مذہب میں جب زورِ حکومت ۔۔۔ تو وہ کیا ہے فقط اک فلسفا ہے

اعتدال کی چال

نہ نرے اونٹ ہو نہ ہو بلڈاگ[2] ۔۔۔ نہ تو مٹی ہی ہو نہ تم ہو آگ
چال ہے اعتدال کی اچھی ۔۔۔ سازِ حکمت[3] کا جوڑ ہے یہ راگ

---

[1] حکیم باصفا سے غالباً علامہ اقبال مراد ہیں اور یہ مفہوم غالباً ان ہی کے کسی شعر سے ماخوذ ہے کہ اگر مذہب کی پشت پناہی پر حکومت نہ ہو تو مذہب اور ایک اخلاقی فلسفہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مذہب اور فلسفہ میں سب سے بڑا اور بنیادی فرق یہ ہے کہ مذہب کی بنیاد ایمان بالغیب پر ہوتی ہے اور فلسفہ کی بنیاد ایمان بالعقل پر، یا ایمان بالمشاہدہ پر۔ ایمان بالغیب کو زورِ حکومت سے بہت تقویت پہنچتی ہے۔ کیونکہ عقل حکومت کے ڈر سے مرعوب اور دبی ہوئی رہتی ہے اور ایمان بالغیب میں مداخلت نہیں کرتی۔ یہی وجہ ہے کہ بچے جب تک پابند مذہب والدین اور اساتذہ کے زیرِ اثر رہتے ہیں ان میں ایمان بالغیب کی صلاحیت زیادہ رہتی ہے اور اس زمانہ میں اگر ایمان بالغیب کی جڑیں مضبوط ہو جاتی ہیں تو پھر عمر شعور کی آزاد خیالیوں سے بھی اس میں جنبش پیدا نہیں ہوتی۔ مذہب میں زورِ حکومت نہ ہونے سے عقل کو پوری آزادی مل جاتی ہے اور وہ ایمان بالغیب کی جڑوں کو کھوکھلا کرتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ مذہب کو بھی عقل کی کسوٹی پر پرکھنا شروع کر دیا جاتا ہے۔ جو مذہبی باتیں عقلاً ٹھیک اور قابلِ اتباع ہوتی ہیں۔ صرف ان کو مانا جاتا اور ان ہی پر عمل کیا جاتا ہے۔ اور جو باتیں بعید از عقل یا خلافِ مصلحت نظر آتی ہیں ان کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ گویا مذہب بھی ایک اخلاقی فلسفہ ہو کر رہ جاتا ہے اور مذہب سے روحانی تعلق باقی نہیں رہتا صرف عقلی تعلق رہ جاتا ہے اس لئے جو فوائد مذہب کے حاصل ہونے چاہئیں وہ حاصل نہیں ہوتے۔ [2] بل ڈاگ۔ لفظ انگریزی Bull dog ایک بڑے منہ کا طاقتور اور بہادر شکاری کتا۔ [3] حکمت کے ساز کے ساتھ میانہ روی کا راگ بھی اچھا ہوتا ہے۔ یعنی اعتدال کی روش ہی حکیمانہ اور عقلمندانہ روش ہے۔

بلبل اسپیچیں دیتی ہے اور پروانہ جان

بہ چشم غور دیکھو بلبل و پروانہ کی حالت
وہ[1] اسپیچیں دیا کرتی ہے اور یہ جان دیتا ہے

وہ پھنستی ہے قفس میں اور اس کا نام روشن ہے
ہوا پر خیمۂ معنی کو اکبر تان دیتا ہے

بلبل — پروانہ

عقلِ کثیر اور حسنِ تدبیر

کیا اس[2] کی خوشی کہ تم کو ہے عقلِ کثیر
ہم کو تو اسی سے کر دیا تم نے فقیر

ہر گز یہ نہیں ہے حسنِ قانونِ خدا
کہتے ہیں حضور اس کو حسنِ تدبیر

تدبیر کا حسن

کفر کا علاج ممکن، نیٹویت جان کے ساتھ ہے

اکبر اس اندیشہ میں رہتا ہے غرق
کافر و نیٹو[3] میں ہے تھوڑا ہی فرق

کافری کا ہے علاج ایمان سے
نیٹویت تو ہے لپٹی جان سے

---

[1] مطلب یہ ہے کہ جو لیڈر قوم کی محبت میں بلبل کی طرح محض تقریریں کیا کرتے ہیں وہ تو جیل میں بند کر دیئے جاتے ہیں۔ لیکن جو پروانہ کی طرح شمع قوم پر فدا ہو جاتے اور جان قربان کر دیتے ہیں ان کا نام شہدائے قوم میں لکھا جاتا اور ہمیشہ روشن رہتا ہے۔ چونکہ اس مضمون سے انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے اور ملک و ملت کے لئے جان دینے کی ترغیب نکلتی تھی اس لئے حضرت اکبر نے اس کو بلبل و پروانہ کے استعارہ میں بیان کر کے چوتھے مصرع میں اسی کی طرف یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ اکبر نے خیمۂ معنی کو ہوا پر تان دیا ہے یعنی اکبر کا اصل مقصود اور اشعار کا حقیقی مفہوم معلوم کرنے کے لئے لفظوں کی نشست سے اوپر دیکھنے کی ضرورت ہے جہاں ہوا، یعنی قانونی گرفت سے بچنے کے لئے معنی کا خیمہ تانا گیا یا کھڑا کیا گیا ہے۔ [2] مطلب یہ ہے کہ نئے علوم و فنون کے حاصل کرنے سے ممکن ہے کہ تمہاری عقل بڑھ گئی ہو۔ مگر عقل کی اس زیادتی سے قوم تو فقیر اور محتاج ہو گئی۔ فلاح قوم کی جن تدبیروں کو تم اچھا سمجھ رہے ہو وہ تمہاری عقل کے نزدیک اچھی ہوں تو ہوں۔ مگر خدا کا قانون

آپ بڑھے، ہم گھٹے

گذرے مری نگاہ سے یاروں کے جمگھٹے
مطلب یہ تھا سرور بڑھے اور غم گھٹے

کھانے بھی خوب کھلائے اڑیں گل خپیں بھی خوب
لیکن ہوا یہی کہ بڑھے (ترقی کی) آپ ہم گھٹے

ہم تو اسی کو بات سمجھتے ہیں کام کی
عشق صمد (خدا) زیادہ ہو عشق صنم (بُت) گھٹے

قوم نیچرل ہے وہ بن نہیں سکتی

قوم اور سلطنت ہیں دو چیزیں
نیچرل وہ ہے یہ ہے مصنوعی

نیچرل چیز بن نہیں سکتی
آئیں (یعنی قوم) کیونکر صفات مجموعی (یعنی سلطنت)

(صفحہ ۱۵۲ کا بقیہ فٹ نوٹ) کے معنی ہیں دیسی۔ یہاں مراد ہے غلام، محکوم اور محتاج۔ کافر اور نیٹو میں تھوڑا کا فرق اس لئے ہے کہ محکوم کو بھی رفتہ رفتہ وہی مذہب اختیار کرنا پڑتا ہے جو اس کے حاکم کا ہوتا ہے اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ (عوام الناس کا دین و مذہب بھی وہی ہوتا ہے جو ان کے بادشاہوں کا ہوتا ہے اور فقر و محتاجی کا انجام عموماً کفر ہوا کرتا ہے حسب ارشاد نبویؐ کاد الفقر ان یکون کفراً (قریب ہے کہ محتاجی اور ضرورت مندی کفر ہو جائے) نیٹویت بمعنی دیس کا باشندہ ہونا ہند سے نیٹو کا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کفر ہماری نیٹویت یعنی محکومی و محتاجی کا تابع نہ ہوتا تو ممکن تھا کہ کفر کی طرف میلان رکھنے والوں کے دلوں میں پھر ایمان کی روشنی پیدا کر دی جاتی۔ مگر جو کفر ہماری نیٹویت یعنی قومی محکومی کا نتیجہ ہے اس کا علاج ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ نیٹویت اور محکومیت تو ہماری جان کے ساتھ لگی ہوئی ہے اس سے چھٹکارا جب ہی حاصل ہو سکتا ہے کہ حکومت ہماری ہو۔

۱؎ گل خپ۔ بمعنی بے تکلفانہ بحث مباحثے۔ مطلب یہ ہے کہ انگریزوں کو دوست بنانے ان کے ساتھ دعوتیں اڑانے اور بے تکلفانہ بات چیت اور بحث مباحثے کرنے کا نتیجہ بھی اس کے سوا کچھ نہ ہوا کہ بجائے راحت و خوشی حاصل ہونے کے ہماری تکلیفیں بڑھ گئیں اور انگریز ترقی کرتے رہے اور ہم تنزل ۲؎ یعنی انگریزوں سے میل و محبت بڑھانے کے مذکورہ انجام کو دیکھ کر ہم تو اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ غیر خدا کے بجائے خدا سے محبت کرنی چاہیئے۔ ۳؎ مطلب یہ ہے کہ قومیں بنانے سے نہیں بنا کرتیں۔ بلکہ اجتماعی اور قومی صفات افراد قوم میں مرکز قومیت کی طرف اُن کے طبعی اور قدرتی رجحانات سے پیدا ہوتی ہیں۔ برخلاف حکومتوں اور سلطنتوں کے کہ ان کے قیام و استحکام کے لئے ایسی قابلیتوں اور صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے جو کسب و عمل اور جسمانی و دماغی کد و کاوش سے حاصل ہوتی ہیں۔

گربۂ زاہد کی نماز

بن گئی ہے خضرِ راہ دوستاں کیدِ حریف (مکاری کا جال) (دشمن) ۔۔۔ ہے نمازِ گربۂ زاہد (بلّی) سے خوش کبکِ نحیف (چکور) (کمزور)

ہم[1] کو یہ سجدہ ملایا چاہتا ہے خاک میں ۔۔۔ کون سمجھے شاعروں (پرہیزگاری) کے یہ اشاراتِ لطیف

دسترس رکھنا چاہو تو بے بس نہ ہو

اونٹ[2] نے گایوں کی ضد پر شیر کو ساجھی کیا ۔۔۔ پھر تو مینڈک سے بھی بدتر سب نے پایا اونٹ کو

جس پہ رکھا چاہتے ہو باقی اپنی دسترس (اقتدار) ۔۔۔ منہ[3] میں ہاتھی کے تم اے بھائی وہ گنا نہ دو

ایشیا کی غفلت اور یورپ کی نظر

ابھی انجن[4] گیا ہے اس طرف سے ۔۔۔ کہے دیتی ہے تاریکی ہوا کی

رہی رات ایشیا غفلت میں سوتی ۔۔۔ نظر یورپ کی کام اپنا کیا کی

---

[1] مطلب یہ ہے کہ جس طرح مکار بلی کے پرہیزگاری وخدا ترسی کا جال بچھانے سے چکور دھوکہ میں آ کر بلی کا شکار ہو جاتی ہے اسی طرح ہمارے قومی لیڈروں کے مذہبی جامے پہن کر پبلک میں آنے اور نمایشی نمازیں پڑھنے سے قوم اُن کے پھندے میں پھنس رہی اور اپنی عاقبت خراب کر رہی ہے۔

[2] اونٹ سے مراد مسلمان ہیں۔ گایوں سے مراد ہندو، اور شیر سے مراد انگریز۔ مطلب یہ ہے کہ ہندوؤں کو زک پہنچانے اور ان پر اقتدار حاصل کرنے کے لئے مسلمانوں نے انگریزوں سے دوستی گانٹھی۔ مگر نتیجہ اس دوستی کا یہ ہوا کہ انگریز مسلمانوں پر ایسے حاوی ہو گئے کہ مسلمانوں کی حیثیت انگریزوں ہی کی نہیں بلکہ ہندوؤں کی نظر میں مینڈک سے بھی بدتر ہو گئی۔

[3] یعنی جس چیز سے تم فائدہ اٹھانا اور اس پر اقتدار قائم رکھنا چاہتے ہو اس پر کسی اپنے سے زیادہ بڑے اور طاقتور کا قابو اور اقتدار نہ ہونے دو، ورنہ وہ چیز اسی کے حصہ میں آئے گی جو تم سے زیادہ طاقتور ہے اور تم اُس سے محروم رہو گے۔ مسلمان ہندوؤں کو اپنا زیر دست رکھنا چاہتے تھے مگر انہوں نے یہ غلطی کی کہ اپنے سے زیادہ طاقتور انگریزوں سے دوستی کر کے ہندوؤں کو انگریزوں کی دسترس میں دیدیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو انگریزوں کے ہو گئے اور مسلمان منہ تکتے رہ گئے۔ [4] انجن سے مراد ہے تہذیب مغربی۔ مطلب یہ ہے کہ فضائے مشرق میں لامذہبی کی تاریکی پھیلنے سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ مشرق پر بھی تہذیب مغربی کا تسلط ہو گیا ہے۔ ایشیا والے تو خواب غفلت میں پڑے سوتے رہے اور بیدار مغز اہل مغرب نے ایشیا کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر مشرق میں بھی اپنا تسلط جما لیا۔

تقلیدِ دہر

دانم کہ سادگی و خاموشی است اولیٰ — تقلیدِ دہر لیکن بربودہ است ہوشم
سودائے گفتن در سر وضعِ صلیب[1] در بر — دانم چرا نہ گویم دارم چرا نہ پوشم

آزادی غیروں کی اسیری کا نام نہیں ہے

میں بھی ہوں بہ دل مؤید آزادی کا — لیکن اک نکتہ سن لے اے پاک ضمیر
[2] آزاد ہو اس لئے کہ اغیار ہوں قید — مطلب یہ نہیں کہ خود ہوں غیروں کے اسیر

نورِ عرفاں کے لئے قرارِ دل ضروری

[3] شترِ روباہ سے کمتر ہیں بن میں محتبس ہو کر — بنے ہیں شیر کتے زینتِ آغوش میں ہو کر
[4] قرارِ دل نہیں تو نورِ عرفاں کیا جگہ پکڑے — وہ شکلِ مہر و مہ موجوں میں کب ہے منعکس ہو کر

---

[1] صلیب یعنی سولی جس کی شکل پہلے زمانہ میں ایسی + یعنی چلیپائی ہوتی تھی اور جس پر سر اور دونوں ہاتھ پیروں میں میخیں ٹھونک کر آدمی کی جان لی جاتی تھی۔ عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق عیسیٰ علیہ السلام کو ایسی ہی صلیب پر سولی دی گئی تھی اس لئے صلیب کی شکل کی کوئی چیز اکثر عیسائی اپنے پاس رکھتے ہیں وضعِ صلیب سے مراد عیسائیوں کی وضع قطع ہے۔ ترجمہ اور مطلب اشعار کا یہ ہے۔ میں جانتا ہوں کہ سادگی اور خاموشی اچھی چیزیں ہیں۔ لیکن زمانہ کی تقلید نے میرے ہوش گم کر رکھے ہیں۔ دماغ میں بولنے کا جنون ہے اور شیوہ عیسائیوں کی وضع قطع اختیار کرنے کا۔ یعنی میرا مسلک یہ ہو گیا ہے کہ جو بات میں جانتا ہوں سے ضرور کہوں خواہ اس کا کہنا مناسب ہو یا نہ ہو۔ اور جب میں عیسائیوں کا لباس پہننے کی مقدرت رکھتا ہوں تو اسے ضرور پہنوں خواہ اس سے فائدہ ہو یا نقصان۔ یعنی میری عقل پر خواہشاتِ نفس اور تقلیدِ مغرب کے شوق کا پردہ پڑ گیا ہے۔ [2] یعنی آزادی اس کا نام نہیں ہے کہ تم غیروں کے محکوم و غلام ہو جاؤ اور ضروریاتِ زندگی کو اتنا بڑھا لو کہ بغیر دوسروں کی محتاجی کے زندگی بسر نہ کر سکو بلکہ سچی آزادی یہ ہے کہ دوسرے تمہارے محکوم و محتاج ہوں [3] مطلب یہ ہے کہ عزت اور طاقت آزادی اور رسوخ سے حاصل ہوتی ہے۔ اونٹ کو اگر کسی جنگل میں محبوس و مقید کر دیا جائے تو آزاد لومڑی بھی ایسے مقید اونٹ سے بہتر ہوتی ہے اور جن کتوں کو انگریزوں کی میمیں اپنی گود میں بٹھاتی ہیں وہ کتے ہونے کے باوجود اپنے آپ کو شیر سمجھنے لگتے ہیں [4] خدا کی معرفت کا نور ایسے دل میں جو افکار

دنیوی سے بے قرار اور مضطرب ہو کیسے برقرار رہ سکتا ہے بلکہ وہ چاند سورج کے اس عکس کی طرح لرزتا رہتا ہے جو دریا کی ہلنے والی موجوں میں دکھائی دیتا ہے۔

ہم اور ہماری اولاد

پیش آئے ہمیں امور عادت کے خلاف　　　پایا انہیں ہم نے اپنی راحت کے خلاف
اولاد[۱] کو غالباً یہ تکلیف نہ ہو　　　وہ خود ہی ہیں بوڑھوں کی خصلت کے خلاف

جہاز ٹائی ٹینک کی غرقابی

بیان اپنی مصیبت کا تھا مجھے منظور　　　خیال تھا سوئے تشبیہ جستجوئیں تھیں
ہوا جو ٹائی ٹینک[۲] غرق کہہ دیا میں نے　　　کہ دل مرا تھا اور اس دل کی آرزوئیں تھیں

---

۱ مطلب یہ ہے کہ ہماری تربیت تو پرانی تہذیب کے ماحول میں ہوئی تھی۔ اس لئے ہمیں نئی تہذیب کی باتیں اور عادتیں تکلیف دہ معلوم ہوتی ہیں۔ آئندہ نسلوں کے لئے یہ نئی عادتیں غالباً تکلیف دہ نہیں ہوں گی۔ کیونکہ انہوں نے نئی تہذیب ہی کے ماحول میں آنکھیں کھولیں اور اسی ماحول میں وہ تربیت پا رہے ہیں۔

۲ ٹائی ٹینک انگریزوں کے ایک عظیم الشان جنگی جہاز کا نام تھا جسے بہت بڑی رقم خرچ کر کے کافی عرصہ کی محنت و کوشش کے بعد تیار کیا گیا تھا اور جس کے متعلق یہ کہا جاتا تھا کہ وہ آسانی سے نہیں ڈوب سکتا۔ مگر اتفاق سے وہ اپنے پہلے ہی سفر میں غرق ہو گیا اور اس کے غرق ہونے کو انگریزوں کی ایک بڑی قومی مصیبت سے تعبیر کیا گیا۔ اکبر فرماتے ہیں کہ میں اپنی مصیبت کے بیان کرنے کے لئے کسی ایسی تشبیہ کا متلاشی تھا جو اس مصیبت کا پورا نقشہ کھینچ سکے کہ جہاز ٹائی ٹینک کی غرقابی کی خبر ملی اور اس غمناک حادثہ کو میں نے اپنی مصیبت کا آئینہ پایا۔ جس طرح جہاز ٹائی ٹینک کے ڈوبنے سے انگریزوں کا دل اور اُن کی وہ آرزوئیں ڈوب گئیں جو جہاز مذکور کے ساتھ وابستہ تھیں اسی طرح مجھ پر پڑنے والی مصیبت نے بھی میرے دل کو مردہ اور میری آرزوؤں کو ختم کر دیا۔

قومیات

و

سیاسیات

دوالے۔ رسالے۔ مسجد اور شوالے

ملکی ترقیوں میں دوالے[1] نکالئے　　پلٹن نہیں تو خیر رسالے[2] نکالئے

کافی ہے بہرِ شغل کلیسائے[3] فکرِ رزق　　اب دل سے مسجد اور شوالے نکالئے

گرجا　مندر

نیٹو ہونے کا رنج، ممبر ہونے کی خوشی

شیخ صاحب کو یہ صدمہ ہے کہ نیٹو[4] ہو گئے　　میرزا خوش ہیں کہ سر پر آگیا کونسل کا تاج[5]

میرزا کا نام رہ سکتا ہے قائم سعی سے　　شیخ جی کے رنج کا اللہ ہی جانے علاج[6]

---

[1] دوالے نکالنے سے مراد مفلس ہو جانا ہے۔

[2] پلٹن پیدل فوج کو کہتے ہیں اور رسالہ گھوڑے سوار فوج کو۔ رسالہ ماہوار یا ہفتہ وار شائع ہونے والے پرچہ کو بھی کہتے ہیں۔ یہاں رسالوں سے موقت الشیوع پرچے ہی مراد ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اہل ملک کی ایسی حیثیت اور اتنی طاقت تو ہے نہیں کہ وہ پلٹن بنا کر دشمنانِ ملک سے لڑ دیں۔ اس لئے ان کو بیکاری میں قومی ترقی کے مقاصد کے نام سے نئے نئے رسالے شائع کرنے کا ایک ایسا مشغلہ مل گیا ہے جس سے ان کی رہی سہی پونجی بھی ضائع ہو جاتی ہے اور ان کے دوالے نکل رہے ہیں۔

[3] یعنی ذریعۂ حصول رزق چونکہ زیادہ تر انگریزوں کی ملازمت ہے اس لئے مسلمانوں کو مسجد اور ہندوؤں کو شوالے کا خیال دل سے نکال کر اب ذریعۂ رزق یعنی انگریزوں ہی کے معابد کلیساؤں کا دھیان کرنا چاہیئے۔ ویسے کلیسائے فکر رزق ایک نئی ترکیب اور زبان میں اچھا اضافہ ہے

[4] یعنی انگریز حقارت سے ان کو نیٹو یعنی کالا آدمی کہنے لگے [5] یعنی کونسل کی ممبری کو بڑی بھاری عزت اور قوت سمجھنے لگے۔ [6] یعنی کونسل کی ممبری کی عزت تو کوشش سے قائم رہ سکتی ہے لیکن نیٹو کہلائے جانے کا رنج تو تب ہی دور ہو سکتا ہے جب خدا انگریزوں کی حکومت کو ختم کر دے۔

انگریزوں کی بادشاہی میں مڈو اور ہندو

انگلش کو خدا نے بادشاہی دی ہے	رفتارِ زمانہ نے گواہی[1] دی ہے
مڈو[2] بھی لگاتے ہیں مدریا[3] کا دم	ہندو کو چلم بھی لالہ شاہی[4] دی ہے

ہند میں شیخ جیسے گنگا میں اونٹ

ہند میں شیخ رہ گیا افسوس	اونٹ[5] گنگا میں بہہ گیا افسوس
دیکھ کر ہم کو ایسی دلدل[6] میں	راہ چلتا بھی کہہ گیا افسوس

شوقِ لیلائے سول سروس

شوقِ لیلائے سول سروس[7] نے مجھ مجنون کو	اتنا دوڑایا لنگوٹی کر دیا پتلون[8] کو

---

[1] یعنی رفتارِ زمانہ سے بھی اس کی تصدیق ہو رہی ہے کہ انگریز بادشاہی کے اہل ہیں۔ [2] مڈو سے مراد مسلمان چرسی اور بھنگڑ ہیں۔

[3] وہ چلم جس میں چرس بھر کر پی جائے۔ [4] یعنی ہندو چرسے کی چلم میں بھی ہندوانہ پن ہے۔

[5] اونٹ کے گنگا میں بہنے سے مراد یہ ہے کہ مسلمانوں کی سب خصوصیاتِ عرب ہند کی اقامت سے ختم ہو گئیں۔

[6] یعنی ہندوستانی مسلمان خصوصیات عرب ختم ہونے کے بعد ایسی دلدل یا گہری کیچڑ میں پھنس گئے ہیں جس سے نکلنا اور پھر اپنے اندر اسلامی خصوصیات کا پیدا کرنا ان کے لئے بیحد دشوار ہو رہا ہے۔

[7] Civil Service انگریزی الفاظ ہیں جن سے مراد بڑے بڑے انتظامی سرکاری عہدوں کی ملازمتیں ہیں۔

[8] یعنی بڑی سرکاری ملازمتیں حاصل کرنے کے شوق میں لوگ کافی خرچ کر کے پتلونیں پہنتے ہیں لیکن عرصہ دراز کی دوڑ دھوپ اور صرفِ زر کے بعد نوکری حاصل کرنے میں ناکامی ہونے پر محتاج اور لنگوٹی بند ہو جاتے ہیں۔

جانِ ہستی کے ٹکڑے اڑ رہے ہیں نزع[1] میں پھینکئے اب کوٹ کو تہہ کیجئے پتلون کو

خوش حالی سے بسر کرنے کیلئے بنگالی نکتہ

نکتہ یہ سنا ہے ایک بنگالی[2] سے کرنا ہو بسر جو تم کو جو خوش حالی سے

خالی ہو جگہ تو اپنے بھائی کو دلاؤ غصہ آئے تو کام لو گالی سے

مذہب کی کہو تو دل لگی، مطلب کی کہو تو پالیسی

مذہب کی کہو تو دل لگی میں اُڑ جائے مطلب کی کہو تو پالیسی[3] میں اُڑ جائے

باقی سرِ قوم میں ابھی ہے کچھ جوش غالب ہے کہ یہ بھی اس صدی میں اُڑ جائے

جہاں تھے وہیں رہے بلکہ اور بدتر ہو گئے

چیخے، چلائے، کودے، اچھلے، ٹہلے ہر پھر کے وہیں رہے جہاں تھے پہلے

حالت تو وہی ہے بلکہ اُس سے بدتر یوں منہ سے جو جس کے دل میں آئے کہہ لے[4]

[1] یعنی اب کہ کوٹ و پتلون کے شیدائیوں کی ہستی ہی خطرہ میں پڑ گئی اور جینا اتنا دوبھر ہو گیا ہے۔ انہیں کوٹ و پتلون کے شوق سے باز آ جانا چاہیئے۔
[2] انگریزوں کی ملازمت کا تجربہ بنگالیوں کو زیادہ تھا۔ [3] یعنی کسی مقصد کے لئے درخواست کرنے پر جواب یہ ملتا ہے کہ ایسی درخواستوں کا پورا کرنا ہماری پالیسی یعنی مصلحت حکومت کے خلاف ہے۔ [4] یعنی قومی ترقی کے لئے سب جتن کر لئے مگر رہے وہیں کے وہیں۔

یہ زمانہ اور ہے اور وہ زمانہ اور تھا

اور ہی تھی ساخت تیروں کی نشانہ اور تھا — یہ زمانہ اور ہے اور وہ زمانہ اور تھا
تھی نہ یہ لیڈر کی رقاصی نہ یہ قانونِ غرب[1] — سننے والے اور تھے اُس وقت گانا اور تھا

باہر جشن، گھر میں فاقہ

ہوٹلوں کو کتھا مبارک ہو — ریل کو یہ جتھا[2] مبارک ہو
گھر میں کھانے کو کچھ نہ تھا کل رات — قوم کو یہ "نہ تھا"[3] مبارک ہو

ارتقائے حال و خیال

غربی[4] نسیم نفس کشا شاید آئے گی — مژدہ جواز نقلِ حکومت کا لائے گی
جن[5] کے خیال و حال کو ہے ارتقا نصیب — سینوں میں ان کے غنچۂ دل کو کھلائے گی

---

[1] قانون ایک باجہ کا نام بھی ہے جو پیانو کی قسم کا ہوتا ہے۔ یہاں رقاصی (ناچ) کی رعایت سے یہی باجہ مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پہلے زمانہ کی ہر ایک چیز یہاں تک کہ لوگوں کے مذاق بھی اس زمانہ میں بالکل بدل گئے ہیں اس وقت نہ آج کل کے سے اسلحہ تھے اور نہ آجکل کے سے سامانِ طرب بلکہ طریقہ رہنمائی بھی اس سے بالکل مختلف تھا جو اب ہے۔ [2] جتھا یعنی گروہ۔ جماعت۔ غالباً مراد قومی کارکنوں کے اُن جتھوں سے ہے جو خلافت اور ترکِ موالات وغیرہ کی تحریکوں کے زمانہ میں سول نافرمانی کے لئے بھیجے جاتے تھے۔ [3] یعنی ہوٹلوں میں تو کتھائیں ہو رہی ہیں اور ریلوں پہ جتھے جا رہے ہیں۔ مگر گھروں کی کیفیت یہ ہے کہ ان میں فاقوں کی نوبت آگئی ہے۔ [4] مطلب یہ ہے کہ مغرب یعنی یورپ و امریکہ میں اس وقت جو انقلابات ہو رہے ہیں ان سے ممکن ہے کہ ایسے خوشگوار حالات پیدا ہو جائیں جن سے ہندوستان میں انگریزی حکومت کی تبدیلی کی کوئی صورت نکل آئے یعنی شاید انگریزی حکومت خود اس کی ضرورت محسوس کرنے لگے کہ اپنے اختیارات باشندگانِ ملک کو منتقل کر دے اور ہندوستان کو حکومت خود اختیاری مل جائے۔ [5] یعنی انتقالِ حکومت کی خوش خبری کم سے ان لوگوں کو بڑی مسرت ہو گی جو اپنی موجودہ غلامی سے تنگ آ کر آزادی و ترقی کے خواہشمند ہیں۔

بڑا وہ جو صاحب سے ڈرے

خاموش برائی کرنے والے ہیں کھڑے — اس وقت تو وہ بڑا جو صاحب سے ڈرے
کہتے ہیں[۱] ہمیں مصیبتوں میں پڑ جائیں — کب تک یہ ڈریں کوئی مصیبت نہ پڑے (صاحب: یعنی انگریز)

سخن فہم کم، گزٹ فہم زیادہ

ہیں تو سخن[۲] دماغ میں مرے سہم بہت — سنئے یہ خیال جس میں ہے وہم بہت
قومی مجلس میں اب سخن فہم ہیں کم — دربار میں گو کہ ہیں گزٹ فہم بہت (گزٹ: سرکاری اخبار)

دل کو سنبھالے رکھنا بھی غنیمت ہے

جو حسرت دل ہے وہ نکلنے کی نہیں — جو بات ہے کام کی وہ چلنے کی نہیں
یہ بھی ہے بہت دل کو سنبھالے رہئیے — قومی حالت یہاں سنبھلنے کی نہیں

---

[۱] یعنی جو لوگ انگریزوں کی تعریف و توصیف اب تک اس ڈر سے کرتے رہے ہیں کہ کہیں انگریزوں کو ناراض کرنے سے ان پر کوئی آفت و مصیبت نہ نازل ہو۔ اب یہی لوگ پیہم ڈرتے رہنے سے تنگ آگئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس خوف و دہشت سے اپنی جان گھلاتے رہنے کی بجائے ان آفات و مصائب ہی کا کیوں نہ مقابلہ کریں۔ جن کا خوف ان پر مسلط رہتا ہے تاکہ ایک دفعہ پوری مصیبتیں اٹھا کر ہمیشہ کیلئے خوف و دہشت کی مصیبت سے نجات حاصل کرلیں[۲] یعنی قوم کی موجودہ کمزوریوں اور گمراہیوں کے خلاف جو باتیں مجھ کو کہنی ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ سخن فہمی کا مادہ روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے اور گزٹ فہمی یعنی قانون دانی اور سرکاری اعلانات و بیانات کے سمجھنے کی قابلیتیں بڑھ رہی ہیں۔

معنیٰ نہ سہی صورت تو وہ ہو

مرشد[1] نے کہا اُٹھئے حضرت معنی[2] نہ سہی صورت تو وہ ہو
گھر چھوڑ کے بسیئے بنگلے میں طاقت نہ سہی زینت تو وہ ہو
اس نقش[3] کی کر دو خانہ پُری تقدیر رہے گی پھر نہ بُری
راس (موافق) آئے گی تم کو بادہ خوری (شراب نوشی) مجلس تو وہ ہو صحبت تو وہ ہو

بے ایمانوں سے تعرض نہ کرو

مصحفِ مُسلم نے کھولنا چھوڑ دیا
بنئے نے ٹھیک تولنا چھوڑ دیا
حاکم[4] نے کہا نہ بولو (تعرض نہ کرو) ان سے ہرگز
ہم نے بھی سب سے بولنا (باز پرس کرنا) چھوڑ دیا

نہ ملکِ اسلام، نہ ملکِ لچھمن و رام۔ یورپ کا گودام

یہ بات غلط مُلکِ اسلام ہے ہند
یہ جھوٹ مُلکِ لچھمن و رام (یعنی ہندو) ہے ہند
ہم سب ہیں مطیع و خیر خواہِ انگلش
یورپ کے لئے بس ایک گودام[5] ہے ہند

---

[1] مرشد سے مراد تہذیب مغربی ہے [2] معنی سے مراد مغربی کیرکٹر و سیرت کی بعض خوبیاں ہیں۔ [3] نقش کے معنی اس تعویذ کے بھی ہیں جس میں خانے ہوتے ہیں اور خانوں میں ہندسے وغیرہ لکھے جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مغربی نقش کا تعویذ باندھ لینے یعنی مغربی طرز بود و ماند کے اختیار کر لینے سے تم کو شراب نوشی بھی راس آنے لگے گی۔ یعنی تمہاری شراب نوشی بھی ان مقاصد کے حصول میں مدد دیگی جو مغربی تقلید سے تمہارے پیش نظر ہیں اور تمہیں تقدیر کے کھوٹی ہونے کی شکایت نہیں رہے گی۔

[4] مطلب یہ ہے کہ حکومت کا قانون ایسے لوگوں سے تعرض کرنے کی اجازت نہیں دیتا جو مذہب سے روگردانی کرتے یا اپنی اخلاقی ذمہ داریوں کی پروا نہیں کرتے ہیں۔ اس لئے ہم نے بھی اُن سے باز پرس کرنا چھوڑ دیا۔

[5] یعنی فراہمی غلہ و اشیاء خام کا ایک ذریعہ۔

قوم کے فاقے شبرات کے پڑاتے

پڑا ہے قحط بشر مر رہے ہیں فاقوں سے — خوشی ہو کیا مجھے شبرات میں پڑاقوں سے
بجھی ہوئی ہے طبیعت یہ روشنی ہی فضول — اتار دیجیے صاحب چراغ طاقوں سے

نہ بھرم رہے گا نہ دھرم

بگو بہ سیٹھ کہ او را بھرم (ساکھ کا اعتماد) نخواہد ماند [1] — بگو بہ برہمن او را دھرم (مذہب) نخواہد ماند
من ارچہ در نظر یار شرمسار شدم — رقیب (مراد ہندو ہیں) نیز چنیں محترم نخواہد ماند

جوانی میں عشق بتاں پیری میں عشق قوم

مذہب نے کر دیا تھا ہر ایک کو غریق نوم — تھے مبتلائے حج و صلوٰۃ و زکوٰۃ و صوم
دنیا و دیں کا فیصلہ آخر کو یہ ہوا [2] — عشق بتاں شباب میں پیری میں عشق قوم

---

[1] ترجمہ: سیٹھ سے کہو کہ اس کی ساکھ قائم نہیں رہے گی۔ برہمن سے کہو کہ اس کا مذہب باقی نہیں رہے گا۔ میں اگرچہ یار کی نظر میں شرمندہ ہوا ہوں۔ مگر رقیب کی بھی یہ عزت و وقعت باقی نہیں رہے گی۔ مطلب یہ ہے کہ مسلمان اگرچہ انگریزوں کی نظر میں ذلیل ہو گئے ہیں۔ مگر ہندو جو آجکل مسلمانوں کے رقیب بنے ہوئے ہیں اُن کی عزت و وقعت بھی چند روز کی ہے۔ وقت آ رہا ہے کہ نہ سیٹھوں کی ساکھ رہے گی اور نہ برہمنوں کا دین۔ [2] مطلب یہ ہے کہ دنیا اور آخرت دونوں کو اسی دنیاوی زندگی تک محدود کر دیا گیا اور نماز و روزہ و حج و زکوٰۃ کی بجائے جوانی میں بتوں کے عشق کو دنیا اور بڑھاپے میں قوم و عشق کو آخرت سمجھ لیا گیا ہے۔

آزادیٔ رندانہ اور اسیریٔ فکر خانہ

تھا تصورِ مالکِ آزادیِ رندانہ ہوں — لیکن اب بالکل اسیرِ انتظامِ خانہ ہوں
پہلے تھا اُس بت کے گرد اب ساتھ ہی بچوں کی فوج — عشق میں دیوانہ تھا اب فکر میں دیوانہ ہوں

پیٹ دوڑاتا ہے

مہمانِ فلک کہاں سکوں پاتا ہے — آسودہ (خوش حال) جو ہیں اُنہیں بھی ٹہلاتا ہے[1]
ہے ہضم کی فکر میں یہ نقل و حرکت (یعنی دنیا میں رہنے) — ظاہر ہے صریح (صاف) پیٹ[2] دوڑاتا ہے

پاس کی فکر دور سے بے فکری

دُھن نوکری کی ہے نہ پری ہے نہ حور ہے — اب فکر پاس[3] کی ہے قیامت تو دور ہے
آئین بھی بدلتے ہیں نیت کے ساتھ روز — امید بے اصول[4] سے اب دل نفور ہے

---

[1] یعنی کام کاج کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ [2] یعنی ساری دوڑ دھوپ پیٹ کے لئے ہوتی ہے [3] پاس لفظ اردو بمعنی قریب اور لفظ انگریزی pass یعنی امتحان پاس کرنا۔ یہاں پاس کے دونوں معنے لئے جا سکتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ قیامت کو تو دور ہونے کی وجہ سے لوگ بھولے ہوئے ہیں اور سب اپنی قریبی یعنی موجودہ ضرورتوں کے چکر میں پڑے ہوئے ہیں یا یہ کہ نوکریاں حاصل کرنے کیلئے امتحانات پاس کرنے کی فکر میں ہیں۔ [4] امید بے اصول سے مراد ایسی امید ہے جو کسی معقول بنیاد پر قائم نہ ہو یعنی جہاں نیتیں اور قانون روزانہ بدلا کریں وہاں کوئی امید کیا قائم کی جا سکتی ہے۔

مذہبی بحث اور قومی اصلاح

مذہب[1] کو لیا تو بحث میں سر ٹوٹا　　چاہی اصلاح تو خدا ہی چھوٹا
شکوہ ہم غیر کا کریں کیا اکبر　　قسمت ہی نے ہم کو ہر طرح سے لوٹا

ہر شخص بجائے خود ایک قوم

اب تک کوئی بہتری تو ظاہر نہ ہوئی　　گذرے جاتے ہیں ہم پہ سال و مہ و یوم
شاید کہ یہی ترقیٔ قومی ہے　　ہر شخص[2] بجائے خود بنا ہے اک قوم

ننانوے کا پھیر

اک روز بھی تارکِ تگ و دو نہ ہوئے　　فارغ از بحثِ گندم و جو نہ ہوئے
جمعیتِ دل کہاں حریصوں کو نصیب　　ننانوے ہی رہے کبھی سو[3] نہ ہوئے۔

---

[1] مطلب یہ ہے کہ ہم غیروں کا شکوہ کیا کریں۔ خود ہمارے ہی اندر ایسی خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں جو ہماری تباہی و بربادی کا باعث ہو رہی ہیں۔ جب مذہب کی طرف جھکتے ہیں تو آپس ہی میں بحثیں کر کے ایک دوسرے سے لڑتے ہیں اور جب اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو مذہب ہی کو خیرباد کہہ دیتے اور خدا کو بھول جاتے ہیں [2] یعنی ہر شخص قومی نمائندگی اور لیڈری کا دم بھر رہا ہے اور اپنے ذاتی فائدہ ہی کو قومی نفع تصور کر رہا ہے۔ اس لئے اصلاحی تحریکوں کو چلتے ہوئے کافی عرصہ ہو جانے کے باوجود قوم نہیں بنتی۔ [3] حریص ہمیشہ ننانوے کے پھیر میں پڑے رہتے ہیں۔ ان کے سو کبھی پورے نہیں ہوتے۔ سو روپے جمع کر لینے کے بعد ان کو دو سو پورے کرنے کی فکر ہوتی ہے اور دو سو کے بعد تین سو کی۔ وعلیٰ ہذا۔

نہ علمِ دیں، نہ علمِ زمیں، بس فکرِ نانِ جویں

غرض اس سے نہیں مجھ کو بنی[1] ہے یہ زمیں کیونکر — یہ فرمائیں میسر آئے گی نانِ جویں کیونکر
یہی پرسش ہے ہر سُو آپ بی[2] اے ہیں کہ ایف اے ہیں — یہ ہے جب رنگ دنیا کا تو سیکھیں علمِ دیں کیونکر

(جَو کی روٹی)

دشمن کے ہاتھوں میں نہ کھیلو

جس بات کو مفید سمجھتے ہو خود کرو — اوروں پہ اس کا بار نہ اصرار سے دھرو
حالات مختلف ہیں ذرا سوچ لو یہ بات — دشمن تو چاہتے ہیں کہ آپس میں لڑ مرو

مشغلۂ یونیورسٹی

دستِ فلک سے ہند کی خلقت بہت پٹی — جو کچھ تھی اس کی عظمت و وقعت وہ سب ہٹی
اس کی دوا قناعت و نیکی ہے بس فقط — ہاں مشغلے کے واسطے ہو یونیورسٹی[3]

---

[1] مطلب یہ ہے کہ زمین کی بناوٹ یعنی طبقات الارض پڑھ بھی لیا اور کھانے کو روٹی میسر نہ آئی تو ایسے علم سے کیا فائدہ پہنچا۔ ضرورت پہلے ایسے علوم سیکھنے کی ہے جن سے کم از کم پیٹ تو بھرتا رہے۔ جو کی روٹی ہی سے سہی۔ [2] بی اے اور ایف۔ اے انگریزی تعلیم کی دو ڈگریوں کے نام ہیں سرکاری ملازمتوں کے حاصل کرنے کے لئے کسی نہ کسی انگریزی تعلیمی ڈگری کا حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اور دینی تعلیم کی اسناد کو ملازمت سرکاری میں کوئی وقعت نہیں دی جاتی۔ اس لئے ظاہر ہے کہ انگریزی تعلیم کو چھوڑ کر دینی تعلیم کی طرف کون توجہ کرے گا۔ [3] انگریزی لفظ University بمعنی دار العلوم مطلب یہ ہے کہ انقلابات زمانہ سے قوم کی جو عظمت و وقعت مٹ چکی ہے اس کا علاج تو بس اب یہی ہے کہ صبر و شکر سے کام لیا جائے اور نیکی کے دامن کو ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے۔ رہی انگریزی درسگاہیں اور یونیورسٹیاں اُن سے شاغل دنیاوی یعنی حصول معیشت میں مدد لی جا سکتی ہے۔

میل کی ضرورت نہیں

اس قوم کو یک دلی کی رغبت ہی نہیں
جو ایک کرے[۱] اُدھر طبیعت ہی نہیں

اکبر کہتا ہے میل رکھو باہم
وہ کہتے ہیں کہ میل کی ضرورت ہی نہیں

رسالے والوں کے دوالے

لے لے کے قلم کے لوگ بھالے نکلے
ہر سمت سے بیسیوں رسالے نکلے

افسوس کہ مفلسی نے چھاپا مارا
آخر احباب کے دوالے[۲] نکلے

خان بننا ہو تو انگریزی خواں بنو

اعزاز نسب کے مٹتے جاتے ہیں نشاں
اگلے سے خیال ہند میں اب وہ کہاں

سید بننا ہو تو بنو سر[۳] سید
ہونا ہو[۴] خان تو تم ہو انگریزی خواں

---

[۱] یعنی جو اتحاد و اتفاق کی تلقین کرے۔ [۲] دوالے نکلنا ایسے مفلس ہو جانے کو کہتے ہیں کہ آدمی اپنے سب قرض خواہوں کے قرضوں کا بھگتان نہ کر سکے۔ [۳] یعنی خالی سید ہونے کی آج کل کوئی قدر نہیں ہے جب تک کہ سید کے ساتھ سر کا بھی (جو انگریزی حکومت کا ایک بڑا خطاب ہے) اضافہ نہ ہو جائے۔ یعنی جب تک کہ سر سید احمد خاں صاحب مرحوم کی طرح ایک نجیب الطرفین سید بھی انگریزی خطاب یافتہ نہ ہو جائے۔ [۴] یعنی کسی پٹھان کی اپنے نام کے ساتھ خان لکھنے کی کوئی وقعت نہیں ہے جبکہ وہ انگریزی خواں یعنی انگریزی پڑھا ہوا نہ ہو۔ یا انگریزوں کی طرف سے اسے خان یا خان صاحب کا خطاب نہ مل جائے۔

آنر کے لئے زبان درازی بُری، روٹی کیلئے جائز

آنر[1] کے لئے زباں درازی ہے بری
روٹی نہ ملے تو غل مچانا جائز
اس وقت میں ہے یہی نصیحت اچھی
اس ساز پہ ہے یہی ترانا جائز

(اعزاز خطاب — باجہ — راگ)

سب کو نوکری نہیں مل سکتی

ہر ایک کو نوکری نہیں ملنے کی
ہر باغ میں یہ کلی نہیں کھلنے کی
کچھ پڑھ کے تو صنعت و زراعت کو دیکھ
عزت[2] کے لئے ہے کافی اے دل نیکی

صحت، روزی، اور تسکین دل

آپس میں موافق رہو طاقت ہے تو یہ ہے
دیکھو نہ بہم عیب[3] محبت ہے تو یہ ہے
صحت بھی ہو، روزی بھی ہو دل کو بھی ہو تسکین
دنیا میں بشر کے لئے نعمت ہے تو یہ ہے

---

[1] مطلب یہ ہے کہ آج کل کے ساز کے لئے موزوں راگ یعنی موجودہ زمانہ کا اقتضا یہ ہے کہ اگر انگریزی خطابات حاصل کرنے ہیں تو انگریزوں کی خوشامد کرنی چاہیئے اور اُن سے زبان درازی نہیں کرنی چاہیئے۔ البتہ روٹی نہ ملنے پر آجکل شورش اور ہڑتالیں کرنا اور غل مچانا جائز ہے کہ بغیر غل مچائے ہوئے تنخواہ وغیرہ بڑھانے کے مطالبے پورے نہیں ہوتے۔ [2] مطلب یہ ہے کہ ذریعہ معاش صرف سرکاری نوکری کو بنانا مناسب نہیں ہے۔ کیونکہ سرکاری نوکری ہر ایک کو نہیں مل سکتی۔ پڑھ لکھ کر دوسرے ذرائع معاش مثلاً صنعت و زراعت وغیرہ کی طرف بھی توجہ کرنی چاہیئے اور اگر نوکری عزت کیلئے کرنی ہے تو سب سے بڑی عزت تو آدمی کا نیک خصال نیک دل ہونا ہے اور یہی عزت اس کے لئے کافی ہے۔ [3] یعنی آپس میں ایک دوسرے کی عیب جوئی نہ کرو۔

اپنے ہی نفس کی غلامی

محسوس نہیں ہے اپنی خامی تم کو ۔۔۔ ہوتی ہے نصیب تلخ کامی (ناکامی و ناداری) تم کو

ہے[1] اپنے ہی نفس کی غلامی تم کو ۔۔۔ اغیار نہیں بنا سکے (کوتاہی و کمزوری) تم کو غلام

وسعتِ مشرب کے لئے تبدیلیٔ وضع ضروری نہیں

شامل اس میں غرض تھی بے شک سب کی ۔۔۔ رغبت جو دلائی وسعتِ[2] مشرب کی

ہے بعض کی بات اور اپنے ہی مطلب کی ۔۔۔ لیکن تبدیلِ وضع و نقلِ فاتح

شان و شوکت کی نہیں راحت کی ضرورت ہے

راحت ہو نصیب شان و شوکت نہ سہی ۔۔۔ روزی مل جائے مال و دولت نہ سہی

دربار[3] میں باہمی رقابت نہ سہی ۔۔۔ گھربار میں خوش رہیں عزیزوں کے ساتھ

---

[1] یعنی تمہاری غلامی میں غیروں کے جبر کو اتنا دخل نہیں ہے جتنا کہ خود تمہاری اپنی اخلاقی کمزوریوں اور ناجائز خواہشوں کو دخل ہے۔ اس لئے دراصل تم دوسروں کے نہیں بلکہ خود اپنے ہی نفس کے غلام ہو [2] مطلب یہ ہے کہ نئے قومی لیڈروں نے جو وسعت مشرب یعنی مذہبی فراخ دلی و بے تعصبی سے کام لینے کی ترغیب دی اس کی ضرورت تو انگریزوں کی حکومت میں ساری قوم کے لئے تھی۔ لیکن لباس و طرز رہائش وغیرہ میں اپنی وضع چھوڑ کر انگریزوں کی جو تقلید کی جا رہی ہے اس سے اگر کچھ نفع پہنچ سکتا ہے تو صرف ان ہی محدود سے چند لوگوں کو جن کا انگریزوں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے یا جن کو انگریزی ملازمت وغیرہ کی ضرورت ہے ساری قوم کیوں اس خبط میں مبتلا ہو رہی ہے۔ [3] مطلب یہ ہے کہ دربار یعنی انگریزوں کی مصاحبی اور اُن کے دربار میں کرسیاں حاصل کرنے میں شان و شوکت تو ضرور ہے مگر اس سے وہ دلی راحت میسر نہیں ہوتی جو عزیزوں کے ساتھ گھروں میں رہنے سے ہوتی ہے اس لئے کہ دربارداری اور مصاحبی میں ہر ایک دوسرے سے زیادہ عزت اور انگریزوں کا التفات حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور رشک و رقابت کا یہ جذبہ سب کو غیر مطمئن اور آزردہ رکھتا ہے۔

غذا میسر نہ ہو تو ٹانک بیکار ہے

کمیٹیوں سے نہ ہوگا کچھ بھی غرض اگر مشترک نہ ہوگی
خیالِ ملت نہ ہوگا جب تک مفید ہرگز یہ بک نہ ہوگی

دفتری بچی بلبلا

بہت بجا نوٹ لکھ گئے ہیں یہ اپنی پوتھی ہیں کھائی مانک[۱]
(یادداشت (انگریزی)) (کتاب (دستی بک))
غذا نہ ہوگی تو کیا جیوں گا دیا کرو تم ہزار ٹانک[۲]

ایک دوسرے کی توہین جہالت ہے یا نفسانیت

مذہب قانون قوم کا بانی ہے — خالص طاعت عروج روحانی ہے
توہین اک دوسرے کی کرتے ہیں جو لوگ — یہ جہل ہے یا ہوائے نفسانی ہے[۳]

---

۱ فرضی نام ہے۔

۲ لفظ انگریزی TONIC بمعنی دوائے مقوی۔ مطلب یہ ہے کہ زندگی محض مقوی دواؤں سے قائم نہیں رہ سکتی جب تک مناسب غذا بھی کھانے کو نہ ملے۔ اسی طرح جب تک کہ بہبودِ ملت کے مقصد میں جو قوم کے لئے بمنزلہ غذا کے ہے سب متحد نہ ہوں اس وقت تک کمیٹیوں میں بحث مباحثوں سے کوئی مفید نتیجہ نہیں نکل سکتا۔

۳ یعنی سچے مذہب سے جذبۂ مخالفت نہیں بلکہ جذبۂ طاعت پیدا ہوتا ہے اور جذبۂ طاعت سے روح ایسی بلند ہو جاتی ہے کہ وہ دوسروں کے عیوب کو نہیں بلکہ اُن کی خوبیوں کو دیکھا کرتی ہے۔ اس لئے مخالفوں کی توہین کرنے والے یا تو اپنے مذہب سے جاہل ہوتے ہیں یا بجائے روحانیت کے اپنے جذبات کی پیروی کرتے ہیں۔

سرکاری خطاب کی دل کشی

راجہ[1] صاحب کو خطاب سی[2]۔ ایس۔ آئی ہو گیا
مرتفع اب اور ہی اوج رسائی ہو گیا
(بلند)

راجہ صاحب میں ہے ایسی دل کشی اخلاق کی
جو ملا اُن سے یہ دل اُن کا فدائی ہو گیا

سب کچھ کرے مگر قوم کا ہمدرد رہے

جس سے جو بن پڑے وہی کام کرے
صاحب بنے کھلائے کھیلے آرام کرے

لیکن رہے قومی بھائیوں کا ہمدرد
ہر حال میں ادعائے اسلام کرے

اصلی آزادی

ہمدرد ہوں سب یہ لطف آبادی ہے
ہمسایہ بھی ہو شریک تب شادی ہے

تسکین ہے جب کہ ہو خدا پر تکیہ
(سکون و اطمینان) (بھروسہ)
قانون[3] بنا سکیں تب آزادی ہے

---

[1] راجہ صاحب سے مراد غالباً راجہ سر علی محمد خاں تعلقہ دار محمود آباد ہیں جن کا ذکر حضرت اکبر کے اور اشعار میں بھی ہے۔ [2] سی۔ ایس۔ آئی C.S.I انگریزی حکومت کا ایک بڑا خطاب تھا جو خاص کارگزاروں اور بڑے لوگوں کو دیا جاتا تھا۔ ممکن ہے کہ ان اشعار میں طنز نہ ہو بلکہ اظہار واقعہ ہو کہ جن راجہ صاحب کو خطاب ملا ہے وہ واقعی اس خطاب کے مستحق تھے۔ کیونکہ وہ ایسے خوش اخلاق ہیں کہ جو بھی اُن سے ملتا ہے اُن کا فریفتہ ہو جاتا ہے۔ اور طنز ہونے کی صورت میں اشعار کا مطلب یہ ہوگا کہ خطاب ملنے کے بعد راجہ صاحب کو چونکہ اور زیادہ عروج حاصل ہو گیا ہے اس لئے اُن سے ملنے والے خوشامد میں ان کی دل کشی اخلاق کے بہت مداح ہو گئے ہیں اور اپنے آپ کو ان کا فدائی بتلانے لگے ہیں۔ [3] یعنی اصلی آزادی یہ ہے کہ ہم اپنی ضرورتوں اور مصلحتوں کے مطابق ملکی قوانین خود بنا سکیں۔

خدا کی یاد، روٹی اور صفائی

کیا فرض ہے یہ کہ ہم ڈھٹائی (بے غیرتی، گستاخی) سے رہیں　　لازم کیا ہے، بلند ادائی (شان و شوکت) سے رہیں
کافی ہے خدا کی یاد اک گوشے میں　　روٹی مل جائے اور صفائی سے رہیں

دلِ مشرق کی بیتابی

میں ہوں یا آپ جنابِ بدھم[۱]!　　دنیا کی روش سے سب ہیں درہم برہم (پریشان خاطر)
بیتاب ہے زخم ہائے دل سے مشرق (علامہ مشرقی)　　یارب تری رحمتیں بنیں اب مرہم

تیری بھی کوئی صف ہے کہ نہیں

تجھ کو بھی جہاں میں کچھ شرف ہے کہ نہیں　　کوئی طاقت تری طرف ہے کہ نہیں
داخل ہے نمازیوں میں یا فوج میں ہے　　آخر تری بھی کوئی صف[۲] ہے کہ نہیں

۱؎ یہ خطاب حکیم بدہم صاحب مرحوم ایڈیٹر ہفتہ وار اخبار مشرق گورکھپور سے ہے۔ غالباً یہ رباعی اخبار مشرق ہی کے لئے لکھی گئی تھی۔

۲؎ صف بمعنی قطار۔ صف میں ہونے سے مراد کسی تنظیمی دستہ میں منسلک ہونا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم کو بھی کسی ایسی منظم جماعت یا گروہ میں شامل ہونا چاہیئے۔ جس سے تم میں اتحاد و یگانگت اور تنظیم و یک جہتی کی قوت پیدا ہو، اگر نماز کی صف بندی میں تم شامل نہ ہو۔ یعنی با جماعت نماز ادا نہ کرو تو کم از کم فوج کی صف بندی ہی میں شامل ہو جاؤ۔

قومی غیرت کی کمی

جس بات میں تم شکستِ (زوال۔ ہار) ملت سمجھو
اُس میں شرکت کو اپنی ذلت سمجھو

جو بندۂ نفس (اغراض نفسانی) ہو مخالف اِس کا
قومی غیرت کی اس میں قلت سمجھو

دھنی بننے کے لئے کمپنی بننے کی ضرورت

خواہش ہے اگر تجھے غنی بننے کی
دولت کی ہوس ہے اور دھنی (مال دار) بننے کی

شخصی حالت کو چھوڑ کر اے ہندی
کوشش لازم ہے کمپنی[۱] بننے کی

وضعِ مغربی میں بھی دل مشرقی رکھو

گو کہ رک سکتی نہیں نقلِ وضعِ مغربی
پھر بھی کامل طور پر ممکن نہیں ہم قالبی (ہم رنگی)

اپنی تاریخ اپنی ملت سے رہو تم باوفا
بندگی[۲] تم کو مبارک صاحبوں کو صاحبی

---

۱ لفظ انگریزی۔ Company یعنی جماعت بندی جو حصہ دار کسی تجارت کو اپنے مشترکہ سرمایہ سے چلاتے ہیں اُن کو مجموعی حیثیت سے کمپنی کہتے ہیں۔ آج کل تمام بڑی بڑی تجارتیں اور صنعتیں کمپنی کی ملکیت میں یعنی مشترکہ سرمایہ سے چل رہی ہیں اور ہر شخص کے علیحدہ علیحدہ تجارت کرنے سے عموماً وہ عظیم الشان منافعے حاصل نہیں ہوتے جو کمپنی بنا کر تجارت کرنے سے ہوتے ہیں۔ تجارت ہی میں نہیں بلکہ ہر اہم قومی مقصد میں جو کامیابیاں باہمی اشتراک و اتحاد سے کام کرنے میں ہوتی ہیں وہ انفرادی کوششوں سے نہیں ہوتیں۔ اس لئے حصول مقاصد میں سب کو کمپنی بننے یعنی مل جل کر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ۲ مطلب یہ ہے کہ تم انگریزوں کی حاکمی کو بس محکومی اور حاکمی ہی تک رہنے دو۔ اِس کی کوشش نہ کرو کہ وضع قطع میں انگریزوں کے ہمرنگ ہو جاؤ اور اپنی تاریخ اور اپنے مذہب سے روگردانی کرو۔

قانون سے فائدہ اٹھانیکے لئے وفاداری کی ضرورت

پابند اگرچہ اپنی خواہش کے رہو — لائل سبجکٹ[1] تم برٹش کے رہو
قانون سے فائدہ اٹھانا ہے اگر[2] — حامی نہ کسی خراب سازش کے رہو

پڑے رہو توکل بخدا

صاحب سے رُکے تو راتوں کو ترسے — شوکت[3] سے اگر پھرے تو لعنت برسے
بہتر ہے پڑا رہے توکل[4] بخدا — باہر رکھے قدم نہ اپنے گھر[5] سے

جنگ کا نہیں بھنگ کا خیال

گفتم[6] ایراں را سرِ جنگ نہ ماند — آں مردی و آں ہوا و آں رنگ نہ ماند
آغا خند و گفت رنجے دگر است — کامروز برائے ساغرِ ~~شہرت~~ بنگ نہ ماند

لہ Loyal British Subject انگریزی الفاظ ہیں یعنی وفادار رعایا۔ لہ یعنی اگر امن و امان سے رہنا چاہتے ہو تو حاکم وقت کے قوانین کی پابندی کرو اور کسی باغیانہ سازش و شورش میں شریک نہ ہو۔ سلہ شوکت سے مولانا شوکت علی تحریک خلافت کے لیڈر مراد ہیں۔ کلہ توکل بخدا بمعنی خدا پر بھروسہ کئے ہوئے ہ مطلب یہ ہے کہ سکون و عافیت کی زندگی بسر کرنا چاہتے تو اس امید پر کہ خدا کوئی نہ کوئی بہتری کی صورت پیدا کرے گا۔ خاموشی سے گھر میں بیٹھے رہو سیاسی تحریکوں میں حصہ لینے کی صورت میں اگر انگریزوں سے ترک موالات کروگے تو مصائب میں مبتلا ہو جاؤگے۔ اور اگر قومی لیڈروں کی مخالفت کروگے تو قومی لعنت ملامت کے ہدف بنوگے۔ لہ ترجمہ ۔ میں نے کہا ایران کو جنگ سے کچھ

(باقی صفحہ ۱۷۷ پر)

جاہ اور شاہ کے خواہاں

بیخود ہیں وہ جو دل سے ہیں اللہ کے خواہاں ۔۔۔ ہیں مست نگاہِ بتِ دل خواہ کے خواہاں
آسودہ ہیں علم و ہنر و فن میں جو ہیں محو ۔۔۔ چکر[1] میں ہیں بس جاہ کے اور شاہ کے خواہاں

دل کی پھانسیں

مشکل سے یہ حالتیں سہی جاتی ہیں ۔۔۔ پھانسیں ہیں کہ قلب میں رہی جاتی ہیں
تفصیل نہ پوچھ ہیں اشارے کافی ۔۔۔ یونہیں[2] یہ کہانیاں کہی جاتی ہیں

زمینداروں کی محتاجی

محتاجِ درِ وکیل و مختار ہیں آپ ۔۔۔ سارے عملوں کے ناز بردار ہیں آپ

(صفحہ ۱۷۶ کا بقیہ فٹ نوٹ) دلچسپی نہیں رہی۔ اور ایران کی بہادری اور جنگجویانہ شہرت و روایات ختم ہو گئیں۔ آغا (باشندۂ ایران) یہ سنکر ہنسا اور بولا مجھے ان باتوں پر تو نہیں مگر ایک اور بات کا افسوس ہے اور وہ یہ ہے کہ میرے پیالہ کے لئے آج بھنگ نہیں رہی۔ مطلب یہ ہے کہ ایرانیوں پر نفس پرستی و عیش کوشی اس قدر غالب ہو گئی ہے کہ وہ اپنی قدیم خصوصیات و روایات کے مٹنے پر ماتم کرنے کی بجائے حظ نفس کے سامان مثلاً بھنگ وغیرہ کے نہ ملنے پر افسوس کرتے ہیں۔ حضرت اکبر کے زمانہ میں ایران کا ایسا ہی حال ہو گیا تھا۔ [1] مطلب یہ ہے کہ خدا پرست خدا پرستی میں، محب اپنے محبوب کے عشق میں اور دل دادگان علم و فن اپنے علم و ہنر میں محو و مشغول ہیں۔ مگر جو دنیاوی عزت و جاہ اور حکام رسی کے جو ہیں وہ دن رات اسی چکر میں سرگرداں و پریشان رہتے ہیں [2] کہانیوں سے یہاں مراد حکام وقت کے مظالم کی کہانیاں ہیں جن کی پھانسیں یعنی تکلیف وہ یادیں ہر وقت دل

میں کھٹکتی رہتی ہیں اور جن کو صاف طور پر زبان پر نہیں لایا جا سکتا۔

آوارہ و منتشر ہیں مانندِ غبار   معلوم ہوا مجھے کہ زمیندار ہیں آپ[1]

پیر ہمیر ہونا آسان، علی برادر ہونا مشکل

کچھ سہل نہیں علی برادر[2] ہونا   دشوار ہے مستحق آنر ہوتا

آسان ہو پیر اور ہمیبر[3] ہونا   ہاں سب یہ دعا کریں کہ ان بندوں کو

چپ رہنے والا گردن زدنی، بولنے والا کافر

جانِ بُل[4] کا حال ظاہر ہو گیا   شیخ جی کا وقت آخر ہو گیا

اور جو بولا وہ کافر ہو گیا   کیا تماشا ہے کہ چُپ[5] مارا گیا

خاموش رہنے والا

[1] مطلب یہ ہے کہ آج کل کے زمینداروں کی حالت ایسی خراب ہے کہ دن رات اُنہیں کچہریوں کی خاک چھاننی، وکیلوں اور مختاروں کی خوشامدیں کرنی اور سرکاری دفتروں کے سب ملازموں کی ناز برداریاں کرنی پڑتی ہیں [2] تحریک خلافت کے مشہور لیڈران مولانا شوکت علی مرحوم اور مولانا محمد علی مرحوم کو جو دونوں حقیقی بھائی تھے اور خلافتی تحریک کے زمانہ میں جن کا طوطی بول رہا تھا انگریزی اخبارات میں علی برادر یا علی برادران لکھا جاتا تھا۔ پھر علی برادران کا لقب ان دونوں بھائیوں کے لیے مخصوص ہو گیا۔ [3] مطلب یہ ہے کہ حکام رسی کے ذریعہ سے خطابات کا حاصل کرنا بھی دشوار ہے اور قومی لیڈری کے ذریعہ سے علی برادران کی جیسی عزت حاصل کرنا بھی۔ البتہ اس زمانہ میں غلامانِ حکومت انگریزی کے لئے پیر یا پیمبر بن جانا (یعنی دعوائے نبوت کر دینا) زیادہ آسان ہے۔ لہذا جو بڑا بننا چاہتے ہیں اُن کے لیے ہم سب کو پیر یا پیمبر بننے کی دعا کرنی چاہیئے۔ [4] JOHN BULL سے مراد انگریزی قوم ہے [5] یعنی تجربہ سے انگریزی قوم کی یہ عجیب خصوصیت ظاہر ہوتی ہے کہ جو لوگ

(باقی صفحہ ۱۷۹ پر)

دھوتی کی شکن اور پتلون کا بٹن

خوش آیا آپ کو دھوتی میں پُر شکن[1] رہنا
ہمیں پسند ہے پتلون کا بٹن[2] رہنا

رہیں[3] ہنود کی باتیں سوا اس میں فرق نہیں
نصیب دونوں کو ہے صدرِ انجمن رہنا

ہوائیں پھر وہی ہوں اور وہی امن

دھرم کی رکھ لے اے بھگوان تو لاج (عزّت)
ہمارا ہند ہو دنیا کا سرتاج

ہوائیں پھر وہی ہوں اور وہی امن
وہی گائیں وہی بنسی[4] (بانسری۔ نے) وہی راج

(صفحہ ۱۷۸ کا بقیہ فٹ نوٹ) اپنی تکلیفوں اور شکایتوں کو زبان پر نہیں لاتے اور منہ سیئے رہتے ہیں اُن کی تو کوئی دادرسی نہیں ہوتی اور جو حکومت کی زیادتیوں اور بے انصافیوں کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں اُن کو کافر یعنی باغی و سرکش قرار دیدیا جاتا ہے۔ اس لئے شیخ جی یعنی پرانے ٹائپ کے مسلمانوں کا ایسے حالات میں زندہ رہنا اور عافیت سے گزارہ کرنا ناممکن ہو گیا ہے۔

[1] دھوتی ہندوؤں کا پہناوا ہے اور وہ اس طرح ڈھیلی ڈھالی باندھی جاتی ہے کہ کپڑے میں شکنیں اور سلوٹیں پڑی رہتی ہیں۔ دھوتی کے پہناوے سے ہندوؤں کے اس کیرکٹر پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ وہ بہت زیادہ کھنچے اور تنے ہوئے نہیں رہتے یعنی اُن میں شیخت و تمکنت زیادہ نہیں ہوتی اور وہ حسب ضرورت پھیل بھی جاتے اور سمٹ بھی جاتے ہیں یعنی نرمی کے موقع پر نرم اور سختی کے موقع پر سخت ہو جاتے ہیں [2] پتلون انگریزوں کا پہناوا اور ایک چُست لباس ہے۔ باوجود چستی کے اس کا کپڑا تو جگہ سے بے جگہ ہو سکتا ہے مگر بٹن اس کا جہاں لگا ہوتا ہے وہیں رہتا ہے۔ اس لئے پتلون کا بٹن رہنے سے مراد ہے اپنی روش پر سختی سے قایم رہنا اور اُس سے ٹس سے مس نہ ہونا [3] مطلب یہ ہے کہ ہندو مسلمانوں کے کیرکٹر میں اگرچہ کافی فرق ہے۔ ایک کو موم کی ناک کی طرح توڑا مروڑا جا سکتا ہے دوسرے کو اپنے موقف سے ہٹانا آسان نہیں ہوتا۔ لیکن اس اختلاف کیرکٹر سے ظاہری اعزازوں میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ قومی انجمنوں کی صدارتیں ہندو بھی کرتے ہیں اور مسلمان بھی۔ [4] اس مصرع میں اشارہ ہے ہندوؤں کے مشہور اوتار کرشن جی کے زمانہ کی طرف۔ کرشن جی گائیں چرایا کرتے اور بڑی

دل کش بنسی یا بانسری بجایا کرتے تھے۔ یہاں وہی بنسی اور وہی گائیں مراد ہیں۔

خطاب پر سب کچھ واپس

مذہب واپس، خیالِ جنت واپس
مسجد کا وہ حق، وہ نذر و دعوت واپس

حضرت نے یہ صاف کہہ دیا سب کر ہیں
کرنے کا نہیں خطاب و خلعت واپس[۱]

پنجاب کا بلوا بھی بُرا علی گڑھ کا حلوا بھی

میرے نزدیک یہ پنجاب کا بلوا بھی بُرا[۲]
ساتھ ہی اس کے علی گڑھ کا یہ حلوا بھی بُرا[۳]

آپ اظہارِ وفا کیجئے تمکین کے ساتھ
لیٹ جانا بھی بُرا ناز کا جلوا بھی بُرا

---

[۱] آزادی ہند کی تحریکوں کے سلسلہ میں ایک تحریک یہ بھی شروع ہوئی تھی کہ انگریزوں کے دیئے ہوئے خطابات و اعزازات واپس کر دیئے جائیں۔ بہت سے وطن دوستوں نے اپنے خطابات واپس کر دیئے۔ مگر کچھ انگریز پرست طبقۂ علما رتک میں ایسے تھے جنہوں نے ہر قسم کے نقصانات برداشت کرنے گوارا کر لیئے مگر خطابات واپس نہیں کئے یہاں ایسے ہی لوگ مراد ہیں۔

[۲] و [۳] رولٹ ایکٹ کے خلاف ایجی ٹیشن کے سلسلہ میں پنجاب میں انگریزی حکومت کے خلاف ایک بڑا فساد یا بلوا ہو گیا تھا۔ حضرت اکبر حکومت کے خلاف اس قسم کے بلوؤں کو بھی ناپسند کرتے ہیں۔ اور علی گڑھ سے تعلق رکھنے والوں کی حکومت پرستی و امن پسندی کو بھی وہ کہتے ہیں۔ نہ تو اتنی خوشامد اچھی کہ حکومت کی نظر میں وقعت نہ رہے اور نہ ایسی نازیبا حرکتیں کرنی جنہیں حکومت برداشت نہ کر سکے۔

شملہ کا طُرّہ

اُپج ہے یہ رئیسوں کی ترانہ ہے نہ عملے کا
نہ یہ پودا ہے گلشن کا نہ یہ بوٹا ہے گملے کا
ہمارے حضرت شیخ مہذب کی ذہانت ہے
خدا اس میں چمک دے یہ بھی اک طرّہ ہے شملے کا[۲]

یہی غنیمت ہے کہ کھلنے کو مل رہا ہے

سچ ہے اُنہوں نے ملک لے رکھا ہے
ہم لوگوں سے کیمپ[۳] کو پرے رکھا ہے
لیکن ہے ادائے شکر ہم پر لازم
کھانے بھر کو ہمیں بھی دے رکھا ہے

---

[۱] یہ اشعار مسلمانوں کے اس ڈیپوٹیشن یا نمائندہ وفد کے متعلق ہیں جو شملہ ڈیپوٹیشن کے نام سے مشہور ہے اور جسے ۱۹۰۶ء میں نواب محسن الملک مرحوم بسرکردگی سر آغا خاں لارڈ منٹو وائسرائے ہند کے پاس شملہ لے کر گئے تھے اور جس نے دیگر رسے سے مسلمانوں کے سیاسی اور ملازمتی حقوق کے تحفظ کا مطالبہ کیا تھا۔ اس ڈیپوٹیشن کی شملہ سے واپسی کے بعد ہی مسلم لیگ کی داغ بیل پڑنی شروع ہو گئی تھی۔ حضرت اکبر کے نزدیک اس ڈیپوٹیشن کے شملہ لیجانے کا خیال چند با اثر متمول مسلمانوں کے دماغ میں پیدا کرایا گیا تھا۔ عام مسلمانوں کی ضروریات اس ڈیپوٹیشن کے بھیجنے کی محرک نہیں ہوئی تھیں اور نہ سرکاری ملازمین کی شکایات "گلشن کا پودا اور گملے کا بوٹا نہ ہونے" کا مطلب یہی ہے کہ جس طرح زمین یا گملے میں سے پودے قدرتی اثرات کے ماتحت پیدا ہوتے ہیں۔ شملہ ڈیپوٹیشن عام مسلمانوں کی شکایات و ضروریات کی ایسی قدرتی پیداوار نہیں تھا بلکہ اس میں مہذب لیڈران قوم کی ذہانت و اعزاز طلبی کا بہت زیادہ دخل تھا۔

[۲] شملہ ہندوستان کے گرمائی دارالحکومت کا نام ہے اور شملہ پگڑی کو بھی کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مسلم ڈیپوٹیشن کا شملہ لیجانا بھی ہمارے لیڈروں کی پگڑی کا ایک طرّہ یعنی حکومت کی نظروں میں معزز ہونے کا ایک ذریعہ ہے۔ [۳] camp کے لفظی

معنی ہیں فوجوں کی قیامگاہ۔ یہاں حکومت کے وہ مخصوص ادارے مراد ہیں جن میں ہندوستانیوں کو جگہ نہیں دی جاتی یا گورا فوجوں (باقی صفحہ ۱۸۲)

فیس اور ٹیکس کا خوف

سکۂ[1] زر بابوئے در دھوتی زرتار داشت ۔ باوجودش نالہائے زار در اخبار داشت
(لفظ ہندی — یعنی)
گفتمش در عین وصل این نالہ و فریاد چیست ۔ گفت مارا خوف فیس و ٹیکس در این کار داشت
(کی فیسیں، محصول عدالتوں اور ٹیکسوں)

چندہ اور مرد آخر بیں

در[2] پس ہر گریہ آخر خندہ ایست ۔ بعد ہر اسپیچ آخر چندہ ایست
یاد دار این قول مولانائے روم ۔ مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست

(صفحہ ۱۸۱ کا بقیہ فٹ نوٹ) کے کیمپ مراد ہیں، جہاں سپاہیوں کو بھی بہت اچھا راشن دیا جاتا ہے اور ہندوستانیوں سے بالکل الگ رکھا جاتا ہے۔

[1] ترجمہ:۔ ایک بابو نے اپنی سنہری تاروں سے بنی ہوئی یعنی جھمکی کی دھوتی میں ایک سونے کا سکہ رکھ چھوڑا تھا۔ اس کے باوجود وہ اخباروں میں (اپنی مفلسی و ناداری کا) رونا رویا کرتا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ سونے کا سکہ موجود ہونے پر بھی تم یہ رونا کیوں روتے ہو۔ اس نے جواب دیا کہ فیسوں اور محصولوں کے ڈر سے ایسا کرتا ہوں۔ یعنی اس اندیشہ سے کہ جو کچھ پاس ہے کہیں وہ بھی فیسوں اور ٹیکسوں کی نذر نہ ہو جائے۔ حضرت اکبر نے یہ اشعار کسی مشہور فارسی شاعر کے ان شعروں میں تصرف کر کے لکھے ہیں ۔

بلبلے برگ گل خوش رنگ در منقار داشت ۔ واندراں برگ و نوا خوش نالہ ہائے زار داشت
گفتمش در عین وصل این نالہ و فریاد چیست ۔ گفت مارا جلوۂ معشوق در این کار داشت

[2] ترجمہ:۔ ہر رونے کا انجام ہنسنے پر ہوتا ہے۔ ہر تقریر کا خاتمہ چندہ طلبی پر ہوتا ہے۔ مولانائے روم کا یہ قول یاد رکھو۔ انجام پر نظر رکھنے والا آدمی خوش نصیب ہوتا ہے۔

مولانا کو مات اور مسٹر کو مساوات

عالِم بنئے تو کیجئے ماتؔ[1] کا شوق | مسٹر بنئے تو ہو مساوات کا شوق
چکر ہی میں آپ کو پھنسا رکھوں گا | مجھ کو بھی ہوا ہے اب اسی بات کا شوق

(مات = شکست دینا، مساوات = ہمسری)

زر اُن کا، زور اُن کا، علم و حکومت اُن کی

یہی فتوا ہے نیچر ہے کہ ہم بھی ہو رہیں اُن کے
زر اُن کا، زور اُن کا، علم اُن کا سلطنت اُن کی[2]
ملائیں[3] کس طرح سُر صدر پر نزلہ ہے مذہب کا
بہت اونچے سُروں میں بج رہی ہے اب تو گت اُن کی
مگر قومی اطبا دور ہی کر دیں گے[4] یہ نزلہ
قومی اطفال کو کر دے گی آخر تربیت اُن کی

(صدر = سینہ، گت = گانے کی دھن، اطبا = لیڈران قوم)

---

[1] یعنی عالموں کو تو اس کا شوق ہے کہ اپنے مخالفوں کو بحث مباحثہ میں ہرائیں۔ اور مسٹروں یعنی نئے تعلیم یافتوں کو اس کا شوق ہے کہ وہ انگریزوں کے مساوی ہوں۔ وہ بھی چکر میں ہیں اور یہ بھی۔ [2] یعنی لوگوں کا خیال ہے کہ ساری طاقتیں انگریزوں کے ہاتھ میں ہیں تو مقتضائے وقت یہی ہے کہ ہم بھی اُن کے ہو جائیں یعنی اپنی قسمت کو اُن کے حوالہ کر دیں۔ [3] یعنی مقلدین مغرب تو بہت تیزی سے لامذہبی کی طرف جا رہے ہیں ہم اُن کا ساتھ نہیں دے سکتے کہ ہمارے اندر ابھی تک مذہب کا اثر موجود ہے [4] یعنی نئے لیڈران قوم کی تربیت سے مذہب کا بچا کھچا اثر بھی بچوں کے دل سے نکل جائے گا۔ اور نئی پود تقلید مغرب میں کسی سے پیچھے نہیں رہے گی۔

پریوں کا عشق اور جنات کی غلامی

تھا شوق[1] ادائے طلب اک حسن کے ساتھ — اکبر نے جو فکر کی تو وہ بات بنی
دیوانہ تھی قوم عشق میں پریوں (حسین عورتیں) کے — پکڑی گئی اور غلام جنات (مراد انگریز ہیں) بنی

محنت، ہمت، حکمت اور قسمت

حاصل[2] ہو کچھ معاش یہ محنت کی بات ہے — لیکن سرورِ قلب یہ قسمت کی بات ہے
آپس کی واہ واہ لیاقت کی بات ہے — سرکار کی قبول یہ حکمت کی بات ہے
بی۔ اے بھی پاس ہوں ملے بی۔ بی بھی دل پسند — محنت کی ہے وہ بات (یعنی بی۔ اے پاس کرنا) یہ قسمت کی بات ہے (یعنی پسندیدہ بی بی کا ملنا)

تہذیب[3] مغربی میں ہے بوسے تلک معاف
اس سے اگر بڑھو تو شرارت کی بات ہے

شیخ کا مصلّےٰ اور شاعر کی اُردوئے معلّےٰ

پہلے تھا قوم میں سب کچھ مگر اب کچھ نہ رہا — کسی شاعر نے ہے واللہ یہ کیا خوب کہا
شیخ کے پاس ہے اب صرف مصلّےٰ (جانماز) باقی — اور مرے پاس ہے اُردوئے معلّےٰ (اردو فصیح و مستند) باقی

---

[1] مطلب یہ ہے کہ قوم عیش و عیاشی میں پڑ کر حکمرانی کی صلاحیتیں کھو چکی تھی۔ انگریزوں نے اس کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھایا اور اس کو اپنا غلام بنالیا۔ یعنی حکومت انگریزوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ [2] یعنی روزی تو محنت سے مل جاتی ہے مگر دلی مسرت قسمت ہی سے ملتی ہے۔

[3] انگریزی ETIQUETE ایٹی کیٹ یعنی آداب معاشرت میں بے تکلف غیر عورتوں کے بوسے لے لیتے ہیں تو کوئی مضائقہ نہیں ہے لیکن اس سے آگے دست درازی کرنا بد تہذیبی ہی نہیں بلکہ شرارت و بد معاشی سمجھا جاتا ہے۔

غیبت اور بدگمانی میں محبت کیسے قائم رہے

حدیثِ قوموں کی قسمت کی کیا کرتا ہے یہ قائم
زمانہ دیکھ کر چلئے طریقِ زندگانی میں[1]

محبت کس طرح اس قوم میں باہم رہے قائم
زمانہ صرفِ غیبت ہو، ڈوبے بدگمانی میں

نئی تحریکوں سے دنیا کی بے چینی

ان تحریکوں سے یوں رہتی ہے دنیا بے چین
جس طرح پیٹ میں بیمار کے بائی دوڑے

ممبری کے لئے لپکا مری جانب وہ غول
گائے موٹی نظر آئی تو قصائی دوڑے[2]

قوم کو قوت کی ضرورت ہے، فربہی کی نہیں

ملتا نہیں گھی تو خشک روٹی ہی سہی
نعمت جو بڑی نہیں چھوٹی ہی سہی

میں قوم کی فربہی[3] کا مشتاق نہیں
بس چاہیئے میری عقل[4] موٹی ہی سہی

---

[1] مطلب یہ ہے کہ قومی فلاح و بہبود میں رفتار زمانہ کو بہت بڑا دخل ہوتا ہے اور قومی زندگی کو اسی رُخ پر چلنا پڑتا ہے جس رخ پر کہ زمانہ چلتا ہے اس لئے کسی قومی شاہراہ عمل کے متعین کرنے کے لئے یہ دیکھنا بھی ضروری ہوتا ہے کہ زمانہ کا رنگ کیا ہے۔ مثلاً اس زمانہ میں جبکہ غیبت و بدگمانی کا مرض عام ہے یہ امید رکھنا کہ افراد قوم میں محبت و یگانگت قائم ہو جائیگی اور اس امید پر کوئی قومی لائحہ عمل تجویز کرنا محض بے نتیجہ و بے سود ثابت ہوگا۔

[2] یعنی جس طرح موٹی گایوں کے حاصل کرنے کے لئے قصائی دوڑا کرتے ہیں اور حاصل کرنے کے بعد پھر اُن ہی گایوں کو ذبح کر کے اُن سے فائدہ اُٹھاتے ہیں اسی طرح امیدواران ممبری پہلے تو ان لوگوں کی جن سے ووٹ لینے ہوتے ہیں ہر طرح کی خوشامد کر کے ان کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کرتے ہیں اور ممبر ہو جانے کے بعد ان ہی رائے دہندوں کے گلوں پر چھری پھیرتے اور اپنے فائدہ کے لئے ان کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ [3] فربہی ایسے مٹاپے کو کہتے ہیں جو چربی کی زیادتی کی وجہ سے ہو اور جس سے بدن کی قوت و چستی میں کمی آ جائے ایسا مٹاپا کبھی زندگی کے لئے مفید نہیں ہوتا اور اس سے عمر بھی کم ہو جاتی ہے۔ قوم کی فربہی سے مراد قوم کی ایسی ظاہری ترقیاں ہیں جن سے قومی زندگی میں کمزوری پیدا ہو۔ [4] عقل موٹی ہونا یعنی کم عقل و کم فہم ہونا مطلب یہ ہے کہ خواہ اسے میری کم عقلی پر محمول کیا جائے مگر میری رائے یہی ہے کہ قوم کا فربہ ہونا یعنی نمایشی اسباب تعیش و راحت کے حاصل ہو جانے کو قومی ترقی سمجھنا اچھا نہیں ہے موٹی عقل کی کمزوری کو سب جانتے ہیں مگر یہ قوم کا کمزوری[5] کے دعوے کے ساتھ طنزاً ذکر کرنا خاص ادبی لطف اپنے اندر رکھتا ہے۔

لفظی اور بے معنی قومیت

روح پرور نہ سہی نشہ ذرا تیز تو ہے ۔۔۔ نوجوانوں کے لئے ولولہ انگیز تو ہے
نہ سہی معنیٔ قومی فقط الفاظ سہی ۔۔۔ چند احباب کا اک شغلِ دلآویز تو ہے

بے قوام کی قوم

معما[1] بنے ہوئے ہیں پڑے ہیں ہمارے اہلِ وطن ۔۔۔ کہ قوم کے لئے مذہب کا کوئی کام نہیں
قوام[2] قوم کا مذہب ہی ہے زمانے میں ۔۔۔ کہاں کی قوم جب اس کا کوئی قوام نہیں

عہدوں سے قوم نہیں بنتی

دم تم میں ہے خدا ہی کی حمد و سپاس سے ۔۔۔ دینِ خدا جدا نہ کرو اپنے پاس سے

---

[1] مطلب یہ ہے کہ آج کل کے لیڈران قوم جو اصلاح قوم اصلاح قوم کا غل مچا رہے ہیں یہ محض الفاظ ہیں جن کے کوئی معنی پیش نظر نہیں ہیں یعنی ان لیڈروں کا مقصد قوم کے لئے کوئی ٹھوس کام کرنا اور قوم کو معتدبہ فائدہ پہنچانا نہیں ہے۔ البتہ یہ اصلاحی غل شور قوم کا ایک دلچسپ مشغلہ ہو گیا ہے۔ جس سے اگرچہ قوم کی بنیادیں مضبوط ہونے کی کوئی امید نہیں ہے مگر نوجوانوں میں اس سے کچھ جوش و خروش پیدا ہو جاتا ہے۔

[2] قوام دار و مدار یا اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی چیز کے قیام یعنی بننے اور قائم رہنے کا باعث ہو۔ مطلب یہ ہے کہ قوم مذہب ہی کے سانچے میں ڈھلتی اور مذہب ہی کے رشتہ سے اُس کا شیرازہ بندھا رہتا ہے۔ جب مذہب ہی نہیں رہا تو قوم کیسے بنے گی اور کیسے قائم رہے گی۔

عہدے جو سو پچاس کو اچھے ملے تو کیا ۔۔۔ قائم نہ ہو گی قوم کبھی سو پچاس[1] سے

قومی عزت و آسودگی کیوں کر حاصل ہو

جن[2] بزرگوں کی طلب صادق و دیرینہ ہے ۔۔۔ اُن کو الطافِ گورنمنٹ کا گنجینہ ہے

جن[3] بزرگوں کو نئی راہ میں ہے سعی کا شوق ۔۔۔ قوم سے اُن کو بلا واسطہ لینے کا ہے شوق

دونوں راہوں میں ہے عزت بھی پَر کاکت بھی ہے ۔۔۔ موقعِ مدح بھی ہے وجہ شکایت بھی ہے

مستند دونوں ہیں ہو چال جو اعزاز کے ساتھ ۔۔۔ دونوں رہ سکتے ہیں آسودگیٔ ناز کے ساتھ

نہ اُچھل[4] کود کا حاصل نہ تملّق کا اثر ۔۔۔ بجز اس کے کہ گھٹو زور میں باہم لڑ کر

خوب[5] ہے وہ جو قناعت کی طرف سالک ہے ۔۔۔ کس مپرسی ہے تو ہو اس کا خدا مالک ہے

امرِ طاعت ہی ہے اللہ کے پیاروں کے لئے ۔۔۔ ماسوا اس کے جو ہے شغل ہے یاروں کیلئے

طلبِ رزق ضروری ہے تو مجبوری ہے ۔۔۔ اس سے آگے ہے جو کچھ اس سے مجھے دوری ہے

---

[1] یعنی سو پچاس آدمیوں کو عہدے مل جانے سے تو قوم قائم نہیں رہ سکتی۔

[2] یعنی سچے خیر خواہان حکومت کو حکومت کی عنایتوں سے فائدہ پہنچتا ہے [3] یعنی جن لوگوں نے قومی لیڈری کا راستہ اختیار کیا ہے اُن کو قوم سے چندے ملتے ہیں [4] اُچھل کود سے مراد قومی لیڈری ہے اور تملق سے انگریزوں کی خوشامد مطلب یہ ہے کہ قومی لیڈری ہو یا انگریزوں کی خیر خواہی دونوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ باہمی مخالفتیں پیدا ہو جاتی ہیں اور آپس میں لڑنے سے قومی قوت کمزور ہوتی ہے۔ [5] یعنی سب سے اچھا یہ ہے کہ آدمی عزت و دولت کی حرص و ہوس کو چھوڑ کر صبر و قناعت سے بیٹھا رہے۔ اور کوئی پرسان حال نہ بھی ہو تو خدا پر بھروسہ رکھے

ہم نشیں جب مرے ایام بھلے آئیں گے
بن بلائے مرے وہ آپ چلے آئیں گے[1]

سب کچھ خدا کا وہم و گماں ہمارا

کالج میں ہو چکا جب یہ امتحاں ہمارا
سیکھا زباں سے کہنا، ہندوستاں ہمارا[2]

رقیب کو کم سمجھ کر اکبر یہ بول اُٹھے
ہندوستان کیسا سارا جہاں ہمارا[3]

لیکن یہ سب غلط ہے کہنا یہی ہے لازم
(مستغنین)
جو کچھ ہے سب خدا کا وہم و گماں ہمارا[4]

جنہیں زور نہیں اُن کا ماٰمن گور ہے

دنیا میں ضرورت زور کی ہے اور آپ میں مطلق زور نہیں
یہ صورتِ حال رہی قائم تو من کی جاجز گور نہیں[5]

تاریخ ہم اپنی جانتے ہیں اور آپ کو بھی پہچانتے ہیں
کب آپ کی باتیں مانتے ہیں کچھ فہم تو ہے گو زور نہیں

اے بھائیو بابو صاحب سے کھنچنے کا نہیں ہے کوئی محل
(مراد ہندو ہیں۔)
گو نسل علاء الدین میں ہو سکن تو تمہارا غور نہیں[6]

[illegible]

---

[1] یعنی جب زمانہ موافق ہوگا تو مقاصد خود بخود پورے ہو جائیں گے [2] اشارہ ہے علامہ اقبالؒ کے مشہور قومی ترانہ "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کی طرف۔ مطلب یہ ہے کہ انگریزی تعلیم دلوں میں رچ جانے کے بعد ہندوستانیوں میں یہ احساس پیدا ہونے لگا کہ ہندوستان تو ہمارا ہے، اس پر غیروں کی حکومت کیوں ہے۔ [3] حضرت اقبالؒ کا ایک اور مشہور اسلامی ترانہ ہے جس کا پہلا شعر ہے — چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا — مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا۔ مطلب یہ ہے کہ مسلمان بلند کی پرواز خیال نے اور ترقی کی وہ ہندوستان ہی کو نہیں سارے جہان کو اپنا بتانے لگے۔ [4] حضرت اکبر کے نزدیک نہ تو یہ کہنا ٹھیک ہے کہ ہندوستان ہمارا، اور نہ یہ کہنا ٹھیک کہ سارا جہاں ہمارا، بلکہ کہنا یہ چاہیے کہ سب کچھ خدا کا ہے یہ محض ہمارا وہم و گمان ہے کہ یہ ہمارا ہے اور وہ ہمارا ہے۔ علامہ اقبالؒ کے مذکورہ ترانوں میں بھی ہندوستاں ہمارا، اور سارا جہاں ہمارا، ان معنوں میں نہیں کہا گیا ہے کہ ہم ہندوستان کے یا سارے جہان کے مالک ہیں بلکہ علامہ مرحوم نے ہمارا کا لفظ اسی قومی یا مذہبی تعلق کی بنا پر لکھا ہے جو ہندوستانیوں کو ہندوستان اور مسلمانوں کو رحمۃ للعالمین کی امت ہونے کی حیثیت سے سارے جہان کے ساتھ ہے۔ [5] مطلب یہ ہے کہ اس زمانہ میں کمزور ہمیشہ تکالیف و مصائب کا شکار رہتے ہیں اور امن ان کو قبر میں پہنچنے ہی کے بعد ہی نصیب ہوتا ہے۔ [6] علاء الدین غوری ہندوستان کا ایک بادشاہ ہوا ہے مطلب

یہ ہے کہ جو مسلمان ان بادشاہوں کی نسل میں ہیں جو غیر ممالک سے آ کر یہاں بسنے والے تھے ان کو بھی ہندوؤں سے کشیدہ رہنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کیونکہ وہ غیر ملکی بادشاہوں کی نسل میں ہیں تو ہوں، وطن تو اُن کا بھی اب ہندوستان ہی ہے۔

طنزیات

جس کی لاٹھی اُس کی بھینس

کیسی ترقی کیسا میل　　ہم سے سن لو اس کا کھیل
جس کی لاٹھی اُس کی بھینس　　فعلن[۱]، فعلن، فعلن، فعلن

بیوی راضی ہوں اور کلکٹر صاحب

ہر ایک کو خوش کروں میں کیوں کر صاحب　　اپنے ہی طرف بلاتے ہیں ہر صاحب
آسایش عمر کے لئے کافی ہے　　بی بی راضی ہوں اور کلکٹر صاحب

ہر مسلک میں ایک پخ

سیّد کی طرف تو چندہ لانے کی ہے پخ　　اور شیخ کے گھر میں پنج گانے کی ہے پخ
بہتر ہے یہی کہ بُت پرستی کیجے　　گو اس میں بھی صبح کو نہانے[۲] کی ہے پخ

---

[۱] یہ اِن اشعار کا بحری وزن ہے، غالباً کسی سیاسی مصلحت سے مافی الضمیر کے اظہار کی بجائے وزن شعری کے الفاظ لکھ دیئے گئے ہیں۔ مقصد غالباً یہ ہوگا کہ جب تک لاٹھی انگریزوں کے ہاتھ میں ہے بھینس اُن ہی کی رہے گی یعنی جب تک حکومت انگریزوں کی ہے ہماری قومی قسمت کے مالک وہی رہیں گے لاکھ ہم ترقی اور اتحاد کا غل مچایا کریں۔

[۲] یعنی بت پرستوں کو بھی ہر صبح پوجا پاٹ کرنے سے پہلے نہانا پڑتا ہے۔

ہوائی گولا اور اپنا چولا

ہم کیا خالی ہوائی گولا چھوڑیں[1] کس جوگ کے بل پر اپنا چولا چھوڑیں

حضرت نے تو چھاؤنی میں رکھی ہے دوکان ہم کیوں اپنا محلہ ٹولہ چھوڑیں

تلخ مباحث اور شوخ شکر لب

نیچری[2] وعظِ مہذب کو لئے پھرتے ہیں شیخ صاحب ہیں کہ مذہب کو لئے پھرتے ہیں

ہم کو ان تلخ مباحث سے سروکار نہیں ہم تو اک شوخ شکر لب کو لئے پھرتے ہیں

---

[1] خالی ہوائی گولا چھوڑنے سے مراد ہے محض دکھانے کے لئے ایسا کام کرنا جس سے کوئی خاص نفع نہ ہو۔ جوگ کے لفظی معنی نیک ساعت کے بھی ہیں پھر جوگ کے بل پر" سے مراد ہے کس بہتری کی امید میں۔ چولا چھوڑنا قالب بدلنا یا ایک جون سے دوسری جون میں آنے کو کہتے ہیں چھاؤنی میں دوکان رکھنے سے مراد ہے کوئی ایسا کاروبار کرنا جس کا تعلق انگریزوں کی فوج سے ہو۔ محلہ ٹولہ چھوڑنے سے مراد ہے دیسی طریقوں کو خیرباد کہنا۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ نوکری یا تجارت وغیرہ کے سلسلہ میں انگریزوں سے تعلق رکھتے یا اُن کے ساتھ رہنے سہنے پر مجبور ہیں وہ اگر اپنے معاشی مفاد کے لئے ایسا کرتے ہیں تو کریں۔ لیکن جن کا کوئی ایسا مفاد انگریزوں سے وابستہ نہیں ہے وہ خواہ مخواہ اپنے دیسی طریقے چھوڑ کر انگریزی بود و باش کیوں اختیار کریں۔ [2] نیچری سے مراد پیروان سر سید احمد خاں مرحوم اور نئی تہذیب کے لیڈران ہیں۔ چونکہ یہ حضرات اپنی تقریروں اور تحریروں میں خدا کی جگہ اکثر نیچر بمعنی فطرت (قدرت) کے لفظ کا استعمال کیا کرتے تھے اس لئے پُرانے خیال کے مولوی اُن کو تضحیکاً نیچری کہنے لگے۔ وعظ مہذب سے مراد ہے نئی تہذیبی اصلاح و ترقی کا وعظ۔

(باقی صفحہ ۱۹۳ پر)

اُن کی گاتے ہیں اپنے گھر کھاتے ہیں

ماشاءاللہ[1] وہ ڈنر کھاتے ہیں — بنگالی بھائی ان کا سر کھاتے ہیں
بس ہم ہیں خدا کے نیک بندے اکبر — اُن کی گاتے ہیں اپنے گھر کھاتے ہیں[2]

نہ معشوق، نہ صندوق، نہ بندوق

لذت[3] چاہو تو وصل معشوق کہاں — شوکت چاہو تو زر کا صندوق کہاں
کہتا ہے یہ دل کہ خودکشی کی ٹھیرے — خیر اس کو بھی مان لیں تو بندوق کہاں

(صفحہ ۱۹۲ کا بقیہ فٹ نوٹ) شوخ شکر لب کے لفظی معنی ہیں شیریں دہن معشوق یہاں اس سے نئی روشنی کی دل چسپیاں اور آزادیاں مراد ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ نئی روشنی کی دل چسپیوں میں پڑ گئے ہیں ان کو نہ تو مولویوں کے مذہبی وعظوں سے کوئی لگاؤ رہ گیا ہے اور نہ نئے لیڈروں کے اصلاح و ترقی کے لکچروں سے۔ وہ تو بس نئی روشنی کی شیریں لب معشوق کے عشق میں دیوانے ہو رہے ہیں اور کوئی نصیحتیں سننا نہیں چاہتے۔

[1] ماشاءاللہ کلمۂ تحسین ہے جو کسی اچھی چیز کو دیکھنے یا محسوس کرنے کے وقت بولا جاتا ہے۔ اور کبھی طنزاً کسی چیز یا بات کے معیوب پہلو کو نمایاں کرنے کے لیے بھی۔ یہاں اسے طنزاً استعمال کیا گیا ہے۔ انگریزوں کے خلاف شورش سب سے زیادہ بنگالیوں نے کی تھی اور بنگالیوں کی بم بازی سے انگریزوں کو بہت پریشانی ہوگئی تھی۔ مطلب یہ ہے کہ مزے میں وہ لوگ ہیں جو نہ تو خطابات و اعزازات حاصل کرنے کے لئے انگریزوں کی خوشامد میں لگے رہتے اور ان کے ساتھ دعوتیں اڑاتے ہیں اور نہ بنگالیوں کی طرح اپنی باغیانہ حرکتوں سے انگریزوں کو پریشان کرتے ہیں بلکہ جو خدا نے ان کو دیا ہے وہ اپنے گھر بیٹھ کر کھا لیتے ہیں اور مصلحتاً انگریزوں کی تعریف بھی کر دیا کرتے ہیں۔ [3] مطلب یہ ہے کہ ہمیں اپنے کسی مقصد کا بھی پورا کرنے کا کوئی ذریعہ میسر نہیں ہے یہاں تک کہ عالم مایوسی میں خودکشی کرنے کا بھی۔ اس لئے کہ بندوق اور ریوالور کا لیسنس بھی نہیں ملتا۔

خدا کے تین ٹکڑے کر دینے والے

یورپ والے جو چاہیں دل میں بھر دیں　　جس کے سر پر جو چاہیں تہمت دھر دیں
بچتے رہو ان کی تیزیوں سے اکبر　　تم کیا ہو خدا کے تین ٹکڑے[1] کر دیں

نئی روشنی کے چندا ماموں

چندوں ہی کے سوجھتے ہیں اُن کو مضموں　　دل شاد ہو اس سے قوم یا ہو محزوں
لڑکے انہیں دیکھ کر مچاتے ہیں دھوم　　یہ ہیں نئی روشنی کے چندا ماموں[2]

لاحول کے انگریزی ترجمے کی ضرورت

اکبر مجھے شک نہیں تیری تیزی میں　　اور تیرے بیان کی دلآویزی میں
شیطان عربی سے ہند میں ہے بے خوف　　لاحول[3] کا ترجمہ کر انگریزی میں

---

[1] عیسائیوں کے عقیدۂ تثلیث کی طرف اشارہ ہے کہ انہوں نے ایک خدا کے تین خدا بنا دیئے ہیں یعنی باپ (خدا) بیٹا (حضرت عیسیٰؑ) روح القدس (حضرت مریمؑ) [2] چندا ماموں بچے چاند کو کہتے ہیں۔ یعنی پہلے زمانہ کے ماموں تو بچوں کو روپے پیسے دیا کیا کرتے تھے اور نئی روشنی کے ماموں بچوں سے چندے لیتے ہیں۔ اس لئے نئی روشنی کے ماموں سچ مچ کے چندا ماموں ہیں۔ [3] شیطان کو بھگانے یعنی شیطانی وسوسوں سے بچنے کے لئے مسلمان لاحول ولا قوۃ الا باللہ پڑھا کرتے ہیں جس کا ترجمہ ہے "سوائے خدا کے کسی میں زور و طاقت نہیں ہے"۔ لاحول سے شیطان کو بھگانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ شیطان لاحول کے الفاظ سے ڈر جاتا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ جب کسی شیطانی وسوسہ کے دور کرنے کے لئے (باقی صفحہ ۱۹۵ پر)

طعنے اور گالیاں سننے کی بجائے قوالی سنو

بے ہنر ہو کر جو بیٹھو طعنۂ حالیؔ سنو — باہنر ہو کر جو چمکو قوم سے گالی سنو
ہم کو تو پیرِ طریقت نے یہی دی ہے صلاح — قصۂ منصورؔ دیکھو اور قوالی سنو

روٹی نہ ملی تو کیا کریں گے

اُٹھا تو تھا ولولہ یہ دل میں کہ صرف یادِ خدا کریں گے — معاً مگر یہ خیال آیا ملی نہ روٹی تو کیا کریں گے
کہاں کے قبلہ کہاں کے قبلی جنیدؔ کیسے کہاں کے شبلی — عوض تصوف کے ہم نے طب لی نہیں گے سر جن مزا کریں گے

(صفحہ ۱۹۴ کا بقیہ فٹ نوٹ) مسلمان کی زبان سے لاحول ولا قوۃ الا باللہ کے الفاظ نکلتے ہیں تو ساتھ ہی اس کے دل میں ان الفاظ کا یہ مفہوم بھی اُتر جاتا ہے کہ خدا کے سوا کسی میں اتنی قدرت و طاقت نہیں ہے کہ انسان کو کسی اوپر چلا سکے۔ اور اس مفہوم کے دل نشین ہوتے ہی شیطانی وسوسہ دور ہو جاتا ہے اور شیطان یہ سمجھ کر کہ لاحول پڑھنے والے پر اب میرا داؤں نہیں چلے گا بھاگ جاتا ہے۔ اس لیے لاحول پڑھنے کا مقصد جب ہی حاصل ہو سکتا ہے جبکہ آدمی اس کے مفہوم سے بھی واقف ہو۔ لیکن ہندوستان کے بعض مسلمانوں پر انگریزیت اس قدر چھا گئی ہے کہ وہ نہ تو عربی لاحول کے مفہوم کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ اس کے اردو ترجمہ کو اس لیے اُن کا لاحول پڑھنا بیکار ہے جب تک کہ لاحول کے انگریزی ترجمہ سے اس کا مفہوم ان کے ذہن نشین نہ کرا دیا جائے۔ یعنی ایسے انگریزی دانوں کے واسطے شیطان کو بھگانے کے لیے لاحول کے انگریزی ترجمہ کی ضرورت ہے ۔ لہ حالیؔ تخلص ہے مسلمانوں کے مشہور قومی شاعر وریفارمر شمس العلماء مولانا خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی مرحوم کا (وفات ۱۹۱۴ء) جو مرزا غالبؔ کے شاگرد اور سر سید احمد خاں صاحب مرحوم کے رفقاء خاص میں سے تھے اور جن کی اصلاحی نظم مسدس حالی بہت مشہور ہے۔ جس میں مسلمانوں کے عروج و زوال اور اُن کی موجودہ قومی خرابیوں کمزوریوں اور بے ہنریوں کا نہایت مؤثر و عبرت انگیز نقشہ کھینچا گیا ہے۔ ۲ منصور یعنی شیخ حسین منصور حلاج جو خلیفہ مقتدر کے زمانہ یعنی سنہ ۹۱۹ء میں ایک مشہور صوفی مجذوب بزرگ گزرے ہیں جن کو انا الحق (میں خدا ہوں) کہنے کی پاداش میں علمائے شریعت کے فتوے کی بنا پر سولی دیدی گئی تھی۔ مطلب اشعار کا یہ ہے کہ زمانہ ایسا نازک ہے کہ

اگر بے ہنر رہا جاتا ہے تو مصلحین قوم کے طعنے سننے پڑتے ہیں اور کسی ہنر میں کمال پیدا کر کے شہرت حاصل کی جاتی ہے تو حسد کرنے والے ابنائے قوم گالیاں دیتے ہیں ایسی حالت میں

(باقی صفحہ ۱۹۶ پر)

دورخی پالیسی

ہر اک ریمارک آپ کا عقرب کا نیش ہے
مجھ کو بھی رنج غیر کا سینہ بھی ریش ہے

مجھ سے کہا کہ گوز شتر[1] ہے ترا سخن
اس سے یہ کہدیا کہ تو گوبر گنیش[1] ہے

یہ مراقبہ ہے یا پینک

ہر چند کہ مجھ کو اعتقاد اب تک ہے
تاہم بلحاظ وقت دل میں شک ہے

بیٹھے تو بہت ہی سر جھکا کر ہیں حضور
کیا جانے مراقبہ[2] ہے، یا پینک ہے

(صفحہ ۱۹۵ کا بقیہ فٹ نوٹ) بہتر یہی معلوم ہوتا ہے کہ تو میات سے بے تعلق ہو کر گوشۂ عافیت میں بیٹھ جائیں۔ منصور وغیرہ اولیاء اللہ کے حالات پڑھا کریں اور قوالی سنا کریں۔ ٢؎ جنید۔ حضرت جنید بغدادیؒ ایک مشہور عارف باللہ صوفی باصفا تھے۔ صوفیوں کا فرقہ جنیدیہ اُن ہی کی طرف منسوب ہے۔ وفات ۹۱۰ء شبلی:۔ حضرت ابوبکر شبلیؒ حضرت جنید بغدادی کے شاگرد اور باکمال و خدا شناس صوفی بزرگ تھے (وفات ۹۴۶ء) قبلہ کلمۂ تعظیم ہے۔ قبلی تصغیر ہے قبلہ کی جیسے تابع مہمل کے طور پر شبلی کے ہم وزن ہونے کی رعایت سے گھڑ لیا گیا ہے۔ مطلب اشعار کا یہ ہے کہ دل میں جوش تو یہ پیدا ہوا تھا کہ حضرت جنیدؒ اور شبلیؒ کی طرح سارے علائق دنیوی سے منہ موڑ کر یاد خدا کیا کریں گے۔ مگر چونکہ یہ جوش سچی خدا پرستی کے جذبہ پر مبنی نہیں تھا اس لئے فوراً ہی پیٹ کا خیال آگیا اور اس سوچ میں پڑ گئے کہ اگر دنیا سے کنارہ کش ہو کر بیٹھ گئے اور کھانے کو نہ ملا تو کیا کریں گے۔ پیٹ کا خیال آتے ہی یاد خدا کا جوش ٹھنڈا ہو گیا۔ اور ہم نے جنید و شبلی کی پیروی میں صوفی بننے کی بجائے طب پڑھنی شروع کر دی۔ اور طبیب و جراح بننے کی دل میں ٹھان لی۔ تاکہ پیسے بھی خوب کمائیں اور عزت بھی۔

١؎ و ٢؎ گوز شتر (یعنی لفظی اونٹ کی ریاح) سے مراد ہے بیہودہ اور باد ہوائی بات۔ گوبر گنیش (یعنی لفظی گوبر کا بنا ہوا گنیش کا بت) سے مراد ہے نہایت بدصورت، بے ڈول، موٹا بھینسا، کاہل، کند ذہن۔ مطلب یہ ہے کہ انگریز ہندو مسلمانوں کے متعلق جو فقرے کستے ہیں وہ بچھو کے ڈنک کی طرح دونوں کے دلوں میں چبھتے اور تکلیف دیتے ہیں۔ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ تمہاری باتیں گوز شتر یعنی بیہودہ بکواس ہیں اور ہندوؤں سے کہتے ہیں کہ تم گوبر گنیش ہو یعنی نہایت بھدے اور بے وقوف ٣؎ مطلب یہ ہے کہ زمانہ ایسی ریاکاری اور ضعیف الاعتقادی کا آگیا ہے کہ معتقد مریدوں کو بھی پیروں کے

مراقبہ یعنی دھیان و گیان پر شبہ ہونے لگا ہے کہ آیا وہ در اصل مراقبہ ہی میں ہیں یا افیم وغیرہ کے کسی نشہ کی اونگھ یا غنودگی میں۔

کلیسا کا چونا

مغربی[1] کل نے مجھ کو پیسا ہے ‏ ‏ ‏ میرا چونا ہے اور کلیسا ہے

آپ ہی گا کے جھوم لیتے ہیں ‏ ‏ ‏ باربد[2] ہے نہ اب نکیسا ہے

چندے کے پھندے

کچھ بھی نہیں چاہتے وہ چندے کے سوا ‏ ‏ ‏ اس باغ میں کیا دھرا ہے پھندے کے سوا

گلچیں[3] ہے ہر اک نہیں ہے بلبل کوئی ‏ ‏ ‏ اس نکتے کو کون سمجھے بندے کے سوا

(گلچیں: پھول چننے والا — بلبل: عاشق یعنی پھول کا — نکتہ: حقیقت، گہری بات)

سودائے سفر لندن

پنڈت بیٹھا ہے اپنی پوتھی لے کر ‏ ‏ ‏ بنیا بیٹھا ہے موٹھ موتھی لے کر

سودا[4] اس کو ہے جو سدھارا لندن ‏ ‏ ‏ وہ دولت و جنس گھر میں جو تھی لے کر

(سودا: خبط، جنون)

---

[1] مطلب غالباً یہ ہے کہ مغربی تہذیب نے ہماری قومی و ملی خصوصیات کو ختم کر کے ہمیں بس اس قابل کر دیا ہے کہ ہم انگریزوں کے کلیساؤں کی تعمیر میں چونے کا کام دیں یعنی انگریزی قومیت و مذہب کے استحکام کا کام دیں۔ [2] باربد اور نکیسا خسرو پرویز شاہ ایران کے دربار کے دو مشہور مطربوں کا نام تھا۔ نظامی گنجویؒ کی مثنوی شیریں خسرو میں ان کا ذکر آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حکومت و دولت تو ختم ہوئی کہ مشہور ماہران موسیقی کو نوکر رکھ کر ان کے کمالات فن سے متلذذ و مستفید ہوں۔ خود ہی گا کر جھوم لیا کرتے ہیں۔ [3] آجکل کے لیڈروں کا نقشہ ہے کہ وہ قوم کو سبز باغ تو بہت دکھاتے ہیں لیکن سوائے چندہ وصول کرنے کے کوئی مفید خدمت قوم کی نہیں کرتے۔ قوم سے فائدہ تو اٹھاتے ہیں۔ مگر قوم کی محبت دل میں نہیں رکھتے۔ [4] مطلب یہ ہے کہ جن ہندوستانیوں کے دماغوں میں مغرب پسندی کا خبط نہیں سمایا ہے۔ وہ تو ہندوستان ہی میں رہ کر اپنے اپنے پیشوں کے ذریعے روزی کما رہے ہیں لیکن جن کو نئی روشنی کی ہوا لگ گئی ہے وہ اپنے گھروں کی رہی سہی پونجی کو بھی تعلیم وغیرہ کی غرض سے انگلستان جا کر برباد کر رہے ہیں۔

چلئے اجمیر شریف

اونچے ہیں رذیل اور ہیں زیر شریف | قسمت کا یہ دیکھتے ہیں اب پھیر شریف
اکبر یہ مجتبٰے (۱) نے دی خوب صلاح | چل دیجئے (۲) بھائی صاحب اجمیر شریف

اے - بی

حیراں ہیں اس زمانہ میں ہم جی کے کیا کریں | جائز (۳) سہی شراب مگر پی کے کیا کریں
تعلیم اونچے درجے کی ہوتی نہیں نصیب | پھر (۴) گھر میں بیٹھ کے بجز اے - بی کے کیا کریں

---

(۱) غالباً الہ آباد کے مشہور وکیل مولوی غلام مجتبٰے صاحب مرحوم مراد ہیں۔

(۲) یعنی جب زمانہ کا یہ حال ہے کہ سفلوں کی قدر اور شریفوں کی بے وقعتی ہو رہی ہے تو مناسب یہی ہے کہ ابنائے عصر سے کنارہ کشی کی جائے اور اجمیر شریف یعنی کسی متبرک روحانی مقام میں بیٹھ کر خدا کو یاد کیا جائے۔ (۳) مقصد یہ ہے کہ اگر جائز و ناجائز کے خیال کو بالائے طاق رکھ کر انگریزوں کی تقلید اختیار بھی کر لی جائے اور اس سے ہماری زندگی کی تکلیفوں میں کوئی کمی نہ ہو تو ایسی تقلید کا کیا نتیجہ اور ایسی زندگی سے کیا فائدہ۔

(۴) مطلب یہ ہے کہ وہ اونچے درجے کی تعلیم تو ہم کو نصیب نہیں ہوتی جس سے ہم بڑے صناع اور تجار بنیں۔ جو تعلیم ہم کو دی جا رہی ہے وہ ایسی ہے کہ اگر ہمیں نوکری نہ ملے تو سوائے اس کے کہ گھر بیٹھے مکھیاں مارا کریں یا بیوی سے دل بہلانے کے لئے اے اے بی ذرا سنا کہہ کر بار بار بلائیں اور کیا کر سکتے ہیں۔ بی - اے ایک اونچی تعلیمی ڈگری ہے جس پر بڑی نوکریوں کے ملنے کا انحصار ہے اور اے بی انگریزی زبان کی الجبد کے ابتدائی دو حروف ہیں۔ اس لئے شعر کا یہ مطلب بھی لیا جا سکتا ہے کہ بی اے پاس نہ ہونے کی وجہ سے جن کو نوکری نہیں ملتی وہ ایسے ہی ہیں جیسے گھر میں بیکار

بیٹھے ابھی A . B . C . D پڑھ رہے ہوں - بی اے - اور اے بی کی صنعت تضاد کا لفظی اور معنوی لطف ظاہر ہے۔

گریۂ بے سُر

در پر مظلوم اک پڑا روتا ہے — بے چارہ بلا میں مبتلا روتا ہے
کہتا ہے وہ شوخ تال[1] سم ٹھیک نہیں — کیا[2] اس کی سنو کہ بے سُرا روتا ہے

ایک دوسرے کو پاجی کہنا حاجی کہنے سے برا ہے۔

لوگ ہنستے ہیں جو پیش آتی ہے یہ حالت کبھی — من[3] ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو
لیکن اخلاقی نظر میں اس سے تو بہتر ہے وہ — من ترا پاجی بگویم تو مرا پاجی بگو

انگریز پرستوں کی آستان بوسی

مشتاق[4] لقا ہوں در پہ حاضر ہوں میں — منظور نہیں کہ بار خاطر ہوں میں
حضرت کو جو فرصت ملاقات نہ ہو — بوسے پر آستاں کے شاکر ہوں میں

---

[1] تال سم:۔ اہل موسیقی ضرب ہائے معینہ پر آواز موزوں ہونے کو تال اور آخر دور کے ضرب کے ساتھ برابر ہونے کو سم کہتے ہیں [2] مطلب یہ ہے کہ انگریزی دور حکومت میں مظالم و مصائب پر آہ واویلا بھی قاعدے قانون سے کرنی پڑتی ہے جن مظلوموں کی چیخ پکار کسی قانون اور قاعدے کے ماتحت نہیں ہوتی ان کی شنوائی نہیں ہوتی [3] یہ کسی مشہور شاعر کا ضرب المثلی مصرع ہے جس کا ترجمہ ہے "میں تجھے حاجی کہوں اور تو مجھے حاجی کہہ" یہ ایسے موقع پر بولتے ہیں جب ایک شخص دوسرے کی غلط تعریف کرے اور جس کی تعریف کی جائے۔ وہ تعریف کرنے والے کی غلط تعریف کرے۔ مثلاً کوئی مجھے حاجی کہے اور میں اس کو حالانکہ دونوں میں سے کوئی بھی حاجی نہ ہو۔ اس طرح سے ایک دوسرے کی غلط تعریف کرنا بھی اگرچہ اخلاقاً معیوب ہے لیکن من ترا پاجی بگویم

تو مرا پاجی بگو" کہنے سے بہتر ہے۔ کیونکہ کسی کی غلط تعریف کرنے میں تو صرف غلط بیانی کا اخلاقی عیب ہوتا ہے۔ لیکن ایک دوسرے کے (باقی صفحہ ۲۰۰ پر)

پرشاد اور مٹن دونوں تبرک

عنایت[۵۱] مجھ پہ فرماتے ہیں شیخ و برہمن دونوں
موافق اپنے پاتے ہیں میرا چلن دونوں

ترانے میرے ہم آہنگ دیر و کعبہ میں یکساں
زباں پر میری موزوں ہوتے ہیں حمد اور بھجن دونوں

مجھے اُلفت ہے سُنی سے بھی شیعہ سے بھی یاری ہے
اکھاڑے میں دکھا سکتے ہیں دل کش بانکپن دونوں

مجھے ہوٹل بھی خوش آتا ہے اور ٹھاکر دوارا بھی
تبرک ہیں مرے نزدیک پرشاد اور مٹن دونوں

برکت کا تحفہ — ہندوؤں کا تبرک — بکری کا گوشت

پنڈت اور مولوی سے گریجویٹ ہونا اچھا

اسمال[۵۲] نہیں گریٹ ہونا اچھا!
دل ہونا برا ہے پیٹ ہونا اچھا

پنڈت ہو کہ مولوی ہو دونوں بیکار
انسان کو گریجوایٹ ہونا اچھا

(صفحہ ۱۹۹ کا بقیہ فٹ نوٹ) پاجی کہنے میں غلط بیانی بھی ہوتی ہے اور دل آزاری بھی اور فتنہ کے پیدا ہونے کا اندیشہ بھی ہے مطلب یہ ہے کہ حکام رسی کے دل دادہ یہ جاننے کے باوجود کہ انگریز حاکم ان سے ملاقات نہیں کریں گے محض ان کے در دولت پر ہو آنے اور ان کی آستاں بوسی ہی کو ذریعہ مقصد برآری سمجھتے ہیں۔

[۵۱] ان شعروں میں انگریزوں اور انگریزی حکومت کی نمائشی رواداری، بے تعصبی اور غیر جنبہ داری کو طنزاً بیان کیا گیا ہے کہ انگریز مسلمان، ہندو، سنی اور شیعہ سب کو ایک نظر سے دیکھتے ہیں اور انہی کی دی ہوئی مذہبی آزادی سے ہمارے آپس میں فرقہ وارانہ لڑائیاں اور جھگڑے ہوتے ہیں ان میں دلچسپیاں لیتے ہیں۔

[۵۲] اسمال SMALL بمعنی چھوٹا۔ گریٹ GREAT بمعنی بڑا۔ دل چھوٹا ہوتا ہے اور پیٹ بڑا۔ دل کو اچھائی، برائی اور انجام کا احساس ہوتا ہے اور پیٹ صرف کھانے کو مانگتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس زمانہ میں سب بڑا بننا چاہتے ہیں۔ کوئی چھوٹا ہونا پسند نہیں کرتا اور سب یہ چاہتے ہیں کہ بس پیٹ بھرتا رہے۔ کوئی دل سے کام لینے۔ سوچنے سمجھنے اور اچھائی برائی پر غور کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ قدر صرف اعلیٰ انگریزی تعلیم یافتوں کی ہے نہ پنڈتوں کی ہے نہ مولویوں کی۔ کیونکہ انگریزی تعلیم یافتہ بڑے ہوتے ہیں اور پنڈت مولوی چھوٹے۔

قومی ترقی کی شناخت

اپنے بھائی[1] کے مقابل کبر سے تن جائیے — غیر کا جب سامنا ہو بس قلی بن جائیے

فلسفہ الحاد کا کر لیجیے فوراً قبول — دین کی ہو بات تو ابطال پر ٹھن جائیے

چندے کی مجلس میں پڑھیے رو کے قرآن مجید — مذہبی محفل ہیں لیکن مثل دشمن جائیے

شیخ صاحب ہے یہی قومی ترقی کی شناخت

روٹھنے سے کچھ نہیں ہے فائدہ من جائیے

بندہ اور بندی

دربار سلطنت میں ہے کبر و خود پسندی — مذہب میں دیکھتا ہوں جنگ اور گروہ بندی

رندی و عاشقی کا ہے شغل سب سے بہتر — لمینڈ[2] ہے اور وہسکی بندہ ہے اور بندی

---

[1] مطلب اشعار کا یہ ہے کہ پرانے خیال کے مسلمانوں کے نئی روشنی کے مسلمانوں سے ناراض ہونا بیکار ہے کیونکہ آج کل قومی ترقی کے معنی یہی ہیں کہ اپنے بھائیوں کے سامنے تو شیخی جتائی جائے اور غیروں کے سامنے بھیگی بلی بن جایا جائے۔ لامذہبی کی باتوں کو فوراً اختیار کر لیا جائے اور مذہبی باتوں کی تغلیط و تردید کی جائے۔ چندہ جمع کرنے کی ضرورت ہو تو قومی جلسوں میں سچے مسلمانوں کے متاثر کرنے کے لئے ریاکاری سے قرآن مجید کی تلاوت کی جائے اور رو دیا جائے لیکن مذہبی وعظوں کی مجلسوں میں جا کر واعظوں کا مذاق اڑایا جائے اور مخالفوں کی طرح سے ان کے مواعظ پر نکتہ چینی کی جائے۔

[2] لمینڈ Lemonade یعنی گیس سے تیار کیا ہوا لیموں کا انگریزی شربت۔ وہسکی Whisky ایک قسم کی تیز شراب جو زیادہ تر سکاٹ لینڈ میں بنتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انگریزوں کی درباداری میں تو یہ خرابی ہے کہ اس سے شیخت و تمکنت پیدا ہوتی ہے اور مذہب سے تعصب جذبہ

فرقہ بندی۔ لطف و عیش نہ اس میں ہے نہ اس میں۔ سب سے اچھا شغل آزاد منشی اور عشق و عاشقی کا ہے۔ جس میں وصل معشوق کا عیش بھی رہا صفحہ ۲۰۲ پر

زبانِ مس پہ قدرت

میں نے کہا بہت سی زبانیں ہوں جانتا — مدت تک امتحان دیئے امتحان پر

جرمن (زبان جرمن)، فرنچ (فرانسیسی)، لیٹن (لاطینی) و انگلش (انگریزی) پہ ہے عبور — ثابت مرا کمال ہے سارے جہان پر

اک شوخ (بیباک، چلبلی) طبع مس (کمسن موہنی لڑکی) نے دکھائی زبان مجھے — بجلی[1] تھی ابر میں کہ قمر آسمان پر

بولی[2] رہو گے زیست (زندگی) کی لذت سے بے خبر

قدرت نہ پائی تم نے اگر اس زبان پر

(صفحہ ۲۰۱ کا بقیہ فٹ نوٹ)

حاصل ہوتا ہے اور شراب نوشی کا لطف بھی۔ یہ اُن رند منشوں کا نقشہ ہے جو نہ دنیا کی کسی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہیں اور نہ عقبیٰ کی۔

[1] یعنی مس کے زبان نکالتے ہی ایسا معلوم ہوا جیسے کہ ابر میں بجلی کوندگئی ہو یا تاریک آسمان پر چاند نکل آیا ہو۔ زبان دکھانا تضحیک کے طور پر بھی ہوتا ہے یعنی کسی کے بیان کی ہنسی اُڑانے کے لئے بھی۔

[2] مطلب یہ ہے کہ اس زمانہ میں خواہ کیسے ہی امتحان پاس کر لو اور خواہ کتنی ہی زبانیں سیکھ لو لیکن اگر کوئی مس تمہاری معشوقہ لو اس کی زبان یوسی پر تم کو مقدرت نہیں ہے تو مسیں تمہارا مذاق اُڑاتی ہیں اور کہتی ہیں کہ تم زندگی کی لذتوں سے محروم ہو۔

بازمانہ بساز یعنی سایہ کی جگہ پشواز

ہوئی جو مجھ سے یہ فرمائش بتِ طناز — کہ فن شعر میں تو آج ہے بہت ممتاز
لگادے اس پہ کوئی مصرعِ حسین و نفیس — "زمانہ با تو نسازد تو بازمانہ بساز"
کہا یہ میں نے کہ ہے قیدِ حسن و خوبی کی — تو سن یہ شعرِ نشاط آور و نگاہ نواز

پہن لے سایہ[1] مری جاں اتار کر پشواز
زمانہ با تو نسازد تو بازمانہ بساز

پھونک پھونک کر قدم رکھنے والوں کی کود پھاند

بلبل ہیں آج ہم چمنستان کمپ[2] کے — پروانہ کل بنیں گے کلیسا کے لمپ کے

---

[1] سایہ ۔ مغربی عورتوں کا لہنگا یا غرارہ۔ پشواز: لہنگے کی شکل کا ایک گھیر دار غرارہ جو ناچنے کے وقت پہنا جاتا ہے۔ زمانہ با تو نسازد تو بازمانہ بساز، کا مطلب ہے کہ اگر زمانہ تمہارے موافق نہ ہو تو تم زمانہ کے موافق ہو جاؤ۔ یعنی اگر تمہارا کوئی رویہ زمانہ کے خلاف ہو اور اس کی وجہ سے تم کو کوئی نقصان پہنچ رہا ہو تو اس رویہ کو بدل دو اور وہی رویہ اختیار کرلو جس کی زمانہ قدر کرتا ہے۔ اس فارسی ضرب المثلی مصرع پر حضرت اکبر نے جو دلچسپ اور حسب مذاق زمانہ طنزیہ مصرع لگایا ہے وہ واقعی لفظاً اور معناً حسین یعنی نشاط آور بھی ہے اور نفیس یعنی نگاہ نواز بھی۔ اس زمانہ میں جو دلکشی اور نظر فریبی انگریزی زنانہ لباس سایہ میں ہے وہ پشواز میں نہیں ہے۔ پشواز قدرتی حسن کو چھپاتی ہے اور سایہ اس حسن کو ابھارتا ہے اور اسی لئے سایہ کی قدر زیادہ اور پشواز کی کم ہے۔ لہٰذا رفتارِ زمانہ کے ساتھ چلنے کی ضرورت سمجھنے والوں کو پشواز اتار کر سایہ ہی پہنا چاہیئے۔ [2] یعنی ابھی تو ہم صرف انگریزی ملازمتوں یا انگریزی چھاؤنیوں کے ٹھیکوں وغیرہ کے پیچھے دیوانے ہو رہے ہیں مگر وہ وقت آنے والا ہے کہ ہم عیسائی گرجاؤں کے لیمپوں کے پروانے ہو جائیں گے۔ یعنی عیسائیت کو پسند کرنے لگیں گے۔

فکرِ بہشت کوثر و تسنیم ہو چکی[1]
رکھتے تھے جو بزرگ قدم پھونک پھونک کے[2]

اب پارک کا خیال ہے چرچے ہیں پمپ کے
خوگر ہوئے ہیں لیپ اسکپ کے جمپ کے[3]

مئے گلگوں اور ریش سفید

پھرے اک مولوی صاحب جو کل دربار دہلی سے[4]
یہ پوچھا میں نے کچھ لائے بھی تم سرکار دہلی سے

وہ بولے ہنس کے اے اکبر کہوں کیا تجھ سے حال اپنا
اسی مطلع سے بس کرتا ہوں اظہار خیال اپنا

اُدھر سرخی مئے گلگوں کی تھی انڈے کی زردی تھی[5]
اِدھر ریش سفید اپنی تھی اور شدت سے سردی تھی

---

[1] کوثر اور تسنیم بہشت (جنت) کی دو نہروں کے نام ہیں۔ یعنی آج کل بہشت کے باغات اور کوثر و تسنیم کی نہروں کی بجائے لوگوں کو شہری باغیچوں اور تفریح گاہوں کا یا پانی کے نلوں کا زیادہ فکر رہتا ہے۔ [3] لیپ سکپ کا جمپ یہ تینوں انگریزی الفاظ ہیں JUMP OF LEAP SKIP یہ ایک قسم کی ورزش ہے جو اس طرح کی جاتی ہے کہ ایک کافی لمبی رسّی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر پیٹھ کی طرف سے جلدی سے سامنے لایا جاتا ہے اور دونوں ٹانگیں اچھال کر اس رسّی کے اوپر سے اس طرح کودا جاتا ہے کہ رسّی پھر پیٹھ کی طرف آجاتی ہے۔ [2] پھونک پھونک کر قدم رکھنا محاورہ ہے بمعنی نہایت آہستہ آہستہ احتیاط سے چلنا یا ڈرتے ڈرتے کوئی کام کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ جو بزرگ بڑی احتیاط سے چلا کرتے تھے وہ اب بچوں کی طرح رسّیوں پر کود پھاند رہے ہیں یعنی جن لوگوں کی روشیں بڑی محتاط تھیں وہ بھی اب مآل اور انجام سے نڈر ہو کر زمانہ کے ساتھ چل رہے ہیں۔ [4] یعنی ۱۹۰۳ء کا دہلی دربار جو شاہ ایڈورڈ ہفتم کی تاجپوشی کی تقریب میں لارڈ کرزن وائسرائے نے منعقد کیا تھا۔ [5] مطلب یہ ہے کہ دربار میں مزے تو ان لوگوں کے تھے جو شرابیں پی رہے اور انڈے کھا رہے تھے۔ یہاں تو سفید داڑھی کی شرم کی وجہ سے نہ شراب پی سکے نہ انڈے ہی اخراط

سے کھانے کو ملے سخت سردی میں اکڑتے رہے۔

مفلسی میں آٹا گیلا

پیچ مذہب کا کسی صاحب نے ڈھیلا کر دیا
سادہ طبعوں کو بھی بالآخر رنگیلا کر دیا

شوق پیدا کر دیا بنگلے کا اور پتلون کا
وہ مثل ہے مفلسی میں آٹا گیلا کر دیا

تھا بنارس پہلے ہی سے اے صنم رس میں بھرا
چشم مس[2] اینی نے اور اس کو رسیلا کر دیا

دُرگا بائی اور بی نصیبن

دل چسپ ہوائیں سوئے گلشن پہنچیں
زلفیں شملے سے تا بہ دامن پہنچیں

دُرگا بائی[3] سے راجہ جی جب رُوٹھے
صدقے ہوتے کو بی نصیبن پہنچیں

---

[1] مذہب کا پیچ ڈھیلا کر دینے سے مراد ہے مذہب کی بندشوں اور مذہب کے اثر کو کمزور کر دینا۔ مفلسی میں آٹا گیلا ہو جانا محاورہ ہے جو ایسے موقعوں پر بولتے ہیں کہ تنگ دستی میں خرچ کی کوئی ضرورت نکل آئے یا ایک تکلیف کے وقت کوئی اور تکلیف برداشت کرنی پڑ جائے۔ مطلب یہ ہے کہ انگریزیت نے مذہب کے اثر کو کمزور کر کے سیدھی سادی زندگی بسر کرنے والے مسلمانوں میں بھی نئی روشنی کی نمود و نمائش اختیار کرنے کا شوق پیدا کر دیا۔ اور کوٹ پتلون پہننے اور بنگلوں میں رہنے کا خبط ہو گیا۔ مفلس تو وہ پہلے ہی تھی اب نئے نئے خرچوں کی ضرورتیں اور بڑھ گئیں۔

[2] مس اینی سے شادی کے بعد کی مسز اینی بیسنٹ مراد ہیں جو ایک مشہور مغربی خاتون اور ہندوستان میں مدراس کی تھیوسوفیکل سوسائٹی کی روح رواں تھیں۔ مسز اینی بیسنٹ نے کافی عرصہ تک بنارس میں رہ کر ہندو مذہب کا مطالعہ کیا تھا۔ آخر عمر میں ہندوستان کو حکومت خود اختیاری دلوانے کے لئے انہوں نے ہوم رول لیگ قائم کی تھی ان کی آنکھیں رسیلی تھیں اور نام بھی اینی تھا جو عربی لفظ عینی (منسوب بہ چشم یعنی آنکھ والی) کا ہم آواز ہے۔ بنارس (کے لفظ) میں پہلے ہی رس موجود تھا جس اینی کی رس بھری آنکھوں اور رس بھری باتوں نے اس کے رسیلے پن کو اور بڑھا دیا۔ [3] درگا بائی سے مراد ہندو قوم۔ راجہ جی سے مراد حکومت انگریزی اور بی نصیبن سے مراد مسلمان ہیں (حاشیہ مولانا عبدالماجد دریابادی) ان اشعار میں اشارہ مسلمانوں کے اس شملہ ڈیپوٹیشن کی طرف ہے جو سر آغا خاں کی سرکردگی میں نواب محسن الملک مرحوم لارڈ منٹو وائسرائے ہند کے پاس شملہ لے کر گئے تھے اور جس کی شملہ پر بڑی آؤ بھگت ہوئی تھی۔ دلچسپ ہواؤں سے مراد شملہ پہاڑ پر انگریزوں کی طرف سے مسلمانوں کی غیر معمولی خاطر مدارات ہونے کی خبریں ہیں۔ شملہ پگڑی کے طرّہ یا اُس سرے کو بھی کہتے ہیں جو سر پر اونچا اٹھا رہتا ہے دامن سے مراد ہندوستان کا غیر کوہی علاقہ ہے۔ زلفوں سے مراد مسلمانوں کو اپنے جال میں پھانسنے کی انگریزوں کی حکمت عملی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انگریزوں نے ہندوؤں کا زور کم کرنے اور ان کے بڑھتے ہوئے فتنہ کو دبانے کے لئے شملہ پر مسلمانوں کی جو غیر معمولی آؤ بھگت کی اور اس کی خبریں سارے ہندوستان میں پہنچیں تو مسلمان اس غلط فہمی میں پڑ گئے کہ انگریز ہندوؤں سے ناراض ہو کر مسلمانوں کے دوست ہو گئے ہیں اور وہ انگریزوں کی زلفوں کا شکار ہو کر یعنی حکومت کی اس چال کے جال میں پھنس کر انگریزوں پہ صدقے قربان ہونے کے لئے تیار ہو گئے اور ان کی وفاداری کا دم بھرنے لگے۔

نیچر نے کیا ہے ہم کو ننگا پیدا

پردے کا کیا ہے خود اونگا پیدا — خود ہم نے کیا ازار اور انگا پیدا

(ستر پوشی — جبہ — معیبت — پاجامہ — تہمد — انگرکھا)

کیا خوب کہا ہے مولوی ہدی نے — نیچر[1] نے کیا ہے ہم کو ننگا پیدا

(مرحوم نواب محسن الملک مولوی مہدی علی — قدرت)

شیطان کا ہتک عزت کا نوٹس

شیطان نے دیا یہ شیخ جی کو نوٹس (باضابطہ) — بالکل ہی گیا ہے زور اب آپ کا ٹوٹ

آیندہ پڑھیں گے آپ لاحول اگر (اعلان) — فوراً داغوں[2] گا اک ڈفیمیشن سوٹ

---

[1] خبر نہیں نواب محسن الملک مرحوم نے کس موقع پر اور کس مقصد سے کہا ہے کہ قدرت نے انسان کو ننگا پیدا کیا ہے۔ یعنی جب انسان پیدا ہوتا اور دنیا میں آتا ہے تو ننگا ہوتا ہے۔ اس کے امر واقعہ ہونے میں کوئی شک نہیں ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ پجامہ۔ تہمد۔ کرتہ اور انگرکھا وغیرہ انسانی اختراعات ہیں جن کی وجہ سے انسان کے لئے لباس کی اور بھوک کی ضرورت بڑھ گئی ہے۔ مگر جہاں تک ستر عورت یعنی ایسے اجزاء جسمانی کے چھپانے کا تعلق ہے جن کے بے پردہ رہنے سے دوسری جنس کی خواہشات نفسانی مشتعل ہوتی ہیں۔ ان کے چھپانے کی تحریک بھی انسانی فطرت ہی کی طرف سے ہوتی ہے اور اس لئے تمام مذاہب نے اس کو ضروری قرار دیا ہے۔

[2] داغنا یعنی توپ یا بندوق چھوڑنا مجازاً یعنی نالش یا دعوی دائر کرنا ڈیفیمیشن سوٹ DEFAMATION Suit یعنی نالش ہتک عزت۔ یعنی آبرو ریزی کے ہرجانہ کا دعوی۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک دین کا غلبہ اور دینداروں کا عروج تھا شیطان کے ہتھکنڈوں اور دھوکہ بازیوں سے بچنے کے لئے لاحول کے حربہ سے کام لیا جاتا تھا۔ یعنی یہ کہا جاتا تھا کہ سوائے خدا کے کسی میں قدرت و طاقت نہیں ہے کہ وہ خدا کے سچے پرستاروں کو ورغلا سکے۔ شیطان کے خلاف لاحول پڑھنے کا بالواسطہ اثر دلوں پر یہ ہوتا تھا کہ شیطان تو خدا کا باغی ہونے کی حیثیت سے ایک ذلیل و قابل نفرت ہستی ہے وہ کیا خدا کے مقابلہ میں آ سکتا اور خدا کے بندوں کو بہکا سکتا ہے لیکن جب سے دین کمزور اور بے دینوں کا عروج ہوا ہے شیطان بھی اپنے آپ کو معزز سمجھنے لگا ہے۔ وہ اب لاحول پڑھنے کو اپنی بے عزتی تصور کرتا ہے اور لاحول سے ڈرنے کی بجائے لاحول پڑھنے والوں سے انتقام لینے کے لئے تیار ہے۔

ناول پڑھو اور پتلون و بوٹ پہنو

اَلَایَا اَیُّهَا الطِّفْلَکْ[1] بجو راحت بہ ناولہا ۔ کہ قرآں سہل بود اول و لے افتاد مشکلہا
بکن تزئین پائے خود بہ بوٹ ڈاسن و پتلون ۔ کہ سر سید خبردار د ز راہ و رسم منزلہا

(زیبائش — کا مالک انگریزی کارخانہ — سرسید احمد خاں مرحوم — مقام بلند پروازی منزل)

نئی روشنی کے صوفی اور واعظ

دیکھیے[2] قوال بیچارے کا اب کیا حشر ہو ۔ شیخ صاحب کو تو لکچر پر بھی وجد آنے لگا
کیوں کرے گا پیش ہم پر جلوہ حور بہشت ۔ جب تھیٹر کا سماں واعظ کو تڑپانے لگا

---

[1] یہ اشعار حافظ شیرازی کی مشہور غزل کے دو شعروں میں حسب حال تصرف کر کے لکھے گئے ہیں۔ حافظ کے اشعار یہ ہیں۔

اَلَایَا اَیُّهَا السَّاقِی اَدِرْ کَاْسًا وَّ نَاوِلْهَا ۔ کہ عشق آساں نمود اول و لے افتاد مشکلہا
بہ مے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید ۔ کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزلہا۔

(ترجمہ) اے ساقی (شراب کے) جام کو گھما اور مجھ کو بھی دے۔ اس لیے کہ عشق شروع شروع میں تو آسان معلوم ہوا تھا لیکن اب اس نے بڑی مشکلوں میں ڈال دیا ہے۔ اگر پیر مغاں (پیر طریقت) تجھ سے کہے تو جانماز کو شراب میں رنگ دے کہ سالک (سلوک کی) منزلوں کی راہ و رسم سے ناواقف نہیں ہوتا۔ حضرت اکبر کے اشعار کا ترجمہ و مطلب یہ ہے۔ اے بچے ناولوں سے دل بہلایا کر اس لیے کہ قرآن شروع شروع میں تو یعنی جب تک کہ محض نام جاتا تھا آسان تھا لیکن اب اس پر عمل کرنا پڑا ہے، بڑی مشکلیں پیش آ رہی ہیں اپنے پاؤں کو ڈاسن کے بوٹ اور پتلون سے آراستہ کر یعنی نئی تہذیب کے سانچے میں ڈھل جا، کیونکہ سر سید احمد خاں رہبر کہتے ہیں اور وہ قومی ترقی کی راہ و رسم منزل سے بے خبر نہیں ہیں۔ [2] یعنی جب صوفیوں کو قوالی کے بجائے لکچر سے۔ اور واعظوں کو حوران بہشت کے جلوؤں کی بجائے تھیٹر کی ایکٹریسوں سے دلچسپی ہونے لگی تو اب مذہب و روحانیت کی طرف کون متوجہ ہوگا اور کون توجہ دلائے گا۔

پہلے چرخ کے رف رف اب کمسریٹ کے اونٹ

حضرت اکبر سے سن کر یہ لطیفہ بزم میں
سب ہنسے کچھ رہ گئے خون جگر کے پی کے گھونٹ

شیخ جی رف رف[1] بنے پھرتے تھے پہلے چرخ پر (آسمان)
چشم بد دور (ماشاء اللہ) اب بنے ہیں آپ کمسریٹ[2] کے اونٹ

نئی روشنی والے شب تاریک کے جگنو

کودتے[3] پھرتے ہیں یہ باغ میں ملّھو (بندر) کی طرح
باغباں دبکے ہوئے بیٹھے ہیں اُلّو کی طرح

اُن[4] نئی روشنی والوں سے نہیں ہے کچھ فیض
شب تاریک (اندھیری رات) میں چمکا کریں جگنو (پٹ بیجنا) کی طرح

آگئی[5] زلف بتاں (معشوقاں مغربی) پر غالب (کنواری دیہاتیاں)
پیچ ہوتے تھے (داؤں) بہم (آپس میں) افعی (کالا سانپ) و راسُو (نیولا) کی طرح

اکبر اس عہد میں تو صبر و تحمل سے جو کام
اُس[6] سے بہتر ہے کہ غصہ کرو بابو (مراد بنگالی بابو) کی طرح

---

[1] رف رف۔ وہ سواری جس پر رسول اللہؐ معراج میں براق سے اُتر کر عرش الٰہی تک تشریف لے گئے۔ کمسریٹ لفظ انگریزی Commissariat یعنی محکمہ فراہمی غذا و ضروریات زندگی خصوصاً برائے افواج۔ مطلب یہ ہے کہ مولوی اور صوفی صاحبان پہلے تو آسمان سے باتیں کیا کرتے اور بڑے خدا رسیدہ بنتے تھے مگر اب وہ بھی کمسریٹ کے اونٹ ہو گئے۔ یعنی انگریزی حکومت کے اثر میں آگئے اور اس کی بیگاریں بھگتنے لگے۔ [3] مطلب یہ ہے کہ نئی روشنی والے دنیا میں بندروں کی طرح آزادی سے اُچکتے پھرتے ہیں۔ اور رہنمایان قوم اُلّو کی طرح چھپے ہوئے بیٹھے یہ تماشا دیکھ رہے ہیں۔ اور ان سے کچھ تعرض نہیں کرتے [4] یعنی یہ نئی روشنی والے اندھیری رات میں جگنو کی طرح چمکتے تو ضرور ہیں۔ یعنی اس تاریک دلی کے زمانہ میں بظاہر بڑے شاندار اور دلکش معلوم ہوتے ہیں۔ مگر بے مصرف و بیکار ہیں فائدہ ان سے کچھ نہیں پہنچتا۔ [5] معشوقان مغرب اور بتان نو کی زلفوں میں سانپ اور نیولے کی طرح داؤ پیچ ہوتے رہے۔ آخر کار سانپ نیولے پر غالب آگیا۔ یعنی مغربی اور ہندی معشوق دونوں نئی روشنی کے نوجوانوں کے دلوں پر اپنا سکہ جمانے کی کوشش کرتے رہے مگر مغربی حسن نے ہندی حسن کو مغلوب کر لیا۔ [6] یعنی مسلمانوں کے لئے اس زمانہ میں مناسب نہیں ہے کہ وہ بنگالیوں کی طرح انگریزوں کے خلاف اظہار غصہ و ناراضی کریں۔ اُن کو صبر و برداشت سے کام لینا چاہیئے۔

دُنیا پر لات مارنے سے پہلے قوت تو پیدا کرو

شیخ اس درجہ اناڑی ہے جو گھوڑے پر چڑھے
باگ گردن میں رکاب آ کے پھنسی ران میں ہو
لاتؔ دنیا پہ نہ مارو ابھی اے حضرت شیخ
بیٹھکیں کر لو ذرا زور تو کچھ ران میں ہو

کھانے کے لئے منجن رہنمائی کیلئے انجن

لذتؔ نانِ جویں تجھ کو مبارک اے شیخ
مجھ گنہگار کو ہے صرف منجن کافی
حضرتؔ خضر ٹکٹ مجھ کو دلا دیں اکبر
رہنمائی کے لئے ہے مجھے انجن کافی

۱؎ لات مارنا محاورہ بھی ہے یعنی بیزار و متنفر ہونا۔ بے تعلق ہونا۔ بیٹھکیں کرنا ایک ورزش ہوتی ہے جس میں بار بار اُٹھا بیٹھا جاتا ہے اور جس سے رانوں اور ٹانگوں میں قوت پیدا ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا کو لات مارنے یعنی دنیا سے قطع تعلق کرنے سے پہلے لات مارنے کی قوت اپنی ٹانگوں میں پیدا کر لو۔ یعنی پہلے اپنے اندر ایسی قوت اور قابلیت پیدا کر لو کہ تم قطع تعلق دنیاوی کی مشکلات و تکالیف کو برداشت کر سکو۔ ایسا نہ ہو کہ اناڑی پن سے گھوڑے پر سوار تو ہو جاؤ اور ایڑ لگاتے ہی گھوڑا ایسا دوڑے کہ اس کی لگام ہاتھ کی بجائے تمہاری گردن میں اور رکاب پنجوں کی بجائے تمہاری رانوں میں پھنس جائے اور تم بے بس ہو کر گھوڑے کے رحم و کرم پر رہو۔ گھوڑے پر سوار ہونے سے مراد یہاں دنیا سے بے تعلقی کی زندگی اختیار کرنے سے ہے ۲؎ موجودہ زمانہ کے رجحان طبع کا اظہار ہے کہ لوگ ایسا منجن سے جس سے جو کی روٹی کھانے میں لذت آئے اب گنہگار ہی رہنا پسند کرتے ہیں جیسے ان کو منجن کھانے کو ملتا ہے ۳؎ حضرت خضر سے مراد غالباً رہنمایان قوم ہیں مطلب شعر کا غالباً یہ ہے کہ رہنمیان قوم کی امداد کی ضرورت مجھے صرف اس حد تک ہے کہ وہ میرے لئے انگریزی تعلیم حاصل کرنے یا کوئی اچھی انگریزی ملازمت دلوانے کا انتظام کر دیں۔ اس کے بعد پھر مجھے ان رہنماؤں کی ضرورت باقی نہیں رہے گی اور میں مغربی تقلید و تعلیم کی روشنی میں کامیابی کی منزلیں طے کرتا چلا جاؤں گا۔ جس طرح کہ آدمی کے ریل میں بیٹھ جانے کے بعد ریل کا انجن خود ہی اسے منزل مقصود پر پہنچا دیتا ہے

نان پاؤ، خیالی پلاؤ۔ علی گڑھ کا بھاؤ

ہوتا ہے نفخ یوروپین نان پاؤ سے — میں خوش ہوں ایشیا کے خیالی[۱] پلاؤ سے
ایمان بیچنے پہ ہیں اب سب تلے ہوئے — لیکن خرید[۲] ہو جو علی گڑھ کے بھاؤ سے
دھمکا[۳] کے بوسہ لوں گا رخِ رشکِ ماہ کا — چندہ وصول ہوتا ہے صاحب دباؤ سے

ڈبل روٹی کھاؤ اور کلرکی کی خوشی سے پھول جاؤ

چھوڑ لٹریچر[۴] کو اپنی ہسٹری کو بھول جا — شیخ و مسجد سے تعلق ترک کر اسکول جا
چار دن کی زندگی ہے کوفت سے کیا فائدہ — کھا ڈبل روٹی کلرکی کر خوشی سے پھول جا

---

۱ خیالی پلاؤ پکانا ہوائی قلعے بنانے یا ایسے منصوبے سوچنے کو کہتے ہیں جو کبھی پورے نہ ہو سکیں۔ ڈبل روٹی کھانے سے نفخ ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ یورپین معاشرت اختیار کرنے سے بے چینی و بے اطمینانی بڑھ جاتی ہے اور نخوت و تمکنت بھی پیدا ہو جاتی ہے اور ایشیا والے اگرچہ خیالی پلاؤ پکایا کرتے یعنی شیخ چلی کے سے منصوبے بنایا کرتے ہیں مگر میں ایسے خیالی پلاؤ کے کھانے بجائے خوش ہوں کہ اس سے دل کو بے چینی تو نہیں ہوتی۔

۲ "علی گڑھ کے بھاؤ سے" یعنی اس شرط پر کہ جو امیدیں رہنمایان علی گڑھ یعنی سر سید وغیرہ انگریزی تعلیم و تہذیب حاصل کرنے کے متعلق دلوا رہے ہیں وہ پوری ہوں۔

۳ رشک ماہ اور چندہ کی معنوی مناسبت قابل غور ہے۔

۴ یہ نئی روشنی کے نوجوانوں کی موجودہ ذہنیت کا خاکہ ہے۔

اٹلی کی توپوں میں کیڑے پڑیں

نہ لیسنس ہتھیار کا ہے نہ زور — کہ ٹرکی کے دشمن سے جا کر لڑیں
رزولیوشن[1] بد دعا کر دو پاس — کہ اٹلی کی توپوں میں کیڑے پڑیں

شب فرقت، حکومت سے فرصت

حکومت[2] سے سبک دوشی ہے حاصل — رکھو بحث ترقی کو نظر میں
غنیمت ہے شب فرقت کی فرصت — رسالہ لکھو تحقیق کمر میں

---

[1] کیڑے پڑیں، عورتوں کا محاورہ ہے یعنی گل سڑ جائیں ناکارہ و برباد ہو جائیں یہ اشعار جنگ طرابلس کے زمانہ میں لکھے گئے ہیں جو ۱۹۱۳ء میں ٹرکی اور اٹلی میں ہوئی تھی۔ مطلب یہ ہے کہ ترکی کے دشمن اٹلی سے لڑنے کے لئے نہ تو ہمارے پاس ہتھیار ہیں اور نہ طاقت۔ دعا جو کچھ کارگر ہوتی وہ بھی ہمارے دلوں سے نہیں نکلتی۔ ہمارے پاس تو اٹلی کو شکست دینے کا یہی ایک ذریعہ ہے کہ جلسوں میں بد دعا کے رزولیوشن پاس کر کے عورتوں کی طرح کوسا جائے کہ اٹلی کی توپوں میں کیڑے پڑیں۔

[2] مطلب یہ ہے کہ جو قومیں دوسروں کی محکوم ہوتی ہیں اور ان پر حکومت کی ذمہ داریاں نہیں ہوتیں اُن کا دماغ مفید باتوں کے سوچنے کی بجائے ایسی فضول بحثوں میں الجھا رہتا ہے جو بالکل بے کار و بے نتیجہ ہوتی ہیں۔ شب فرقت کی فرصت سے مراد وہ زمانہ ہے جو وصل حکومت یعنی حکومت کے حاصل ہونے کے انتظار میں گزرتا ہے۔

بسکٹ سے شیر مال اچھی

ہے طریق جدید[۱] خشک مزاج — میرے حق میں قدیم چال اچھی
گو کہ اس میں ذرا ثقالت (ردّی طبیعت کا / ثقیل ہونا بھاری پن) ہے — پھر بھی بسکٹ سے شیر مال اچھی

ممبری پر جنگ سائیکل پر سواری

ملک[۲] پر تاثیرِ چشمِ دوٹ طاری ہوگئی — مفت شیخ و برہمن میں فوجداری ہوگئی
ہندوؤں[۳] کو کیوں نہ اب بھائی بنائیں صلح دوست — آریہ مذہب میں بھی توحید جاری ہوگئی
ممبری[۴] پر جنگ ہو اس میں گئو کا کیا قصور — ملک میں بدنام ناحق یہ بچاری ہوگئی

زبان آتی ہے کان جاتا ہے

عزیزانِ وطن کو پہلے ہی سے دیتا ہوں نوٹس — چرٹ اور چائے کی آمد ہے حقہ پان جاتا ہے
یہ اتنی[۵] گوش مالی طفلِ مکتب کی نہیں اچھی — زباں آتی ہے اس کو سچ ہے لیکن کان جاتا ہے

---

۱ طریق جدید پرانی وضع کے لوگوں کو خشک مزاج یا کھرا اس وجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں تکلفات و توصیفات کو بہت کم دخل ہوتا ہے اور ضوابط و قواعد کا زیادہ خیال رکھا جاتا ہے۔ انگریزی ناشتہ میں زیادہ تر بسکٹ ہوتے ہیں اور دیسی ناشتہ میں شیر مال۔ شیر مال کو بسکٹ سے زیادہ ثقیل ہونے کے باوجود پرانے لوگ اس لئے پسند کرتے ہیں کہ اس میں نئی روشنی کے بسکٹ کی طرح کرختگی اور سختی نہیں بلکہ تراوٹ اور نرمی ہوتی ہے ۲ مطلب یہ ہے کہ ہندو مسلمانوں کی نا اتفاقی اور اُن کے باہمی لڑائی جھگڑوں کی وجہ دراصل کونسلوں کے انتخابات اور ووٹ حاصل کرنے کے لئے فرقہ وارانہ اشتعال انگیزیوں سے کام لینا ہے ۳ یعنی صلح پسند مسلمانوں ہندوؤں کو بھائی بنانے کی تائید میں جو دلیل پیش کرنے لگے ہیں کہ آریہ سماجی ہندو بھی توحید کے قائل ہیں حالانکہ ہندو مسلمانوں کی نا اتفاقی کے بیج کو نشو و نما دینے میں سب سے زیادہ دخل آریہ سماجی مذہب ہی کو ہے ۴ مطلب یہ ہے کہ جنگ تو ہندو مسلمانوں میں ہوتی ہے کونسلوں کی ممبری پر مگر ہندو امیدواران ممبری گئو رکشا کا پروپیگنڈہ کر کے خواہ مخواہ گائے کو درمیان میں لاتے اور مسلمانوں میں گائے کشی کی ضد پیدا کرتے ہیں۔ ۵ مطلب یہ ہے کہ بچوں کی گوش مالی کرنے یعنی ان کو جسمانی سزائیں دینے سے بچے زبان تو سیکھ جاتے ہیں لیکن ان میں سننے اور سمجھنے اور سوچنے سمجھنے کی قوت پیدا نہیں ہوتی کیونکہ اُن کو سزا کے ڈر سے زیادہ تر رٹنے کی عادت پڑتی ہے۔ اور سننے سمجھنے کی قابلیت نہیں پیدا ہوتی۔ گوش مالی سے زبان آنے اور کان جانے کا لطف قابلِ غور ہے۔

مری[1] ڈاڑھی سے رہتاہے وہ بُت انکار پر قائم　　مگر جب دل دکھاتا ہوں تو فوراً مان جاتا ہے

آج کل کے شیریں فرہاد اور لیلیٰ مجنوں

اب[2] کہاں دست جنوں تار گریباں اب کہاں　　پانیر ہے دشتِ مجنوں اور خبر ہے تار کی

لے لیا شیریں نے کمسریٹ میں ٹھیکہ دودھ کا　　ریل بنوانے لگے فرہاد اب کہسار کی

کارونیشن ٹو مارونیشن

مفقود ہے گو کہ آج یارونیشن　　صد شکر ہوا ظہور کارونیشن

مانگو خالق سے حضرت جارج[3] کی خیر　　تم بھی ہو جاؤ گے ٹو مارونیشن

---

[1] مطلب یہ ہے کہ ڈاڑھی رکھنے والوں کے دل بھی اخلاص و محبت کے جذبات سے خالی نہیں ہوتے۔

[2] تار یعنی تانا جس کا مقابل پود یعنی بانا ہے۔ گریبان قمیص وغیرہ کے اس حصہ کو کہتے ہیں جو گردن کو گھیرے ہوتا ہے۔ مجنوں۔ قیس عامری لیلیٰ کا مشہور عاشق جو عشق میں پاگلوں کی طرح جنگلوں میں پھرتا اور گریبان کو پھاڑ کر تار تار کر دیا کرتا تھا۔ شیریں فارس کے بادشاہ خسرو پرویز کی ملکہ تھی۔ فرہاد جسے کوہکن بھی کہتے ہیں شیریں پر عاشق ہو گیا۔ وصل کی شرط یہ ٹھیری کہ فرہاد کوہ بے ستون سے نہر کھود کر شیریں کے محل میں لائے اور اُس کے ذریعہ سے دودھ محل میں پہنچائے۔ جب کام تکمیل کو پہنچ گیا تو بادشاہ نے مشہور کر دیا کہ شیریں مر گئی فرہاد اپنے سر میں تیشہ مار کر مر گیا۔ ان اشعار میں آج کل کی عاشقی اور معشوقی پر طنز کیا گیا ہے کہ آج کل کے مجنوں جنگلوں میں پھرنے اور گریبان کو تار تار کرنے کی بجائے اخبار پانیر (انگریزی کا ایک مشہور روزنامہ) میں تار کی خبریں پڑھا کرتے ہیں اور آج کل کے شیریں اور فرہاد انگریزی حکومت کی ٹھیکہ داری کر رہے ہیں

[3] جارج یعنی شاہ جارج پنجم V GEORGE شاہ انگلستان و شہنشاہ ہندوستان جن کا دربار تاج پوشی سنہ ۱۹۱۱ء میں دہلی میں ہوا تھا اور بادشاہ اور اُن کی ملکہ میری

(باقی صفحہ ۲۱۴ پر)

بی نصیبن پڑھ کر بھی بی نصیبن ہی رہیں

ترقی کی تپیں ہم پر چڑھا کیں — گھٹا کی دولت اسپیچیں بڑھا کیں
رہیں[1] ہر پیپر کے آیا بی نصیبن — وہ گو اسکول میں برسوں پڑھا کیں

شیخ جی دوست بھی اور غلام بھی

کعبہ میں جلوہ گر رہی دیر میں مستتر رہی — لیتے ہیں ہم خدا کا نام کہتے ہیں رام رام بھی
بولی[2] وہ مس کہ شیخ جی پہلے مرے حریف تھے — اب سمجھ اُن کو آگئی دوست بھی ہیں غلام بھی

انگریز خوش۔ ہندو مگن۔ ہم ڈھول میں پول

انگریز خوش ہے مالک ایروپلین ہے — ہندو مگن ہے اس کا بڑا لین دین ہے
بس[3] اک ہمیں ہیں ڈھول میں پول اور خدا کا نام — بسکٹ کا صرف چور ہے لمنڈ کا پھین ہے

(صفحہ ۲۱۳ کا بقیہ فٹ نوٹ) نے خود اس میں شرکت کی تھی۔ لفظ انگریزی کارونیشن میں الفاظ کار اور نیشن کے ہونے سے حضرت اکبر نے تفاؤل کیا۔ یعنی یہ اچھا شگون لیا ہے کہ شاہ جارج کے کارونیشن کے بعد ہندوستانی بھی جن پر آج قوم ہونے کا اطلاق نہیں ہوتا ایسے کاموں میں لگ جائیں گے کہ کل وہ بھی ایک قوم کہلانے لگیں گے۔ [1] مطلب یہ ہے کہ ترقی کرنے کے ولولے اور امنگیں تو بہت پیدا ہوئیں۔ مگر اُن کا نتیجہ بس یہ نکلا کہ قومی کاموں اور خوش حالی تو گھٹ گئی مگر تقریریں بہت اور بڑی زوردار ہونے لگیں۔ مسلمان عورتوں نے کئی کئی سال اسکولوں میں پڑھنے کے بعد بھی بس یہ ترقی کی کہ ان کو آیا گیری یعنی کم حیثیت کی نوکریاں ملنے لگیں۔ [2] مطلب یہ ہے کہ زمانہ کے اثر سے مسلمانوں کے مذہبی تعصبات بھی اب بہت کم ہو گئے ہیں ان کو بت خانہ میں خدا کا جلوہ نظر آنے لگا ہے اور وہ خدا کو رام کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں، کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے پہلے انگریزی تہذیب سے اُن کو دشمنی تھی اب اس تہذیب کے وہ دوست ہی نہیں بلکہ غلام ہو گئے ہیں۔ [3] ڈھول میں پول: محاورہ ہے۔ ظاہری نمائش بہت، اندر کچھ نہیں۔ "خدا کا نام" محاورہ ہے معنی کچھ نہیں۔ "بسکٹ کا چورا اور لیمنڈ کا پھین۔" ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انگریزوں کی تقلید تو ہم کر رہے ہیں مگر ہماری مثال بسکٹ کے چورے اور لیمنڈ کے پھین کی سی ہے کہ بس دیکھنے ہی دیکھنے کے ہیں اندر کچھ نہیں۔

آب و دانے کی حکمرانی

مِل کا آٹا ہے نل کا پانی ہے
آب و دانے کی حکمرانی ہے

اک ادا سے کہا مسوں نے کم آن
ٹیر کی مچھ پہ آب روانی ہے

نام کے مُسلمان ہونے کی برکت

مزے کا جشن تھا کل اک شراب خانے میں
کسی نے خوب یہ گایا کسی ترانے میں

خدا کے فضل سے ہم نام کے مسلماں ہیں
وگرنہ چین سے رہتے نہ اس زمانے میں

لہ نہ تو آٹا اب ہمارے گھروں کی چکیوں میں پستا ہے اور نہ پانی ہمارے گھروں کے کنوؤں سے نکلتا ہے۔ آٹے کے لئے آٹا پیسنے کی مشینوں کے اور پانی کے لئے نلوں کے محتاج ہو گئے ہیں۔ گویا آب و دانہ ہمارے قبضہ میں نہیں بلکہ ہم آب و دانہ کے قبضہ میں ہیں اور حکومت جب چاہے ہمارا آب و دانہ بند کر سکتی ہے۔ اس لئے ہم انگریزوں کے اشاروں پر ناچنے اور اُن کے ہر حکم کی بسر و چشم تعمیل کے لئے تیار رہتے ہیں۔

ع یعنی اس زمانہ میں جو ہم شراب خانوں میں جشن مناتے ہیں اور چین سے رہ رہے ہیں وہ صرف اس وجہ سے کہ نام کے مسلمان ہیں اگر سچ مچ کے مسلمان ہوتے تو نہ یہ رنگ رلیاں کر سکتے اور نہ حکومت چین سے ہمیں جینے دیتی۔

مضمون رہ گیا اور جوتا چل گیا

میرے منصوبے ترقی کے ہوئے سب پائمال
بیج مغرب نے جو بویا وہ اُگا اور پھل گیا

بوٹ[1] ڈاسن نے بنایا میں نے اک مضموں لکھا
ملک میں مضموں نہ پھیلا اور جوتا چل گیا

اُن کو لطفِ مستی آیا، ہم بدمستی سے اُلو ہو گئے

درس[2] تھا یکساں مگر وہ تو مسیحی ہی رہے
تجھ پہ مذہب کے عوض شیطان کا قابو ہو گیا

ایک ہی بوتل سے پی ہوٹل میں دونوں نے شراب
لطفِ مستی اُن کو آیا اور تو اُلو ہو گیا

---

[1] ڈاسن جفت سازی کے ایک مشہور کارخانہ کے انگریز مالک کا نام ہے۔ جوتا چل گیا محاورہ ہے جس کے معنی جوتا مقبول ہو گیا، کے بھی ہیں اور آپس میں جوتی پیزار یعنی لڑائی جھگڑا ہو جانے کے بھی۔ مطلب یہ ہے کہ قومی ترقی کے ہمارے سارے منصوبے تو خاک میں مل گئے اور کسی میں ہم کو کامیابی نہیں ہوئی۔ لیکن انگریزوں کے سب بوئے ہوئے بیج اُگے اور بار آور ہوئے۔ یعنی انگریزوں کی اپنی تجارت کے فروغ دینے اور ہندوستانیوں میں آپس میں پھوٹ ڈلوانے کی ساری حکمت عملیاں اور چالیں کامیاب ہو گئیں۔ قومی ترقی و باہمی اتحاد کی تلقین کے مضامین کا تو کوئی اثر نہیں ہوا۔ لیکن ڈاسن کے کارخانے کے جوتے ہندوستان میں مقبول ہو گئے اور آپس میں اتحاد ہونے کی بجائے ہم ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے لگے۔

[2] مطلب یہ ہے کہ سکولوں اور کالجوں میں اگرچہ ہندوستانی مسلمانوں کو بھی تعلیم وہی دی جاتی تھی جو انگریزوں اور عیسائیوں کو مگر انگریز اور عیسائی تو اپنے مذہب پر قائم رہے لیکن مسلمان مذہب سے منہ موڑ کر شیطان کے پھندے میں پھنس گئے اور دہریت کی طرف راغب ہو گئے۔ تعلیم کی شراب ایک ہی تھی۔ مگر انگریزوں نے اس شراب سے سرور کا لطف اٹھایا اور مسلمان اس کو پیکر اُلو یعنی بدست و حواس باختہ ہو گئے۔

مغربی فانوس اور خرقۂ سالوس

روشنی[1] سر میں اور گداز غم دل مایوس میں — شمع سا ہم جل رہے ہیں مغربی فانوس میں
(پگھلنا) (مثل شمع کے) (الوہ مغربی تقلید)
روکنا زور و ریا سے ہوں تو فرماتے ہیں وہ — آج کل برکت بڑی ہے خرقۂ سالوس میں
جھوٹ (فریب۔ مکر، مکاری۔ ظاہر داری) (دردیدہ گودڑی۔ لباس۔ دھوکہ بازی۔ ریاکاری)

غزالی و رومی کی بجائے سپنسر و مل

تل[2] کھیت میں مل جائے تو گودام میں لے جائیں — کیا فائدہ عارض پہ کسی بت کے جو تل ہے
(رخسار) (معشوق)
تنخواہ کے بل[3] سے ہمیں ہوتی ہے مسرت — اور شیخ یہ کہتا ہے کہ یہ سانپ کا بل ہے

غزالی[4] و رومی کی بھلا کون سنے گا
محفل میں چھڑا نغمۂ اسپنسر و مل ہے

---

[1] مطلب یہ ہے کہ مغربی تقلید جس کی انگریزی حکومت حفاظت و اعانت کر رہی ہے اُس کا پھل ہم کو یہ مل رہا ہے کہ ہمارے سر تو شمع کی لو کی طرح روشن ہیں یعنی بظاہر تو ہم بڑی ترقی کر رہے ہیں اور ہمارے دماغوں میں بڑے اونچے خیالات آ رہے ہیں لیکن حقیقت میں ہم شمع کی طرح پگھلتے چلے جا رہے ہیں اور ہمارے زندہ رہنے کی کوئی امید نہیں رہی ہے۔ نمایش اور ریاکاری کے ہم دل دادہ ہو گئے ہیں اور یہ سمجھنے لگے ہیں کہ آج کل سارے کام ریاکاری و دھوکہ بازی ہی سے چلتے ہیں۔ [2] تل کے معنی کنجد کے بھی ہیں (یعنی ایک قسم کا تخم جس سے تیل نکلتا ہے) اور خال کے بھی یعنی وہ سیاہ نقطہ جو انسان کی جلد پر ہوتا ہے اور جس کا کسی حسین کے رخسار پر ہونا شاعروں کی نظر میں اس کے حسن کو دوبالا کر دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نئی روشنی کی خالی دکھاوے کی باتوں اور بناوٹوں سے تو ہمارا کچھ بھلا ہوتا نہیں ضرورت اس کی ہے کہ ہماری مالی اور اقتصادی حالت درست ہو۔ [3] بل انگریزی لفظ بھی ہے Bill بمعنی فرد حساب قبض الوصول ہندی اور بل اُردو میں اس زمین یا دیوار کے سوراخ کو بھی کہتے ہیں جس میں چوہے اور سانپ وغیرہ رہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ انگریزوں کی نوکری کی جو ماہانہ تنخواہ ہم کو ملتی ہے اس سے ہم کو تو خوشی ہوتی ہے۔ مگر پُرانے خیال کے لوگ ہماری تنخواہ کے بل (قبض الوصول) کو سانپ کا بل بتلاتے ہیں یعنی اُن کے نزدیک تنخواہ کے لالچ میں انگریزوں کی جو نوکری کی جاتی ہے وہ ہماری تہذیب اور ہماری قومیت کے لئے مُہلک ہے [4] غزالی۔ امام غزالی (محمد ابن محمد ابو حامد الغزالی وفات ۱۱۱۱ء) مشہور اسلامی عالم و متکلّم و فقیہہ و محدث و فلسفی گزرے ہیں۔ اُن کی بہت سی تصانیف ہیں۔ جن میں احیاء العلوم اور کیمیائے سعادت وغیرہ بہت مشہور ہیں۔

(باقی صفحہ ۲۱۸ پر)

خالی خولی واہ واہ

پرچہ رکھا جو اس نے میں یہ سمجھا ! پاکٹ میں یہ بیس روپیہ کا نوٹ گیا
گھر پہ کھولا تو بس یہی لکھا تھا ! کیا شعر تھے واہ واہ میں لوٹ گیا

تعلیم مغربی سے قوم کے زنانوں کا پردہ کھل گیا

دکھائی فلسفۂ مغربی نے وہ مردی کہ پردہ کھل گیا اس قوم میں زنانوں[1] کا
پری[2] کی زلف میں الجھا نہ ریش واعظ میں دل غریب ہوا لقمہ امتحانوں کا
وہ[3] حافظہ جو مناسب تھا الشیا کے لئے خزانہ بن گیا یورپ کی داستانوں کا

(صفحہ ۲۱۷ کا بقیہ فٹ نوٹ) رومی = یعنی مولانا جلال الدین رومیؒ جن کی مثنوی معنوی بہت مشہور اور اسلامی تصوف کی ایک بے نظیر کتاب ہے اور جو مشہور سالک مجذوب حضرت شمس تبریزؒ کے خاص معتقد و معتمد تھے (وفات ۶۷۲ء) اسپنسر = ہربرٹ اسپنسر Herbert Spencer انگلستان کا ایک مشہور مصنف و فلسفی جس کی کتاب اصول نفسیات کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ڈارون کے نظریہ ارتقا کی داغ بیل اسی میں رکھی گئی تھی (وفات ۱۹۰۳ء) مل = جان اسٹورٹ مل (John Stuart Mill) انگلستان کے مشہور دہریہ فلسفی تھے جن کی کتاب UTILITARIANISM بہت مشہور ہے (وفات ۱۸۷۳ء) یعنی آجکل جسے دیکھو سپنسر اور مل کے فلسفوں کا گرویدہ ہے۔ اب امام غزالی اور مولانا روم کی تصانیف پر کون عمل کرتا ہے۔

[1] زنانہ = یعنی مخنث - ہیجڑا - نامرد - قومی زنانوں سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے مذہبی عقائد کمزور اور قوم پرستی محض نمائشی ہو۔ مطلب یہ ہے کہ جن مسلمانوں کے مذہبی عقائد کمزور تھے ان پر فلسفۂ مغربی حاوی ہوگیا اور وہ لامذہبی کی طرف مائل ہوگئے۔ [2] مطلب یہ ہے کہ موجودہ نقائص تعلیمی اور امتحان پاس کرنے کی محنتوں اور پریشانیوں کی وجہ سے آجکل بجائے اس کے کہ تعلیم سے طالب علموں کی دماغی صلاحیتیں ابھریں اور بڑھیں وہ بالکل ہی ٹھٹر کر رہ جاتی ہیں نہ دماغوں میں قوت رہتی ہے نہ دلوں میں امنگ - یہانتک کہ محبت کرنے کا جیسا فطری جذبہ بھی ماند پڑجاتا ہے نہ خدا اور خدا پرستوں سے محبت ہوتی ہے اور نہ حسینوں اور مہ جبینوں سے۔

[3] یعنی بجائے اس کے کہ ہمارے حافظے ہماری قومی اور ملکی روایات اور کارناموں کے خزانے بنتے وہ یورپ و اہل یورپ کی تاریخ اور ان کے کارناموں کے خزانے بن رہے ہیں۔

اپنے حلوے مانڈے سے کام رکھو[1]

زرِ قوم سے یوں کیے ایسے سامان کرو ... جس سے کہ تمہاری بزم بن جائے بہشت

حلوے مانڈے سے کام رکھو بھائی ... مردہ دوزخ میں جائے یا پائے بہشت

تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے قوم

تجھ کو کیا کسی کی ہوا نے فدائے گل ... مجھ کو کیا کسی کی ادا نے فدائے قوم

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں ... تو ہائے گل[2] پکار میں چلاؤں ہائے قوم

تسبیح پر درود کے بجائے دہائی صاحب کی

ہے عجب انقلاب دنیا میں ... کیا کہوں بات بھائی صاحب کی

---

[1] اپنے حلوے مانڈے سے کام رکھنا محاورہ ہے بمعنی ہر حال میں اپنا بھلا چاہنا۔ اپنی غرض اور نفع کو مقدم رکھنا۔ مردہ دوزخ میں جائے یا بہشت میں۔ یہ بھی محاورہ ہے بمعنی خواہ کوئی مرے یا جیے۔ خواہ کسی کو نفع پہنچے یا نقصان آج کل کے لیڈروں کی خود غرضیوں کا حال بیان کیا گیا ہے کہ اُن کو قوم کے نفع نقصان سے کچھ غرض اور مطلب نہیں ہے۔ اُن کا مقصد صرف یہ ہے کہ قوم سے چندے وصول کر کے اپنی جیبیں بھریں اور گل چھرّے اُڑائیں۔ [2] یہ شعر کسی اور مشہور شاعر کا ہے جس نے ہماری زبان میں ایک ضرب المثل کی سی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اصل شعر میں "ہائے قوم" کے بجائے "ہائے دل ہے" مطلب یہ ہے کہ جس طرح بلبل گل کے عشق میں نالے کرتا ہے اسی طرح آج کل کے قوم پرست قوم کے عشق میں ہائے قوم ہائے قوم کرتے ہیں۔ مگر نہ گل کو بلبل سے کوئی فائدہ پہنچتا ہے۔ نہ قوم کو آج کل کے قوم پرستوں سے۔

اب وہ تسبیح پر بجائے درود پڑھ رہے ہیں[۱] دُہائی صاحب کی

جنّات کی خدمت پریوں کی خوشامد

دن[۲] تو جنّات کی خدمت میں بسر ہوتا ہے رات پریوں کی خوشامد میں گذر جاتی ہے

سلف رسپکٹ کا وقت آئے کہاں سے اکبر دیکھ تو غور سے دنیا کو کدھر جاتی ہے

پل صراط کے لئے بائیسکل

یاروں کو فکر روز جزا کچھ نہیں رہی بس کام ہے اُنہیں رہ عیش و نشاط سے

کہتے ہیں حرج کیا ہے جو باریک ہے وہ پل بائیسکل پہ گزریں گے ہم پُل[۳] صراط سے

---

۱ یعنی تکلیف اور مصیبت میں خدا و رسول کو یاد کرنے کی بجائے انگریزوں کے پاس فریادیں لے جاتے اور اُن کی پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ ۲ یعنی دن کو تو انگریزوں کی نوکری کرنی پڑتی ہے۔ اور رات کو انگریز افسروں کی بیویوں کی خوشامد تاکہ افسر خوش رہیں۔ پھر ایک نوکر اور خوشامدی کے لئے عزت و خودداری کا کیا سوال باقی رہ جاتا ہے۔ دنیا کا کچھ رنگ ہی بدل گیا ہے پہلے عزت و خودداری ہی سب کچھ تھی اور اب پیٹ اور انگریزوں کی خوشنودی میں سب کچھ ہے۔

۳ پل صراط۔ اسلامی روایتوں کے مطابق دوزخ پر ایک پل ہے جو بال سے باریک اور تلوار کی طرح تیز ہے جس پر سے قیامت کے دن نیک اور بد سب کو گزرنا پڑے گا۔ نیکوں کے لئے یہ چوڑا ہو جائے گا اور وہ آسانی سے اُس پر سے گزر کر جنت میں پہنچ جائیں گے اور بد لوگ کٹ کٹ کر جہنم میں گریں گے۔

مطلب یہ ہے کہ نئی روشنی والوں کو روز جزا کا کچھ فکر نہیں رہا۔ بجائے روز جزا کے خیال سے اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرنے کے وہ پل صراط وغیرہ کی روایات کا مذاق اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پُل صراط باریک ہے تو ہوا کرے۔ ہم بائیسکل پر چڑھ کر اُسے پار کرلیں گے۔

لیلیٰ نے سایہ پہنا مجنوں نے کوٹ

لیلیٰ نے سایہ پہنا مجنوں نے کوٹ پہنا! ٹوکا جو میں نے بولے بس بس خموش رہنا
حسن و جنوں بدستور اپنی جگہ ہیں لیکن ہے لطف بحر ہستی فیشن کے ساتھ بہنا

شیوخ شہر اور شیوخ کیمپ

اکثر اسی ہوس میں بنے ہیں کلوخ کیمپ اُس کے خوشا نصیب جسے ہو رسوخ کیمپ
اب شیخ شہر رہ گئے مُردوں کے واسطے زندوں کو لے مریں گے ہمارے شیوخ کیمپ

لہ یعنی نئے فیشن کی گرویدگی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ معشوقوں کے انگریزی لباس اختیار کرنے میں عاشقوں کے جنون کا بھی رنگ بدل گیا ہے۔ مجنوں جو کبھی گریبان کو پارہ پارہ کردیا کرتا اور جنگل میں نیم عریاں پھرا کرتا، اب کوٹ پتلون پہننے لگا ہے۔ معشوق اور عاشق دونوں ہی کو نیا فیشن اختیار کرنے میں زندگی کا لطف آنے لگا ہے۔ ٹہ کلوخ مٹی کے کچے یا پکے ڈھیلے کو کہتے ہیں۔ کلوخ کیمپ بننے سے مراد ہے انگریزوں کی خدمت و خوشامد میں بچھ جانا اور اپنی عزت و خودداری کو بالائے طاق رکھ دینا۔ یعنی ہمارے مذہبی مقتدا اپنی سب سے بڑی خوش نصیبی اس میں سمجھنے لگے ہیں کہ انگریزوں کے کیمپوں میں اُن کو رسوخ و اقتدار حاصل ہو۔ قوم بھی ایسے ہی بارسوخ مقتدایان مذہب کی عزت و وقعت کرنے لگی ہے۔ جو مذہبی لوگ انگریزوں سے الگ تھلگ رہتے ہیں اُن کا کام بس یہ رہ گیا ہے کہ مُردوں کی تجہیز و تکفین کر دیا کریں۔ یعنی کوئی دنیاوی عزت ان کی باقی نہیں رہی ہے۔ لیکن قوم کے جو ناعاقبت اندیش انگریزوں تک رسائی رکھنے والے شیوخ کی قدر کر رہے ہیں۔ اُن کو یہ خبر نہیں کہ یہ انگریز رس مذہبی پیشوا اپنے ساتھ ساری قوم کو لیکر ڈوبیں گے اور پرانی روش کے مذہبی لوگ تو مُردوں کو آخری منزل تک پہنچاتے ہیں یہ نئے فیشن کے مولوی زندہ مسلمانوں کو مردہ کر دیں گے۔

رز ہیپا زر ندار دہس کی کثرت سیم گم

ختنہ[1] قائم ہے مگر وہ مذہبی تعلیم گم
مُہر ابراہیم باقی دین ابراہیم گم!

حسرت عشاق بازار جہاں میں کچھ نہ پوچھ
رز[2] ہیپا زر[3] ندار دہس[4] کی کثرت سیم گم!

شہر دل کے واسطے اب ان بتوں سے کیا لڑیں
کر چکے ہیں کھائی صاحب، ہم تو ہفت اقلیم[5] گم

(حواشی بین السطور: شراب انگور، ناکتخدا لڑکی، چاندی)

جنت میں فوٹو ہو تو دوزخ میں جانے کے لیے تیار

آبرو (عزت) اگر ملے جو ہے نام و نمود میں
کیا حرج زندگی ہو اگر حال زشت (خراب و خستہ) میں

دوزخ کے داخلے میں نہیں اُن کو عذر کچھ
فوٹو[1] (تصویر) کوئی لگا دے جو اُن کا بہشت میں

---

[1] ختنہ جسے سنت اور مسلمانی بھی کہتے ہیں یعنی لڑکے کے عضو مخصوص کے زائد چمڑے کو کاٹ دینا۔ یہ طریقہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نکالا تھا اور اسی وجہ سے اس کو سنت ابراہیمی کہا جاتا ہے۔ اور وہ گویا مختون (جس کا ختنہ ہوا ہو) کے دین ابراہیمی پر ہونے کی مُہر یا تصدیق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہماری مسلمانی یعنی ملت ابراہیمی کی پیروی (کیونکہ ملت اسلام اور ملت ابراہیمی دراصل ایک ہی ہیں) محض ظاہرداری اور نام کی رہ گئی ہے اور تعلیمات اسلام سے ہم بہت دور چلے گئے اور بالکل بیگانہ ہو گئے ہیں۔ [2] رز کے معنی انگور کے ہیں۔ مگر مجازاً انگور کی شراب کو بھی کہتے ہیں جیسے دُختِ رز کہا جاتا ہے۔ [3] زر کے معنی ہیں سونا۔ [4] مس فارسی میں تانبہ کو کہتے ہیں اور انگریزی میں ناکتخدا لڑکی کو۔ یعنی عشق بازوں اور عیاشوں کے سامنے اگر ناکتخدا لڑکی بھی ہو اور شراب بھی مگر اس کی جیب میں اتنے پیسے نہ ہوں کہ ان تعیش کے سامانوں سے لطف اندوز ہو سکے تو اس کو بڑی حسرت ہوتی ہے۔ آج کل کے قومی نوجوان بھی اسی حسرت کا شکار ہو رہے ہیں کہ سامان تعیش تو روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں مگر ان کی آمدنیاں اتنی نہیں ہیں کہ ان عیش و عشرت کے سامانوں سے لطف اندوز ہو سکیں۔ [5] ہفت اقلیم یعنی سات ملک۔ مراد تمام دنیا سے ہے کیونکہ اس زمانہ میں جتنی دنیا معلوم تھی حکما نے اس کو سات حصوں میں تقسیم کیا تھا

(باقی صفحہ ۲۲۳ پر)

اس زمانے میں خدا کا ذکر

حریفوں[۱] نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر ذکر کرتا ہے خدا کا اس زمانے میں

انوکھے ہیں مشاغل حضرت اکبر کے ان روزوں
الم تر کیف[۲] بیٹھے پڑھ رہے ہیں فیل خانے میں

مریدان کے تو شہروں میں اڑے پھرتے ہیں ہو ہو کر
نظر آتے ہیں لیکن شیخ جی اب تک میانے[۳] میں

حباب اور موجوں کا ساتھ

مغرب[۱] نے سایہ ڈالا بتوں پر اثر کے ساتھ
ساری بھی ان کی ہو گئی غائب کمر کے ساتھ

ہستی[۲] ہی تیری کیا ہے کہ ہو اُن کا ہم سفر
موجوں کا اے حباب نہ دے تو اُبھر کے ساتھ

(صفحہ ۲۲۲ کا بقیہ فٹ نوٹ) ہر ایک حصّہ کا نام اقلیم تھا۔ یہ سات حصّے حسب ذیل تھے۔ عرب۔ ایران۔ توران۔ ہند۔ چین۔ مصر۔ یونان۔ مطلب یہ ہے کہ ہم جو عشق و ہوس رانی میں اپنی ساری سلطنتیں گنوا بیٹھے ہیں اب محض اپنے ایک چھوٹے سے دل کے لئے ان مغربی معشوقوں سے کیا لڑیں۔

[۱] مطلب یہ ہے کہ نام و نمود اور شہرت و عزت پر ہم اس قدر فریفتہ ہو رہے ہیں کہ اس کے لئے زندگی میں ہر قسم کی تکلیفیں اٹھانے کے لئے تیار رہیں یہاں تک کہ اگر ہم سے یہ کہا جائے کہ تم دوزخ میں چلے جاؤ تو ہم اس کے لئے بھی تیار ہو جائیں گے کیونکہ جنت میں فوٹو لگ جانے سے (تمہارا فوٹو جنت میں لگا دیا جائیگا) ہماری عزت و شہرت تو ہوگی۔

[۱] یعنی اس زمانہ میں خدا کا ذکر کرنا بھی ایک تعزیری جرم ہو گیا ہے۔ [۲] یعنی قرآن مجید کی سورۂ الفیل جس کی پہلی آیت ہے اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصْحٰبِ الْفِیْلِ ترجمہ: کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے پروردگار نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا۔ اس سورۃ میں طلوع اسلام سے پہلے کے اس واقعہ کا ذکر ہے جبکہ یمن کے ایک بادشاہ ابرہا نامی خانۂ کعبہ کے گرا دینے کے ارادے سے ہاتھیوں کے ایک بڑے لشکر کے ساتھ چڑھائی کی تھی اور خدا کی طرف سے اُس کے مقابلے کے لئے ایسے پرندے بھیجے گئے تھے جن کی چونچوں اور پنجوں میں عذاب کی کنکریاں تھیں۔ جس پر ایک کنکری لگتی وہ وہیں رہ جاتا یہاں تک کہ ابرہا کا سارا لشکر مع ہاتھیوں کے تباہ ہو گیا۔ فیل خانہ سے مراد ہے انگریزوں کی طاقتور حکومت۔ مطلب یہ ہے کہ انگریزوں کی طاقتور حکومت کا مقابلہ کرنے کی جن خدا ترسوں میں قوت نہیں ہے وہ قرآن مجید کی سورۂ الم تر کیف کو پڑھ کر ابرہا کی بربادی کے واقعہ کو یاد کر رہے ہیں اور اس کے متوقع ہیں کہ خدا اپنی قدرت سے کوئی سامان انگریزوں کی بربادی کا بھی پیدا کر دے گا۔ [۳] میانہ۔ ایک قسم کی سواری یا پالکی ہے جسے کہار کندھوں پر لے جایا کرتے تھے اور پہلے زمانہ میں شریف معزز لوگ شہر میں ایک جگہ سے دوسری جگہ اس پر آیا جایا کرتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ آج کل مشائخ اور پیر تو ابھی تک اپنی پرانی

(باقی صفحہ ۲۲۴ پر)

وظیفہ کی جگہ پانیر

اذانوں سے سوا بیدار کن انجن کی سیٹی ہے
اسی پر شیخ بیچارے نے چھاتی اپنی پیٹی ہے

کہاں باقی رہے ہم میں وہ اورادِ سحر گاہی
وظیفہ کی جگہ یا پانیر یا آئی۔ ڈی۔ ٹی ہے

مسلم تو جا چکے تھے مومن بھی چلے

تھا اس کسی قدر سو وہ دن بھی چلے!
ظاہر ہی کی سمت اہل باطن بھی چلے

مجلس پہ ہوا اضافہ، کانفرنس
مسلم تو جا چکے تھے مومن بھی چلے

(صفحہ ۲۲۳ کا بقیہ فٹ نوٹ) وضع کو نبھا رہے ہیں۔ لیکن ان کے مرید نئی روشنی کے گرویدہ ہو گئے ہیں ۴؎ سایہ کے معنی پرچھائیں کے بھی ہیں۔ اور سایہ اس لہنگے کی طرح کے لباس کو بھی کہتے ہیں جو انگریز عورتیں پہنا کرتی ہیں۔ ساری یا ساڑی ایک قسم کی لمبی دھوتی ہوتی ہے جو ٹانگوں پر لپیٹی بھی جاتی ہے اور سر پر اوڑھی بھی جاتی ہے۔ پہلے یہ پہناوا صرف ہندوؤں کا تھا مگر اب عام فیشن میں داخل ہو گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پہلے تو مغربی روش کا اثر صرف یہی ہوا تھا کہ مذہب اور قومیت کی کمر ٹوٹ گئی تھی۔ مگر اب اس نے یہاں تک ترقی کر لی ہے کہ ساڑی جیسے ستر پوش لباس کو بھی عورتیں چھوڑ کر سایہ پہننے لگیں اور نیم عریاں رہنے لگی ہیں۔ ۵؎ مطلب یہ ہے کہ انگریزوں کے مقابلہ میں تمہاری حیثیت ایسی ہی ہے جیسے موجوں کے مقابلہ میں پانی کے بلبلہ کی۔ بلبلہ اگر اپنی حیثیت کو بھول کر موجوں کے ساتھ چلنے کی کوشش کرے گا تو کسی موج کے ایک ہی تھپیڑے سے فنا ہو کر پانی کی طرح بہہ جائے گا۔

۱؎ بڑے بڑے صنعتی شہروں میں کارخانے کے مزدوروں کو بیدار کرنے کے لئے بھونپو اور سیٹیاں بھی بجائی جاتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مذہبی فرائض کی ادائیگی کے مقابلہ میں دنیاوی فرائض کے وقت پر انجام دینے کا احساس لوگوں میں بڑھتا جا رہا ہے اور علی الصباح نماز اور وظایف کی بجائے انگریزی اخبارات کا مطالعہ کیا جانے لگا ہے۔ مذہب سے روگردانی کا یہی بڑھتا ہوا رجحان سچے خدا پرستوں کے دلوں کو تکلیف دے رہا ہے اور وہ اس پر ماتم و افسوس کر رہے ہیں۔
۲؎ مطلب یہ ہے کہ انگریزی حکومت کے آنے سے اگرچہ اسلام میں بہت کمزوری پیدا ہو گئی تھی۔ مگر ملک میں کچھ امن و امان مضبوط ہو گیا تھا۔ مگر اب سیاسی کانفرنسیں بھی شروع ہو گئی ہیں اور ان میں اہل ظاہر یعنی صرف مولوی اور مفتی ہی نہیں بلکہ اہل باطن یعنی صوفی اور مشایخ بھی حصہ لینے لگے ہیں جس کا اثر ایک طرف تو یہ ہو رہا ہے کہ مسلمانوں کے ایمان بھی ڈگمگانے لگے ہیں اور خدا پر بھروسہ چھوڑ کر وہ مادّی قوتوں پر بھروسہ کرنے لگے ہیں اور دوسری طرف ملک کا امن و امان بھی خطرہ میں پڑ گیا۔

نزع کے وقت لیسین کے بجائے فوٹو

زندگی تھی ہی مصیبت موت بھی برباد ہے
کس قدر اس دور میں بگڑا ہوا ہے دین ہائے

ماسٹر ہیں نزع (جاں کنی) میں لڑکوں کی شامت (بدنصیبی) دیکھئے
ان کا فوٹو لیتے ہیں پڑھتے نہیں لیسین ہائے

اولڈ بوائے کے بعد اولڈ گرل

نکلا آب و تاب بنارس سے اولڈ بوائے
اللہ اس کو گولڈ (Gold) بھی دے اور پرل بھی

خواہش ہے اب یہ بعض محبانِ قوم کی
نکلے کسی طرف سے یوں ہی اولڈ گرل (Old GiRL) بھی

عزتیں اب بھی ہوتی ہیں مگر ذلت کے ساتھ

احتمالِ فتنہ ہے ہر مجمع ملت کے ساتھ
گشت کرتی ہے پولیس بھی شیخ کی جنت کے ساتھ

لہ جاں کنی کے وقت مسلمانوں کو سورۂ یٰسین پڑھ کر سنائی جاتی ہے تاکہ مرنے والے کا دھیان خدا کی طرف رہے اس کی جاں کنی کی شکل آسان ہو جائے اور وہ با ایمان دنیا سے رخصت ہو۔ مگر اس زمانہ میں استادوں کی جاں کنی کے وقت اُن کے شاگرد بجائے یٰسین پڑھنے کے مرنے والوں کے فوٹو لیتے ہیں تاکہ اخباروں میں چھپوائیں یا اس لئے کہ ان کے مرتے وقت کی یادگار رہے۔ زندگی تو آج کل مصیبت اور تکلیفوں میں گزرتی ہی ہے مرنے کے وقت مسلمان کی جان کنی کی تکلیفوں میں جو کمی ہو جایا کرتی تھی وہ بھی اب نہیں ہوتی۔ سلہ اولڈ بوائے Old Boy یعنی سابق طالب علم۔ یہ ایک ماہوار اردو رسالہ کا نام تھا۔ جو علی گڑھ کالج کے سابق طالب علموں میں ارتباط پیدا کرنے کے لئے بنارس سے جاری کیا گیا تھا۔ حضرت اکبر رسالہ کے نام اولڈ بوائے اور اس کے نکلنے (یعنی جاری ہونے) پر تعریضاً لکھتے ہیں کہ جس طرح اولڈ بوائے نکلا ہے اسی طرح اب کہیں اولڈ گرل (یعنی سابق طالبہ یا بوڑھی لڑکی) کے نام کا رسالہ بھی نکلے گا۔ یا یہ کہ عمر لڑکیاں پردہ سے باہر آئیں گی۔ سلہ یعنی مسلمانوں میں فرقہ بندی کے تعصبات اس قدر بڑھ گئے ہیں کہ ہر مذہبی مجلس میں فتنہ و فساد کا اندیشہ رہتا ہے اور امن قائم رکھنے کے لئے پولیس کو بھی جلسوں میں موجود رہنا پڑتا ہے۔ گویا واعظوں کی جنت کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ پولیس بھی گشت کرتی ہے۔

چھوڑ[1] کر صحنِ حرم اکبر ہے محوِ طوفِ دیر
عزتیں گو اب بھی ہوتی ہیں مگر ذلت کے ساتھ

ابرو کی کجی اور ججی

ہم[2] کو ابرو کی کجی نے مارا
شیخ صاحب کو ججی نے مارا

خانۂ دیں ہوا القصہ تباہ
آئی آواز کہ اِنّا لِلّٰہ

ممبری، لیڈری اور مسٹری

نہ[3] ہر کہ ووٹ بیندوخت ممبری داند
نہ ہر کہ بحث بیاموخت لیڈری داند

نہ ہر کہ ہیٹ بپوشید و کوٹ در بر کرد
ادائے مغربی و آئینِ مسٹری داند

۱؎ یعنی عزت تو آج کل بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ مگر مذہب کو بالائے طاق رکھنے اور انگریزوں کی کوٹھیوں کا طواف کرنے کی ذلت برداشت کرنے سے

۲؎ مطلب یہ ہے کہ قومی رندوں کی زندگی تو عشق و عاشقی میں تباہ ہوئی اور مذہبی لوگوں کو انگریزوں نے جج اور بڑا عدالتی افسر بنا کر اپنے سانچے میں ڈھال لیا۔ غرض یہ کہ دین نہ دنیا داروں میں رہا نہ دین داروں میں اور دین کی بربادی و تباہی پر اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیْہِ رَاجِعُون پڑھا جانے لگا۔

۳؎ ترجمہ و تشریح۔ جو انتخابی مقابلہ میں زیادہ رائیں حاصل کر کے کسی مجلس کا ممبر بن جاتا ہے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ممبری جانتا ہو۔ یعنی ممبر بننے کی قابلیت بھی رکھتا ہو۔ یعنی آجکل کے انتخابات میں کثرتِ رائے سے نا قابل بھی ممبر بن جاتے ہیں۔ جو بحث مباحثہ کرنا سیکھ لیتا ہے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ لیڈری کی اہلیت بھی رکھتا ہو۔ یعنی آج کل جو لوگ محض اس وجہ سے لیڈر بن گئے ہیں کہ وہ بحث مباحثہ اور تقریریں اچھی کر سکتے ہیں وہ سب لیڈری کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ جو لوگ کوٹ پتلون پہنتے اور ہیٹ لگاتے ہیں وہ سب اہلِ مغرب کی خصوصیت کے حامل نہیں ہوتے اور نہ سب مسٹر

(انگریزی کلمۂ تعظیم) بننے کے آداب سے واقف ہوتے ہیں۔

ملک الموت کی زقند

تھی مرے پیشِ نظر وہ مس تہذیب پسند — کبھی وہسکی مجھے دیتی تھی کبھی شربت قند
ملک الموت نے ناگاہ بھری ایک زقند — پارک کو چھوڑ کے ہونا ہی پڑا قبر میں بند

حیف ؔ درچشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

اللہ کہیں تو واہ کہاں

بتؔ کی سی اگر کہیں تو اللہ کہاں — اللہ کا نام لیں تو یہ واہ کہاں
خاموش رہیں تو دل کو بے چینی ہو — بھاگیں تو سکت کسے ہے اور راہ کہاں

ؔ یہ کسی مشہور فارسی شاعر کا شعر ہے جس کا ترجمہ ہے:۔ افسوس کہ پلک جھپکنے میں یار کی صحبت ختم ہوگئی ۔ میں نے جی بھر کر ابھی پھول کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی کہ بہار کا موسم ختم ہو گیا ۔ اور پھول کمھلا گیا ۔ مطلب یہ ہے کہ ہم عیش و عشرت میں پڑ کر بالکل بھول جاتے ہیں کہ موت خلاف توقع یکایک کبھی آجایا کرتی ہے اور عیش و عشرت کو چھوڑ کر قبر کی اندھیری کوٹھری میں بند ہو جانا پڑتا ہے۔

ؔ مطلب یہ ہے کہ اگر ہم کسی غیر اللہ کو خوش کرنے کی باتیں کرتے ہیں تو اللہ کو بھول جاتے ہیں اور اللہ کا نام لیتے ہیں تو واہ واہ نہیں ہوتی اور کوئی قدر و عزت نہیں کرتا ۔ خاموش رہتے ہیں تو دل کو چین نہیں پڑتا اور زندگی کی اس شکل سے گھبرا کر بھاگنا چاہتے ہیں تو نہ تو اپنے اندر بھاگنے کی قوت پاتے ہیں اور نہ بھاگنے کا کوئی راستہ ملتا ہے ۔ اس لئے کہ جب اللہ اور غیر اللہ دونوں سے کنارہ کش ہو گئے تو پھر کدھر جا سکتے اور کہاں رہ سکتے ہیں۔

خدا رسیدہ اور گورنمنٹ رسیدہ

مرشد کی طلب میں جو میں اٹھا تو یہ بولے — اک پیر ڈنر[1] خوردۂ و ہر سمت دویدہ
مردہ سمجھ اُن کو جو پہنچے ہوں خدا تک — مرشد ہیں وہی جو ہیں گورنمنٹ رسیدہ

مسلم ختم یونیورسٹی موجود

نغمۂ قومی کا مطرب آج کل ہے ہر بستی — تال ہے ذکرِ ترقی سم[2] ہے یونیورسٹی
دین کی الفت دلوں سے اُن کے یونہیں گر مٹی — مسلم اُٹھ جائیں گے رہ جائے گی یونیورسٹی
ہے ضروری لیڈروں میں غیرتِ تقویٰ و دیں — خود جو اُن میں نقص ہو تو ہے یہ اکبر اک پٹی!

---

[1] ڈنر "DINNER" رات کی دعوت طعام۔ پیر ڈنر خوردۂ و ہر سمت دویدہ سے وہ لیڈران قوم مراد ہیں جو انگریزوں کے ساتھ دعوتیں اُڑاتے اور مرکز قومیت پر قائم رہنے کی بجائے حسب موقع و ضرورت ہر طرف دوڑتے یعنی پالیسیاں بدلتے رہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ انگریزرس اور زمانہ شناس لیڈروں کا یہ کہنا ہے کہ آج کل مرشد یعنی ہادی و رہنما وہی ہو سکتے ہیں جو حکومت میں رسوخ رکھتے ہیں اور جو لوگ خدا رسیدہ ہیں وہ تو زندہ نہیں مردہ ہیں کیونکہ مرنے کے بعد ہی آدمی خدا تک پہنچا کرتا ہے۔ ایسے مردہ مرشد، مرشد بنانے کے لایق نہیں ہیں۔

[2] تال اور سم موسیقی کی اصطلاحیں ہیں۔ سم پر تالوں کا ایک وزن ختم ہوتا ہے اور اس پر زور دیا جاتا ہے۔ یہ اشعار اس زمانہ کے ہیں جب مسلم یونیورسٹی قائم کرنے کی کوششیں ہو رہی تھیں۔ مطلب یہ ہے کہ آج کل ہر شہر میں ایک ہی قومی نغمہ گایا جا رہا ہے جس کی ابتدا ہوتی ہے ترقی قومی کی ضرورت سے اور تان ٹوٹتی ہے مسلم یونیورسٹی قائم کرنے کی ضرورت پر۔ حضرت اکبر کو اندیشہ ہے کہ اگر مسلمانوں کے دلوں سے دین کی محبت مٹتی رہی تو یونیورسٹی (دار العلوم) تو قائم ہو جائے گی۔ مگر وہ مسلم یونیورسٹی نہیں بلکہ صرف یونیورسٹی ہوگی کیونکہ مسلمان مسلمان نہیں رہیں گے، بقیہ

اور بڑے افسوس کی بات ہے کہ جو مسلمان لیڈر مسلم یونیورسٹی بنا رہے ہیں خود اُن میں نہ دینداری ہے نہ پرہیز گاری۔

گاندھی جی
اور
اُن کی تحریکیں

گاندھی اور انگریز کی لڑائی

مانا کہ رشی ہو تم، اور اچھا دل ہے — فطرت[1] کی طرف سے مغربی عاقل ہے
بھائی گاندھی سے کوئی کہہ دے کہ جناب — انگریز سے جیتنا بہت مشکل ہے

گاندھی جی سے شیخ جی کا میل

اس وقت شیخ جی کو گاندھی سے میل سوجھا — صاحب نے روگ چاہی ان کو بھی کھیل سوجھا
دونوں نے آخر اپنی اپنی نکاس[2] دیکھی — اسکیم[3] ان کو سوجھی اور اُن کو جیل سوجھا

گاندھی جی اور ہوم رول کی چاٹ

بجا ہے شہد کی مکھی کو ہے جو پھول کی چاٹ — عبث ہے ہم کو مگر شورشِ فضول کی چاٹ
خبر نہیں تھی کہ گاندھی کو لے اُڑیں گے شیخ — جناب خوش نہ ہوئے دے کے ہوم رول[4] کی چاٹ

---

[1] یعنی فطرتاً بڑا چالاک اور عقلمند ہے جسے فطرتی کہتے ہیں۔ [2] نکاس = راہ مفر۔ بچاؤ۔ چھٹکارا۔ [3] اسکیم لفظاً انگریزی Scheme بمعنی منصوبہ۔ تدبیر۔ حکمت عملی۔ یعنی انگریزوں نے حکمت عملی سے کام لینا شروع کیا اور پیروانِ گاندھی سول نافرمانی کی تحریک میں جیل جانے لگے۔
[4] چاٹ کے معنی ہیں چسکا۔ لپکا۔ لت۔ اور چاٹ کسی ایسی مزیدار اور چٹ پٹی چیز کو بھی کہتے ہیں جو محض مُنھ کا ذائقہ بدلنے اور زبان کی تواضع کے لئے کھائی جائے۔ ہوم رول = Home Rule کے لفظی معنی ہیں گھر کی حکومت یعنی حکومت خود اختیاری۔ انگریزوں نے ہندوستانیوں کو حکومتی اختیارات اسی امید پر دئے تھے کہ اگرچہ باگ ڈور حکومت کی انگریزوں ہی کے ہاتھ میں رہے گی مگر ہندوستانی ہوم رول کی اس چاٹ یعنی ایک ظاہری مزے دار چیز سے بالفعل مطمئن ہو جائیں گے اور کچھ روز کے بعد جب اختیارات کی تقسیم پر ہندو مسلمان آپس میں لڑنے لگیں گے تو انگریزوں کو حکومتی اختیارات کے ہندوستانیوں سے واپس لینے کا پھر ایک بہانہ مل جائے گا۔ مگر انگریزوں کی توقعات کے خلاف گاندھی جی مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو گئے اور مسلمان اُن کے کہنے میں آکر یہ نہ سمجھے کہ ہوم رول کے شہد سے فائدہ تو شہد کی مکھیوں یعنی ہندوؤں کو پہنچے گا۔ مسلمان تو صرف صدقہ کا بکرا بنیں گے اور اُن کی قربانیاں بے سود ثابت ہوں گی۔

تحریکِ سودیشی

داخل مری دانست میں یہ کام ہے پُن میں
پہنچائے گا قوّت شجرِ ملک کی بُن میں

تحریکِ سودیشی پہ مجھے وجد ہے اکبرؔ
کیا خوب یہ نغمہ ہے چھڑا دیس[۱] کی دُھن میں

صاحب حفاظت کریں اور ہم حکومت

کالج ہی نے بتائی نیٹوں کو یہ تعلّی
صاحب ہی نے سکھایا ہندوستاں[۲] ہمارا

صاحب[۳] کریں حفاظت اور ہم کریں حکومت
گاندھی سے کام نکلا یہ بے گماں ہمارا

صاحب سے لڑ بھی جانا اکثر پکڑ بھی جانا
ہے عمدہ اِک تماشا یہ امتحاں[۴] ہمارا

۱؎ دیس بمعنی وطن اور دیس ایک راگ کا نام بھی ہے جو آدھی رات کو گایا جاتا ہے یعنی دیسی چیزوں کے استعمال اور غیر ملکی چیزوں کے بائیکاٹ کی جو تحریک سودیشی کے نام سے شروع ہوئی ہے واقعی ایسی تحریک ہے جس سے دیس اور ملک کو نفع پہنچنے کی اُمید ہے۔

۲؎ یعنی ہندوستانیوں میں "ہندوستان ہمارا" ہونے کا جو احساس برتری و شیخت پیدا ہوا ہے وہ انگریزی تعلیم اور انگریزی تقلید ہی کا نتیجہ ہے۔

۳؎ یعنی گاندھی جی کی تحریکوں سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ ملک کی دشمنوں سے حفاظت کی ذمّہ داری تو انگریزوں ہی کی رہی اور اندرونی اور حکومتی اختیارات ہم کو مل گئے لیکن ایسے اختیارات کس کام کے جو دوسرے کے رحم و کرم پر ہوں اور جن کے برقرار رکھنے کی خود ہم میں طاقت و صلاحیت نہ ہو۔

۴؎ یعنی انگریزوں کی قانون شکنی کرنے اور پھر گرفتار ہو کر جیل جانے کا جو سیاسی امتحان ہمارا ہو رہا ہے وہ دوسری قوموں کی نظر میں ایک دلچسپ تماشا ہے۔

قید کی تکلیف سے بزرگی کا ثبوت

اُٹھائی قید کی تکلیف گو یوسفؑ[1] نے زنداں میں — زلیخا کو تو قائل کر دیا اپنی بزرگی کا

گورمنٹ انتظامِ غلّہ اب کر دے سپرد ان کے — کریں یہ شیر بن کر سامنا مہنگی کی گُرگی[2] کا

ترکِ تعاون کا تجربہ

تجربہ ترکِ تعاون[3] کا کریں یہ نونہال — گور میں جو پاؤں لٹکائے ہوئے ہیں اُن کو کیا

خاتمہ بالخیر ہے اُن کا پرانے سوگ پر — وہ کہاں پائیں نئے سُر اور کریں اس دُھن کو کیا

[1] ان اشعار میں تلمیح ہے حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کی طرف جس کا ذکر قرآن مجید کی سورۂ یوسف میں ہے۔ حضرت یوسفؑ حضرت یعقوبؑ کے صاحبزادے ایک مشہور اور نہایت حسین و جمیل پیغمبر تھے۔ یہ بارہ بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے چونکہ حضرت یعقوبؑ کو اُن سے سب سے زیادہ محبت تھی اس لئے دوسرے بھائی اُن سے حسد کرتے تھے۔ ایک دن حضرت یوسف کے بھائی اُن کو کسی بہانہ سے اپنے ساتھ لے گئے اور ایک کنوئیں میں ڈال دیا اور باپ سے آکر کہہ دیا کہ یوسفؑ کو بھیڑیے نے کھا لیا۔ حضرت یوسفؑ کے کنوئیں سے نکلنے پر مصر کے ایک سوداگر نے عزیزِ مصر یعنی بادشاہ مصر کے وزیر کے ہاتھ بطور غلام انھیں بیچ ڈالا وہاں عزیزِ مصر کی بیوی زلیخا حضرت یوسفؑ کے حُسن و جمال پر فریفتہ ہو گئی اور اُس نے اُن سے تعلق ناجائز پیدا کرنا چاہا۔ اِس خواہش میں ناکامیاب ہونے پر اُس نے عزیزِ مصر سے شکایت کر کے حضرت یوسفؑ کو قید کرا دیا۔ بادشاہِ مصر کے خواب کی صحیح تعبیر دینے پر حضرت یوسفؑ کو قید سے رہائی ملی۔ بالآخر وہ عزیزِ مصر مقرر کئے گئے۔ زلیخا سے اُن کی شادی ہو گئی۔۔ اور قحط کے زمانہ میں غلّہ کا انتظام اُنھوں نے نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دیا۔

[2] گرگی منسوب بہ گرگ یعنی بھیڑیا۔ یہاں یہ لفظ حضرت یوسفؑ کے قصّہ کی مناسبت سے لایا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے قحط اور مہنگائی اگرچہ بھیڑیے کی طرح ہندوستانیوں کی جان لینے کے درپے ہے لیکن اگر گاندھی جی کے ہاتھ میں قحط کا انتظام دے دیا گیا تو وہ شاید شیر کی طرح قحط کے بھیڑیئے کا مقابلہ کریں اور بھیڑیا شیر کے سامنے نہ ٹھہر سکے۔

[3] تحریک ترک تعاون جسے انگریزی میں نان کوآپریشن کہتے ہیں گاندھی جی کی وہ مشہور تحریک تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی سرکاری ملازمتیں اور انگریزی حکومت کی امداد و معاونت چھوڑ دیں۔

[4] مطلب یہ ہے کہ ترک تعاون کی تحریک کا تجربہ کرنا ہے تو نوجوانوں کو کرنا چاہیے جو لوگ عمر ختم کر چکے ہیں اُن کا خاتمہ بالخیر تو اس پرانے ماتم ہی پر ہونے دو کہ ہماری ساری قومی خصوصیات اور پرانی روایات فنا ہو گئیں۔ اُن کو ان نئی نئی سیاسی اور قومی تحریکوں کا سلیقہ کہاں سے آسکتا ہے اور وہ نئے لیڈروں کے ساتھ کیسے چل سکتے ہیں۔

گاندھی جی کا سوراج اور انگریز کا پیار

کیا طلب جو سوراج[1] بھائی گاندھی نے — مچی یہ دھوم کہ ایسے خیال کی کیا بات
کمال پیار سے انگریز نے کہا اُن سے — ہمیں[2] تمھارے ہیں پھر ملک و مال کی کیا بات

حکومت پرست اور پیروانِ گاندھی

گورمنٹیوں میں بڑی عقل ہے — مگر ان میں ایکا نہیں ہے نہ جوش
(گورمنٹیوں: کارپردازانِ حکومت — ایکا: اتحاد)
جو گاندھی کے پیرو وہ اکثر اُجڈ — مگر اک امنگ اُن میں ہے اور جوش
(اُجڈ: بے وقوف، اکھڑ — امنگ: ولولہ، شوق)

گاندھی کیپ اور ترکی ٹوپی

ہستیٔ حق[3] کا تصوّر ہے تو ہم تم اب کہاں — آفتاب آیا، نمودِ بزمِ انجم اب کہاں
شاخِ گاندھی کیپ سر پر دوستوں کے لگ گئی — وہ کُلاہِ ترک اور پھُندنے کی وہ دُم اب کہاں
(شاخ: سینگ — کیپ: ٹوپی — کُلاہِ ترک: ٹوپی ترکی)

۱؎ بمعنی حکومت خود اختیاری یا ہوم رول۔

۲؎ یعنی انگریزوں نے گاندھی جی کے ساتھ اپنائیت اور محبت و دوستی کا برتاؤ کرنا شروع کر دیا تاکہ وہ اس چال میں پھنس جائیں اور ملک و مال یعنی سوراج کا مطالبہ چھوڑ دیں۔

۳؎ ہستیٔ حق کے تصوّر سے مراد یہاں غالباً گاندھی جی کی وہ تحریکیں ہیں جو اُنھوں نے حق و صداقت کے نام سے جاری کی تھیں۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح سورج کے طلوع ہونے سے ستارے ماند پڑ جاتے ہیں اُسی طرح گاندھی جی کی تحریکات حمایتِ حق و صداقت کے آگے اور ساری تحریکیں ماند پڑ گئیں اور گاندھی ٹوپی کا سینگ لگ جانے سے ترکی ٹوپی کے پھُندنے کی دُم غائب ہو گئی یعنی گاندھی جی کی تحریک سوراج نے خلافتی تحریک کو بھی دبا لیا۔

گاندھی جی اور مالوی جی

بھائی گاندھی خودسری (ضد، سرکشی) کی آرزو کے ساتھ ہیں
اور صاحب لوگ غربی رنگ و بُو کے ساتھ ہیں

مالوی جی سب سے بہتر ہیں مری دانست میں
یعنی[1] مندر میں ہیں اور اپنی گئو (گائے) کے ساتھ ہیں

گاندھی سے لڑے کون

بُت بن گئے خود شیخ تو گاندھی سے لڑے کون
صاحب بھی ہیں خاموش تو آفت میں پڑے کون

ٹٹّو ہیں، ترقّی کے رسالے کے ہیں داغی[2]
اور ایڑ[3] بھی آنر کا ہے پھر کہئے اَڑے کون[4]

---

[1] مطلب یہ ہے کہ گاندھی جی تو انگریزوں کی مخالفت کی ضد پر اَڑے ہوئے ہیں اور انگریز اپنی مغربی ترکیبوں اور پالسیوں سے کام لے رہے ہیں۔ پُرانے خیال کے مشہور ہندو لیڈر پنڈت مدن موہن مالوی سب سے بہتر ہیں کہ وہ اپنے مندر اور گائے کی پُوجا یعنی پُرانے خیالات میں مگن ہیں۔

[2] داغی اُس جانور کو کہتے ہیں جس کے جسم پر جلتے ہوئے ٹھپّہ سے کوئی داغ یا نشان بنا دیا گیا ہو۔ فوجی رسالے میں جو گھوڑے بھرتی کئے جاتے تھے اُن کو پہچان کے لئے داغی کر دیا جاتا تھا۔ داغی کے معنی عیب دار کے بھی ہیں۔

[3] ایڑ بمعنی مہمیز یا ایڑی یا وہ کانٹا جو فوجی سواروں کے جوتوں کی ایڑی میں لگا ہوتا ہے اور جسے گھوڑے کے پیٹ پر پیر سے مار کر گھوڑے کو بڑھاتے اور تیز کرتے ہیں۔

[4] مطلب یہ ہے کہ جب مسلمان بھی گاندھی تحریکوں کے لیڈر ہو گئے اور انگریزوں نے بھی ان تحریکوں کی کامیابی کو دیکھ کر خاموشی اختیار کر لی تو پھر ان نوجوانوں سے جو ترقی کے رسالہ کے داغی ہیں یعنی جن کے داغوں میں ترقّی کا جوش بھرا ہوا ہے اور جن کے لئے ایڑ بھی آنر کا ہے یعنی جن کو ان تحریکوں میں حصّہ لینے سے اعزاز و افتخار بھی حاصل ہونے کی اُمید ہے اُن سے کون لڑ سکتا اور اُن کا مقابلہ کون کر سکتا ہے۔

ہماری حالتِ نزع اور ہوم رولیوں کی وِھسکی

ہم نزع (جاں کنی) میں رہیں گے مرنے کا ڈر نہیں ہے
بُت زہر دے رہے ہیں (یعنی ہندو) عیسٰی[1] جِلا رہے ہیں
اسلام و شرک کو وہ خود ہی پلا رہے ہیں
دونوں کو ہوم رولی (یعنی سوراج کی) وِھسکی[2] (شراب) پلا رہے ہیں

گاندھی جی کا وجد اور ہماری اُچھل کود

اس سوچ میں ہمارے ناصح ٹہل رہے ہیں
گاندھی تو وجد[3] میں ہیں یہ کیوں اُچھل رہے ہیں
نشو و نما[4] (عرق، بالیدگی) ئے کونسل جن کو نہیں میسّر
پبلک کی جے میں اُن کے مضمون پل رہے ہیں
ہیں وفد اور اپیلیں، فریاد اور دلیلیں
اور کبر[5] (بڑائی، بزرگی) مغربی کے ارماں نکل رہے ہیں
یہ سارے کارخانے اللہ کے ہیں اکبر
کیا جائے[6] دم زدن ہے یوں ہی یہ چل رہے ہیں

---

[1] عیسٰی علیہ السّلام مشہور پیغمبر جن کی اُمّت عیسائی کہلاتی ہے اور جو مُردوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے یہاں عیسٰی سے مراد انگریز ہیں۔

[2] مطلب یہ ہے کہ انگریز ہندو مسلمان دونوں کو ہوم رول کی شراب پلا کر مست و مدہوش رکھنا چاہتے ہیں۔ ہوم رول کے نشہ میں ہندو ایسے دیوانے ہوئے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو ختم کر دینا چاہتے ہیں مگر انگریزوں کی سیاسی مصلحتیں اِس کی مقتضی ہیں کہ مسلمان زندہ اور باقی رہیں تاکہ موقع دیکھ کر دونوں کو آپس میں لڑایا جا سکے۔

[3] وجد بمعنی سرمستی۔ بے خودی۔ حال۔ وہ کیفیتِ بے خودی جو اہلِ دل پر قوّالی وغیرہ سُن کر طاری ہوتی ہے۔ یعنی مسلمانوں کے خیر خواہ یہ سوچ رہے ہیں کہ گاندھی جی کا سیاسی جوش و خروش تو اُن کے جذبۂ حبِ وطن کا نتیجہ ہے جس نے اُن کو مست و بے خود کر رکھا ہے لیکن جو مسلمان اُن کے ساتھ ہیں وہ کیوں اِتنا اُچھل کود رہے ہیں حالانکہ اُن کے دِلوں میں نہ تو حبِّ وطن کا جذبہ ہے نہ حبِّ قومی کا۔ ایسی نمائشی اُچھل کود کا نتیجہ سوائے تباہی کے اور کیا ہو سکتا ہے۔

[4] یعنی جو کونسلوں کے ذریعہ سے ترقی نہیں کر سکتے وہ پبلک جلسوں اور جلوسوں میں جے کاروں کے نعرے لگا کر اپنی شخصیت کو نمایاں کر رہے ہیں اور لیڈر بننے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

[5] یعنی قومی جلسوں میں بھی انگریزوں کے پاس وفد لے جانے کی تجویزیں پاس کی جا رہی ہیں اور انگریزوں ہی سے اپیلیں اور فریادیں کی جا رہی ہیں جس سے انگریزوں کو اپنی طاقت کا اور زیادہ گھمنڈ ہوتا ہے۔ [6] یعنی اعتراض کون کر سکتا یا حرفِ شکایت کون زبان پر لا سکتا ہے۔

پٹیں خوب اور سر نہ اُٹھائیں

ہوں مبارک حضور کو گاندھی ایسے دشمن نصیب ہوں کس کو
کہ پٹیں[۱] خوب اور سر نہ اُٹھائیں اور کھسک[۲] جائیں، جب کہو کھسکو

چُپ چاپ گزی کے تھان بُنو

ہو تیزیٔ[۳] انوار؟ کی جو ہوس، ہنگامہ کرو، توپوں سے بُھنو
گاندھی کی جو حکمت (پالیسی) خوش آئے، چُپ چاپ گزی کے تھان بُنو
صاحب (انگریز) کی رفاقت ہو جو پسند، آسام[۴] میں جاکر چائے چُنو
اکبر کی جو مانو بیٹھ رہو، جو کچھ بھی ہو لیکن صبر کرو

---

[۱] گاندھی جی کی تحریک عدم تشدّد Passive Resistance کی بنیاد اسی پر تھی کہ راہِ حق میں ہر قسم کی تکلیفیں اور مصیبتیں خود برداشت کرلو مگر دوسروں پر تشدّد نہ کرو۔

[۲] کِھسک جانا = اپنی جگہ سے ہٹ جانا۔ یہاں ملازمت وغیرہ چھوڑنے سے مراد ہے۔ یعنی جب اُن سے یہ کہا جائے کہ سرکاری ملازمت سے مستعفی ہوجاؤ تو بے حیل و حجّت مستعفی ہوجائیں۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ سول نافرمانی کی تحریک کو دبانے کے سِلسلہ میں جو حکم حکومت کی طرف سے اُن کو دیا جائے اُس حکم کی تعمیل کریں۔ کیونکہ ایسے احکام پر عمل نہ کرنا تو تحریک سول نافرمانی کے اصول میں داخل ہے۔

[۳] یعنی اگر آزادی کی منزلِ مقصود پر جلد پہنچنے کی ہوس ہے تو خوں ریز فسادات کرو اور گولیاں کھاؤ اور اگر گاندھی جی کی آہستہ خرامی کی پالیسی پسند ہے تو کھدّر پہنو اور کھدّر بُنو۔

[۴] آسام ہند کے ایک صوبہ کا نام ہے جہاں انگریزوں کے چائے کے باغات بہ کثرت ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر انگریزوں ہی کی رفاقت پسند ہے تو اُن کی تجارتوں میں اُن کے ساتھ لگ جاؤ تاکہ انگریزی حکومت جانے کے بعد بھی تمھارا اُن کا ساتھ رہ سکے۔

صاحب کے بیرے کا ہوم رول

کہا اُن کے بیرے نے گو ہوں شریک | خیالات میں گاندھی بابا کے ساتھ
میں سمجھوں گا لیکن یہی ہوم رول | تعلق جو ہو جائے آیا[۱] کے ساتھ

مُلک سے رشتہ رکھنا ہے تو چرخہ بھی کاتو

پوچھتے کیا ہو ہم سے تم فتویٰ | نہ کرو ہم پہ بابِ آفت وا[۲]
اِتنا کہتے ہیں رشتہ ملک سے ہو | چرخ چرخہ بھی دے اگر کتوا

۱؎ آیا اُس عورت کو کہتے ہیں جو انگریزوں کے یہاں بچّوں کے کھلانے پر نوکر ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ گاندھی کی تحریکیں اگرچہ خواص ہی میں نہیں بلکہ عوام میں بھی مقبول ہو گئی ہیں لیکن بمصداق فکرِ ہر کس بقدرِ ہمّتِ اوست، ہر شخص ہوم رول (حکومت خود اختیاری) کو اپنی ذاتی مقصد برآری کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ چنانچہ کسی انگریز کے خانساماں کے نزدیک ہوم رول بس یہی ہے کہ اُس کی شادی اُس آیا کے ساتھ ہو جائے جو اُسی گھر میں نوکر ہے۔ یا مطلب یہ ہے کہ گاندھی جی کا مقصد ہوم رول سے خواہ کچھ ہی ہو لیکن ہم تو ہوم رول اُسے سمجھتے ہیں کہ ہم کو اپنے ذاتی معاملات میں پوری آزادی حاصل ہو جائے۔ جس کے ساتھ ہم شادی کرنا یا تعلق پیدا کرنا چاہیں بے روک ٹوک کر سکیں۔

۲؎ "بابِ آفت وا نہ کرو" کے معنی ہیں مصیبت کا دروازہ نہ کھولو۔ مطلب یہ ہے کہ گاندھی جی کی عدم تشدّد۔ سودیشی اور چرخہ کاتنے کی تحریکوں کے متعلق اسلامی اور شرعی احکام کو واضح کرنے سے حکومت بھی ناراض ہو گی اور ہندو بھی اور مسلمان مصیبت میں پڑ جائیں گے اس لئے بس یہ کہہ دینا کافی ہے کہ مُلک اور ابناءِ ملک کے ساتھ تعلّقات قائم رکھنے چاہئیں خواہ مردوں کو چرخہ کاتنے ہی پر کیوں نہ مجبور ہونا پڑے۔ رشتہ کے معنی تعلّق کے بھی ہیں اور تاگے کے بھی۔ چرخہ کے ساتھ رشتہ کی مناسبت ظاہر ہے۔

عزیمتِ گاندھی اور جلالتِ مغرب

ادھر عزیمتِ گاندھی کی مشرقی کو تلاش
اُدھر جلالتِ مغرب ہوا میں ہے بم[۱] پاش

کہیں یہ شکوہ[۲] کہ انعام میں نہاں ہے فریب
کہیں یہ غصّہ کہ شور و فغاں ہے سمع خراش

کہیں یہ طعن کہ یہ سامری[۳] ہے گاؤ پرست
کہیں یہ شبہ کہ خنزیر کی یہ کھائے گا قاش

کہیں یہ رجز[۴] کہ مشرک سے ارتباط عبث
کسی پہ قہر کہ غیرت ہے نذرِ فکرِ معاش

---

۱ بم مہند ہے لفظ انگریزی Bomb کا بمعنی بھک سے اُڑ جانے والا مادہ اور بم کا گولہ۔ یعنی ایک طرف تو ہندوستانی اِس کوشش میں ہیں کہ گاندھی جی کی رہنمائی میں اُن کو عزم و استقلال کے ساتھ مصائب کے برداشت کی عادت پڑے اور دوسری طرف انگریز اپنا رعب داب قائم رکھنے کے لئے اپنی ہلاکت خیز فوجی اور مادّی طاقتوں کی نمائش کر رہے ہیں۔

۲ یعنی ہندوستانی تو کہتے ہیں کہ انگریزوں کی طرف سے جو مراعات کی پیش کش کی جا رہی ہے اُس میں بھی انگریزوں کی کوئی چالبازی چھپی ہوئی ہے اور انگریزوں کو اس پر غصّہ آ رہا ہے کہ ہندوستانی اپنی احتجاجی چیخ پکار سے اُن کے کان کیوں کھائے جا رہے ہیں۔

۳ سامری موسیٰ علیہ السّلام کے زمانہ میں ایک جادوگر تھا جس نے چاندی سونے کا ایک بچھڑا بنا کر بنی اسرائیل سے اُس کی پرستش کرائی تھی۔ یعنی انگریز پرست مسلمان تو گاندھی جی کو اُن کی گاؤ پرستی کی وجہ سے سامری ہونے کا طعنہ دے رہے ہیں۔ اور قوم پرست انگریز پرستوں پر خنزیر خوری یعنی سؤر کھانے کا الزام لگا رہے ہیں۔

۴ رجز اُن اشعار کو کہتے ہیں جو لڑنے والوں میں جاں نثاری کا ولولہ اور لڑنے کا جوش پیدا کرنے کے لئے میدانِ جنگ میں پڑھے جاتے ہیں۔ یعنی کہیں تو گاندھی جی کی لیڈری کے خلاف مسلمانوں کو یہ کہہ کر بھڑکایا جا رہا ہے کہ مشرکوں سے دوستی نہیں کی جا سکتی اور کہیں انگریزوں کے ساتھ تعاون کا رشتہ منقطع نہ کرنے والوں کے خلاف اظہارِ غصّہ و ناراضگی کیا جا رہا ہے کہ فکرِ معاش کی وجہ سے اُنھوں نے اپنی قومی و ملّی غیرت کو بھی بالائے طاق رکھ دیا ہے۔

کہیں[1] یہ وسوسہ بُنیادِ تخت سُست نہ ہو — کہیں یہ خطرہ کہ گرنے لگے نہ لاش پہ لاش

کہیں[2] یہ فیصلہ یہ سب ہیں ملک و قوم فروش — کہیں یہ قول کہ یہ سب ہیں رند اور اوباش

جدھر[3] اُٹھائیں نظر اُن میں ہے عیاں باہم — عناد و غیبت و توہین و کینہ و پرخاش

تغیراتِ جہاں کون روک سکتا ہے — ہر ایک پائے گا اعمالِ زشت کی پاداش

فضول رائے کے اظہار میں جو ہیں سرگرم — یہ شعرِ صائب[4] اُنھیں خاموشی سکھائے کاش

تمیز[5] نیک و بد روزگار کار تو نیست
چو چشم آئینہ در خوب و زشت حیراں باش

۱؎ یعنی انگریزوں کو یہ اندیشہ ہے کہ کہیں ان کی حکومت کی بنیادیں کمزور نہ ہو جائیں اور ہندوستانیوں کو یہ خطرہ ہے کہ کہیں انگریز قتل عام نہ کرنے لگیں۔

۲؎ یعنی کوئی ایجی ٹیشن کی مخالفت کرنے والوں کو ملک و قوم فروش بتا رہا ہے اور کوئی ایجی ٹیشن کرنے والوں کو شُہدہ اور بدمعاش۔

۳؎ یعنی ملک کی موجودہ حالت ایسی ہے کہ کسی کو کسی پر اعتماد نہیں ہے۔ سب ایک دوسرے کی غیبت و توہین کر رہے ہیں اور آپس میں کینہ و پرخاش رکھتے ہیں۔

۴؎ صائب تخلص ہے مشہور ایرانی شاعر مرزا محمد علی اصفہانی کا۔

۵؎ صائب کے اس شعر کا ترجمہ یہ ہے۔ زمانہ کے نیک و بد میں فرق و امتیاز کرنا تیرا کام نہیں ہے۔ آئینہ کی آنکھ کی طرح اچھائی اور برائی کی دید میں حیران رہ۔ مطلب یہ ہے کہ جو ہونا ہے ہوگا۔ اچھوں کو اچھا اور بُروں کو بُرا بدلہ ملے گا۔ اِس لیے فضول اظہار رائے کرنے اور ایک دوسرے پر طعن و تشنیع کرنے سے یہ بہتر ہے کہ آدمی حیرت سے دنیا کے نیک و بد کو دیکھتا رہے اور خاموش رہے۔

تعلیمِ نسواں

و

پردۂ نسواں

مردوں کی عقل پر پردہ

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں[1] غیرتِ قومی سے گڑ گیا

پوچھا جو اُن سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل[2] پہ مردوں کی پڑ گیا

زنے از پردہ برُوں آید و کارے بکند

کس[3] نماند است کہ در بیشہ شکارے بکند
تیغ گیرد بکف و فتح دیارے بکند

ایں زماں ہمّت مرداں بہ ہمیں محدُود است
زنے از پردہ برُوں آید و کارے بکند

---

[1] زمین میں گڑ جانا، محاورہ ہے بمعنی بہات شرمندہ ہونا۔ شرم سے پانی پانی ہو جانا۔

[2] عقل پر پردہ پڑ جانا بھی محاورہ ہے بمعنی عقل کا جاتا رہنا۔ بے وقوف اور خبطی ہو جانا۔ مطلب یہ ہے کہ عورتوں کی بے پردگی نتیجہ ہے اُن مردوں کی حماقت کا جو اندھا دُھند نئی روشنی کی تقلید کر رہے ہیں اور جنھیں اپنا قومی انجام سوچنے کی عقل نہیں رہی۔

[3] ترجمہ اشعار:- کوئی نہیں رہا کہ جو جنگلوں میں جا کر شکار کھیلے۔ تلوار ہاتھ میں لے اور ملک فتح کرے۔ اس زمانہ میں مردوں کی ہمّت بس یہیں تک محدود ہے کہ عورت پردہ سے باہر نکلے اور کچھ کام کرے۔ چوتھا مصرع فارسی کے اُس مشہور مصرع میں طنزیہ تصرف کر کے لکھا گیا ہے۔ ع "مردے از غیب برُوں آید و کارے بکند"۔ طنز یہ ہے کہ پہلے تو مرد کسی اہم اور دشوار کام کی انجام دہی کے لئے یہ آرزو کیا کرتے تھے کہ تائید ایزدی سے کوئی ایسا عالی ہمّت مرد پیدا ہو جائے جو اس کام کو انجام دیدے اور آج کل بجائے کسی مرد غیب کے ظہور کے کاموں کی انجام دہی کے لئے عورتوں کے گھروں میں سے بے پردہ باہر آنے کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔

شوکت وغیرت اور لن ترانی ختم

وہ شوکت و شانِ زندگانی نہ رہی
غیرت[1] کی حرم میں پاسبانی [پاسبانی - رکھوالی] نہ رہی
پردہ اُٹھا تو کُھل گیا اے اکبر
اسلام میں [ننگ و ناموس کی شرم سپاس] [شریفوں کا زنانخانہ] اب وہ لن ترانی[2] نہ رہی

چالیس برس بعد

جب تک ہم میں ہے قومی خصلت باقی
بے شک پردے کی ہے ضرورت باقی
چالیس[3] برس کی بات ہے یہ شاید
بعد اُس کے رہے گی پھر نہ حُجّت [تکرار بحث] باقی

---

۱ یعنی شریفوں کے زنانخانوں کی سب سے بڑی محافظ ہماری غیرت وحمیت ہوا کرتی تھی جو عورتوں کے بے پردہ ہو جانے سے ختم ہو گئی۔

۲ لَنْ تَرَانِیْ (تو مجھ کو نہیں دیکھ سکے گا) ٹکڑا ہے آیۂ کریمہ رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْکَ۔ قَالَ لَنْ تَرَانِیْ یعنی جب موسی علیہ السّلام نے خدا تعالیٰ سے درخواست کی کہ اے میرے پروردگار (اپنے تئیں) مجھ کو دکھا، تاکہ میں تیرا دیدار کرسکوں تو جواب میں اللہ تعالےٰ نے فرمایا تو مجھ کو نہیں دیکھ سکے گا، یعنی میرے دیدار کی تاب نہیں لائے گا۔ چونکہ لَنْ تَرَانِیْ کے مفہوم سے ایک ایسی انانیت اور تعلّی نکلتی ہے جو خدا ہی کے شایانِ شان ہے اس لئے لَنْ تَرَانِیْ کا کلمہ جب انسانوں کے متعلق بولا جاتا ہے تو مجازاً اُس سے شیخت و تعلّی اور انانیت مراد لی جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عورتوں کا پردہ اُٹھنے سے مسلمانوں کی یہ تمکنت اور شیخی ختم ہو گئی کہ اُن کی عورتوں کو کوئی غیر مرد نہیں دیکھ سکتا۔

۳ مطلب یہ ہے کہ تیس چالیس برس کے بعد ہماری وہ تمام قومی خصوصیات اور خصلتیں بدل جائیں گی جن کی وجہ سے ہم میں اسلامی غیرت و حمیت موجود ہے اور جو اس کی متقاضی ہیں کہ عورتوں کا پردہ قائم رکھا جائے۔ غیرت و حمیت کے ختم ہو جانے پر پھر کوئی عورتوں کی بے پردگی پر معترض نہیں ہوگا۔

اُدھر حکومت کا سایہ اِدھر عزّت کا پردہ

نہ یہ قیدِ شریعت ہے نہ یہ غفلت کا پردہ ہے[1]
رواج و مصلحت کی بات ہے حکمت کا پردہ ہے
تمھیں دھوکے میں ڈالا ہے مثالِ اہلِ یورپ نے
اُدھر سایہ حکومت کا ہے یاں عزّت کا پردہ ہے

حرم سرا کا مطلب حدِّ ادب

ہے صاف عیاں حرم سرا کا مطلب[2] (شریفوں کا زنانخانہ)
بیگانوں کے واسطے ہے اک حدِّ ادب (غیر محرم)
ممکن ہو اگر تو اِس کو قائم رکھو
عزّت کے نشان اور مِٹ گئے سب

---

[1] مطلب یہ ہے کہ نئی روشنی والے جو پُرانے خیال کے مسلمانوں پر طعن کرتے ہیں کہ وہ رفتارِ زمانہ سے بے خبر ہیں اور اُن کی آنکھوں پر غفلت کا پردہ پڑا ہے کہ اُنھوں نے عورتوں کو حکم شریعت کے مطابق پردہ میں مقیّد کر رکھا ہے اُن کو معلوم ہونا چاہیئے کہ جو مسلمان پردہ کے حامی ہیں وہ نہ تو عورتوں کو قید میں رکھنا چاہتے ہیں اور نہ وہ زمانہ کے حالات سے بے خبر ہیں بلکہ آج کل تو عورتوں کا پردہ زیادہ تر رواج اور عزّت کی وجہ سے ہے اور پردہ کے قائم رکھنے میں یہ مصلحت و حکمت بھی ہے کہ انگریز عورتوں کی عزّت تو اُن کی حکومت کی وجہ سے محفوظ ہے۔ ہماری عورتیں بھی اگر پردہ سے باہر نکل آئیں تو اُن کی عزّت و حُرمت کی حفاظت کا ہمارے پاس کیا ذریعہ ہے اِس لئے مغربی عورتوں کی تقلید ہمارے لئے مُناسب نہیں ہے۔

[2] مطلب یہ ہے کہ شریف مسلمانوں کے ہاں زنانخانوں یعنی پردہ دار گھروں کا ہونا اور اُن میں نامحرم مردوں کا بے روک ٹوک داخل نہ ہوسکنا بھی ہماری بچی کُھچی قومی عزّت کی نشانیوں میں سے ہے۔ جب تک بھی ممکن ہو اِس نشانی کو باقی رکھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

پردہ کے مخالف پیرانِ نابالغ

پردہ اُٹھ جانے سے اخلاقی ترقّی قوم کی — جو سمجھتے ہیں یقیناً عقل سے فارغ ہیں وہ
سُن چکا ہوں میں کہ کچھ بوڑھے بھی ہیں اس میں شریک — یہ اگر سچ ہے تو بے شک پیرِ نابالغ[1] ہیں وہ

نئی تعلیم یافتہ بے پردہ لڑکیاں

گھر سے جب پڑھ لکھ کے نکلیں گی کنواری لڑکیاں — دِلکش و آزاد و خوش رُو ساختہ پرداختہ (بنی ٹھنی - آراستہ پیراستہ)
یہ تو کیا معلوم کیا موقعے عمل کے ہوں گے پیش — ہاں نگاہیں ہوں گی مائل اُس طرف بے ساختہ (بے ارادہ - خود بخود)
مغربی تہذیب آگے چل کے جو حالت دکھائے — ایک مُدّت تک رہیں گے نوجواں دل باختہ (دل کھو بیٹھنے - فریفتہ)
اوجِ (بلندی) قومی سے شرافت کا ہما[2] گر جائے گا — ماکیاں (مرغیوں) سے پست تر دکھلائی دے گی فاختہ

ڈال دے گا[3] سینۂ غیرت سپر (ڈھال) میدان میں
تیغِ ابرو ہی نظر آئے گی ہر سُو آختہ (کھنچی ہوئی)

---

[1] پیرِ نابالغ ایسے بڈھوں کو کہتے ہیں جو بوڑھے ہونے کے باوجود بچّوں کی سی حرکتیں اور باتیں کریں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کچھ بوڑھے لوگ بھی اس زمانہ میں پردہ کے مخالف ہو گئے ہیں تو اُن کی عقل سٹھیا گئی ہے اور وہ بچّوں کی طرح ناسمجھی کی باتیں کرتے ہیں۔

[2] عجمی شاعرانہ تخیل کا ایک پرند جس کا سر پر سے گزرنا بڑی اقبال مندی کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ عورتوں کا پردہ اُٹھنے سے ہماری وہ قومی عظمت و شرافت ختم ہو جائے گی جو ہماری اقبال مندی کی نشانی سمجھی جاتی تھی اور ہماری عورتوں میں فاختہ کی سی معصومانہ دِل کشی باقی نہیں رہے گی اور وہ گھریلو مُرغیوں سے بھی زیادہ کم حیثیت ہو جائیں گی۔

[3] یعنی عورتوں کی شرم و غیرت ختم ہو جائے گی اور وہ آزادی کے ساتھ اپنے حُسن کی نمائش کرتی اور اپنی تیغِ ابرو سے دلوں کا شکار کرتی پھریں گی۔

قومی چادر کی تہیں کھلتی جاتی ہیں

مرد[1] جنٹلمین ہو کر پا رہے ہیں جب عروج
بی بیاں پھر گھر میں رنج بے کسی (بیچارگی) کیوں سہیں

مطمئن رہیئے نہ رہ جائے گا عورت کا حجاب
چادر[2] قومی کی آخر کھلتی جاتی ہیں تہیں

اِک[3] طرف دامِ ترقی اک طرف موجِ شراب
ہر طرح حاضر ہیں ہم کہیئے پھنسیں کہیئے بہیں

اُستاد ہونے چاہیئں، استاد جی نہیں

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر
خاتونِ[4] خانہ ہوں وہ سبھا (مجلس) کی پری نہ ہوں

ذی علم و متقی (پرہیزگار) ہوں جو ہوں اُن کے منتظم (نگراں)
استاد اچھے ہوں مگر (لیکن) استاد جی[5] نہ ہوں

---

۱ جنٹل مین (Gentle man) بمعنی نقلی شریف آدمی۔ طنزاً مغربی وضع قطع اختیار کرنے والے مشرقی۔ مطلب یہ ہے کہ جب مرد انگریزی وضع قطع اختیار کر کے اونچی سوسائیٹوں میں پہنچنے لگے ہیں تو انھیں دیکھ کر عورتوں میں کیوں نہ مغربی تقلید اور اور آزادی کا جذبہ پیدا ہو اور وہ کیوں گھروں میں اس طرح بندھی بیٹھی رہیں کہ اونچی سوسائیٹوں میں اُن کی پرسش نہ ہو۔

۲ چادر قومی کی تہیں کھلتی جانے سے مراد یہ ہے کہ قوم کی جتنی کمزوریاں اور برائیاں قومی حکومت کی چادر نے چھپا رکھی تھیں وہ رفتہ رفتہ سب آشکار و نمایاں ہوتی جا رہی ہیں۔ اِس لئے کوئی وجہ نہیں کہ ہماری عورتوں کی بھی جو کمزوریاں اور خامیاں پابندی پردہ کی وجہ سے ڈھکی چھپی ہوئی ہیں وہ ظاہر نہ ہوں اور پردہ نہ اُٹھایا جائے۔

۳ مطلب یہ ہے کہ تقلید مغربی کی ترغیبات میں ایک طرف تو ترقی کے وہ سبز باغ ہیں جو ہمارے نئے لیڈر ہم کو دکھا رہے ہیں اور دوسری طرف آزاد منشی کے مزے اور عیش و عشرت کے مناظر ہیں اور یہ دونوں ہی ہمارے لئے تباہ کن اور مہلک ہیں۔ یعنی ترقی کی اُمیدوں کے جال میں پھنسنا بھی اور شرابِ عیش و عشرت کی موجوں میں بہنا بھی۔

۴ یعنی عورتوں کو تعلیم تو ضرور دینی چاہئے مگر یہ تعلیم ایسی ہونی چاہئے کہ وہ اصولِ خانہ داری سے پورے طور پر واقف اور اچھی سلیقہ مند بیبیاں ہو جائیں نہ کہ ایسی تعلیم جس کو حاصل کر کے وہ مردوں کی مجلسوں کی زینت بنیں اور ناچیں گائیں۔

۵ اُستاد جی گانے بجانے والی عورتوں کے اُستاد کو کہتے ہیں جو عورتوں کو سبھا کی پری بناتے ہیں نہ کہ خاتونِ خانہ۔

حجاب کے دن۔ نقاب کب تک

اِدھر جوانوں کو ہے یہ سَودا (جنون) کہ سیرِ باغ اُنھیں کرائیں
اُدھر خواتینِ خلوت آرا (پردہ نشین) ہنوز مست اپنی نوج[1] میں ہیں
مگر یہ قیدِ حرم (زنانخانہ) کہاں تک حجاب کے دن نقاب کبتک
کہ گبرو ترسا[2] کی لیڈیاں سبھی شریک واعظ کی فوج میں ہیں

(منہ پر ڈالنے کا کپڑا، گھونگھٹ)

میاں بدلے تو بیوی کیوں نہ بدلے

مناسب ہے نئی تعلیم نسواں
یہی راہ آپ اب بے رد و کد (بے عذر، بلا حجت) لیں
سمجھ لیں لاکھ باتوں کی یہ اِک بات[3]
میاں (شوہر) بدلے تو بی۔بی کیوں نہ بدلیں

---

[1] نوج کا لفظ اظہارِ بیزاری کے لئے پُرانی عورتیں بولا کرتی ہیں بمعنی خدا نہ کرے۔ مطلب یہ ہے کہ آج کل کے نوجوانوں کو تو یہ خبط ہے کہ اُن کی بیبیاں باغوں میں سیر و تفریح کرنے جایا کریں اور پُرانے خیال کی پردہ نشین عورتیں اپنی پُرانی روشوں میں مست ہیں اور نئی آزادیوں سے بیزار۔

[2] گبرو ترسا بمعنی آتش پرست و نصرانی۔ لیڈیاں مہنّد جمع ہے لیڈی Lady کی جو بڑی حیثیت کی مغربی عورت کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آج کل کے جو لیڈران قومی ترقی کا وعظ کہہ رہے ہیں اُن کے ساتھ غیر مسلم عورتیں بھی شریک ہیں۔ اِس لئے اب پردہ اور نقاب چند ہی روز کا ہے۔

[3] 'لاکھ باتوں کی ایک بات' محاورہ ہے بمعنی بڑی وزنی اور مختصر بات۔ بادلیل۔ مطلب یہ ہے کہ عورتوں کو نئی تعلیم دلوانے کے حق میں سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ جب شوہروں نے نئی روشنی اختیار کر لی اور وہ پہلے سے شوہر نہیں رہے تو اُن کی بیبیاں کیوں نہ اپنی رِوِش بدلیں۔

عورتوں کو گھر کے لئے پڑھاؤ قوم کے لئے نہیں

کون کہتا ہے کہ تعلیم[1] زناں خوب نہیں   ایک ہی بات فقط کہنا ہے یاں حکمت کو
دو اُسے شوہر و اطفال کی خاطر تعلیم   قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو

مردی کی شرم کا پردہ اُٹھ گیا

تمھیں سے اُٹھ گیا مردی[2] کی شرم کا پردہ   تو پھر بقائے (قائم رکھنا) حجاب رُخِ زناں کب تک
اِس انقلاب (تبدیلی) کا اب انقلاب (بدلنا) ہے دشوار   رہو گے منتظرِ مہرِ (مہربانی) آسماں کب تک

نئے سانچے میں ڈھلی ہوئی بیبیاں

فرض عورت پر نہیں ہے چار دیواری کی قید   ہو اگر ضبطِ نظر (نظر کا روکنا) کی اور خودداری (اپنی عزت کا پاس) کی قید
ہاں مگر خودداری و ضبطِ نظر آساں نہیں   مُنھ سے کہنا سہل ہے کرنا مگر آساں نہیں

---

[1] یعنی اقتضاءِ عقل و حکمت یہ ہے کہ عورتوں کو قوم کا لیڈر بننے کی نہیں بلکہ اپنے گھر کا لیڈر بننے کی تعلیم دینی چاہئے۔

یعنی ایسی تعلیم جس سے وہ فرائضِ زوجیت کو شوہر کی مرضی کے مطابق انجام دے کر گھر کی ملکہ بنی رہیں اور اپنے بچوں کی ایسی نگہداشت و تربیت کرسکیں کہ اُن کا گھر نمونۂ جنت ہو۔ نمونۂ دوزخ نہ ہو۔

[2] یعنی جب تمھیں اپنے مرد ہونے کی شرم و غیرت کا احساس نہیں رہا اور تم اسے گوارا کرنے لگے کہ تمھاری عورتوں پر دوسرے مردوں کی للچائی ہوئی نظریں پڑیں تو پھر عورتیں بھی اپنا مُنھ کیوں چھپائیں اور نامحرموں سے پردہ کیوں کریں۔ تمھارے احساسات وجذبات میں نئی روشنی کے اثر سے جو انقلاب ہوا ہے۔ اُس کا اثر عورتوں پر پڑنا لازمی ہے اور اب یہ تمھاری امید بالکل فضول ہے کہ زمانہ تم پر مہربان ہوگا اور تمھاری عورتیں تمھارے اثر میں رہیں گی۔

تم میں[1] وہ ضبطِ نظر اُن میں وہ خودداری کہاں — رعبِ قومی (ڈر، خوف) مثلِ فاتح ملک پر طاری کہاں

اب رہی[2] تعلیم کون اس امر کا مفتوں (شائق) نہیں — بیبیوں پر مغربی سانچہ مگر موزوں نہیں

یہ[3] تو ظاہر ہے حریفِ شوخ (یعنی عاشقِ تقلیدِ مغرب) کیوں رُکنے لگا

شوق سے لیکن خرابی پر میں کیوں جھکنے لگا

شوہر پرستی کی بجائے پبلک پسندی

اعزاز[4] بڑھ گیا ہے آرام گھٹ گیا ہے — خدمت میں ہے وہ لیزی (سُست) اور ناچنے کو ریڈی (تیار)

تعلیم کی خرابی سے ہو گئی بالآخر — شوہر پرست بی بی۔ پبلک (عامۃ الناس) پسند لیڈی

۱ے مطلب یہ ہے کہ نہ تو آج کل کے مرد ایسے پرہیزگار اور نیک ہیں کہ وہ نامحرم عورتوں کو بُری نظر سے نہ دیکھیں اور نہ آج کل کی عورتوں میں اپنی عزّت و ناموس کا پاس ہے۔ اگر ہماری قومی حکومت ہوتی تو مردوں کو بھی اُس کا ڈر رہتا اور عورتوں کو بھی اور اس کی ضرورت نہ ہوتی کہ عورتوں کو زنانخانہ کی چار دیواری میں مقیّد رکھا جائے۔ وہ گھر سے باہر نکل کر بھی ضروری کام کاج کر سکتی تھیں۔

۲ے یعنی عورتوں کو تعلیم دلانے کا شوق سب ہی مردوں کو ہے۔ لیکن اُن کو ایسی تعلیم دلوانا کسی طرح مناسب نہیں ہے جو اُن کو مغربی سانچہ میں ڈھالے یعنی مغربی روش پر چلائے۔

۳ے مطلب یہ ہے کہ ہماری عورتیں بھی چلیں گی تو اُسی طرف جس طرف زمانہ اُن کو چلا رہا ہے مگر میں خوشی سے اُن کی بے پردگی اور آزاد منشی کی حمایت کیسے کر سکتا ہوں۔

۴ے یعنی جتنی عورتوں کی عزّت سوسائٹی میں بڑھتی جا رہی ہے اُتنا ہی اُن کا سکون و آرام کم ہوتا جا رہا ہے۔ نئی تعلیم کی خرابی کا اثر یہ ہوا ہے کہ عورتیں جلسوں میں ناچنے کے لئے تو ہر وقت تیار رہتی ہیں لیکن گھر کا کام کاج اُن سے نہیں ہو سکتا۔ پہلے وہ شوہر پرست یعنی شوہروں سے محبت کرنے والی بیبیاں تھیں اور اب پبلک پسند لیڈیاں ہو گئی ہیں۔ یعنی جن کو شوہروں کی پسندیدگی کے مقابلہ میں پبلک کی پسندیدگی کا زیادہ خیال رہتا ہے۔

بیگم پیچوان، لیڈی سگرٹ

پردہ میں غرور ہے طوالت بے حد — انصاف پسند کو نہیں چاہئے ہٹ
تشبیہ بُری نہیں اگر میں یہ کہوں — بیگم ہے پیچوان[1] لیڈی سگرٹ

یہ قوم کی عقدہ کشائی ہے یا پردہ دری

یہ پردہ در کو سوئے قوم کس نے بھیجا ہے — کہ جس کی بحث سے مجروح ہر کلیجا ہے
یہی ہے[2] عقدہ کشائیِ قوم تو اک دن — ازاربند کو کہہ دیں گے حبسِ بیجا ہے

[1] پیچوان۔ ایک قسم کا شاندار حقّہ جس کا نیچا کافی لمبا اور لچکدار رہتا ہے تاکہ دُور و نزدیک اور لیٹے لیٹے اُسے آسانی سے پی سکیں۔ سگرٹ کے مقابلہ میں پیچوان سے تمباکو کشی کی خواہش کا پورا کرنا اگرچہ زیادہ بکھیڑے کا کام ہے لیکن جو فرحت و سُرور پیچوان سے حاصل ہوتا ہے وہ سگرٹ سے حاصل نہیں ہوتا اور سگرٹ حقّہ اور پیچوان کے مقابلہ میں زیادہ مضر بھی ہوتی ہے۔ کیونکہ سگرٹ سے تمباکو کا دھواں پانی کی منازل طے کر کے نہیں بلکہ براہِ راست حلق سے نیچے جاتا ہے۔ شریف مشرقی عورتوں کی حیا اور غیرت کی وجہ سے اُن کے ساتھ ایسی بے تکلفی اور بے حجابی سے اختلاط نہیں ہو سکتا جیسا کہ یورپین لیڈیوں کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ اِس لئے بیگم کی پیچوان سے اور لیڈی کی سگریٹ سے تشبیہ نہایت ہی موزوں اور پُر لُطف ہے۔

[2] یعنی قوم کی مشکلات کا حل اگر نئی روشنی کے مخالفینِ پردہ کے نزدیک اسی میں ہے کہ عورتوں کا پردہ اُٹھا دیا جائے اور عورتوں کے پردہ کو وہ حبسِ بیجا سے تعبیر کرتے ہیں تو عجب نہیں کہ کچھ عرصہ کے بعد ستر پوشی کو بھی وہ حبسِ بیجا تصور کرنے لگیں اور پیجامہ پہننے کے بھی خلاف ہوں۔ پردہ در۔ عقدہ کشائی۔ ازاربند اور حبسِ بیجا کی تجنیسات معنوی قابلِ غور ہیں۔

بنائے عمارت فخر النساء کہیں در پردہ بے پردگی کی بنا نہ ہو

کالج بنا عمارتِ فخر النساء[1] بنی — شکرِ خدا کہ مل گئے آخر بنا بنی[2]

بے پردگی کی ہو نہ یہ در پردہ اک بنا — جن کو یہ ڈر ہے اُن کی تو جانوں[3] پہ آ بنی

لیکن نگاہِ نبضِ[4] شناسانِ وقت میں — امراضِ قوم کے لئے عمدہ دوا بنی

اَچھّے تخم کے لئے اَچھّے درختوں کی ضرورت

تعلیم یافتہ ہوں اور نیک بخت بھی ہوں — تم سے رہیں ملائم اور شیطاں[5] پہ سخت بھی ہوں

قرآن ہی کرے گا ان بی بیوں کو پیدا — پاکیزہ[6] تخم جب ہوں عمدہ درخت بھی ہوں

---

۱ عمارت فخر النساء:- غالباً زنانہ کالج علی گڑھ کی کسی عمارت کا نام ہے۔

۲ بنا بمعنی دولھا۔ مجازاً لڑکا۔ بنی بمعنی دلہن۔ مجازاً لڑکی۔ یعنی علی گڑھ کالج میں لڑکوں کی تعلیم تو ہوتی تھی۔ اب لڑکیوں کی تعلیم کا بھی انتظام ہوگیا۔ یعنی لڑکے لڑکیاں سب کالج میں پڑھنے لگے۔

۳ جان پر بن جانا یا جان پر آ بننا محاورہ ہے بمعنی سخت تکلیف پہنچنا۔ جان کا خطرہ میں ہونا۔ یعنی عمارت فخر النساء جو بظاہر لڑکیوں کی تعلیم کے لئے بنائی گئی ہے کہیں اس کی تعمیر میں عورتوں کی بے پردگی مضمر نہ ہو۔ یعنی اُس کے بننے سے کہیں عورتیں بے پردہ نہ ہونے لگیں۔ جن دُور اندیشوں کو اس عمارت کے بننے سے یہ اندیشہ ہے اُن کے دل کو بہت تکلیف پہنچ رہی ہے۔

۴ نبض شناسانِ وقت۔ زمانہ کی نبض پہچاننے والے۔ یعنی وہ لوگ جو یہ جانتے ہیں کہ زمانہ کس طرف جا رہا ہے اور اُس کا اقتضاء کیا ہے۔

۵ یعنی بُرے کاموں سے نفرت کرنے اور اُن کو سختی سے روکنے والی۔

۶ یعنی ایسی بیبیاں جو تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ اسلامی خصائل بھی رکھتی ہوں جب ہی پیدا ہو سکتی ہیں کہ اُن کے والدین احکامِ قرآنی کے پابند ہوں۔ کیونکہ عمدہ درخت تو اچھے بیجوں ہی سے پیدا ہو سکتے ہیں۔

پردہ دروں کا راز آشکار

پردے کے واسطے تو عبث بے قرار ہے — پردہ دروں کا راز تو خود آشکار ہے
آغا تقی[1] میں حسن نہ اب وہ سنگار ہے — پردہ اٹھا کے دیکھو تو کوّا گہار ہے

پردہ ذریعۂ عزّت و تمکنت

حفظِ عصمت بھی سہی لیکن یہ پردہ ہند میں — مسلموں کی جاہ و شان و تمکنت کی بات تھی
پردہ در کہتا ہے اب اس کی ضرورت ہی نہیں — میرزایانہ ادا تھی سلطنت کی بات تھی
خون[2] میں غیرت رہی باقی تو سمجھے گا کبھی — خوب تھا پردہ نہایت مصلحت کی بات تھی

عورت کی شان کا ظہور

تمکین اک نشاں ہے عصمت کی آن کا — پردا[3] بس اک ظہور ہے عورت کی شان کا

۱؎ ایک مشہور پرانا مصرع ہے "آغا تقی کے باغ میں کوّا حلال ہے"

۲؎ مطلب یہ ہے کہ ہندوستان میں عورتوں کی پردہ نشینی سے اگرچہ اُن کی عصمت و پاک دامنی کی حفاظت بھی ہوتی تھی لیکن پردہ کا مقصد زیادہ تر یہ تھا کہ مسلمانوں کا قومی وقار اور عزّت و شان برقرار رہے۔ پردہ کے مخالف کہتے ہیں کہ یہ مغلوں کے چوچلے تھے اور قومی وقار کا یہ احساس اُسی وقت تک کے لئے تھا جب تک کہ ہماری اپنی حکومت تھی۔ لیکن اگر ان مخالفین پردہ میں غیرت کا کچھ احساس باقی رہا تو کبھی نہ کبھی اُن کو بھی پردہ کے فوائد اور مصلحتوں کا معترف ہونا پڑے گا۔ کیونکہ بے پردگی سے یقیناً عورتوں میں ایسی بے غیرتیاں پیدا ہو جائیں گی جسے ہماری حمیّت قومی برداشت نہیں کر سکے گی۔

۳؎ یعنی پردہ ایک ایسا نشان ہے جس سے عورت کے احساسِ پاکدامنی کی تمکنت و شان ظاہر ہوتی ہے۔

پردہ[1] تو اُن کا حق ہے نہیں اُن پہ جبر (زبردستی) کچھ — آیا ہے اُن پہ وقت یہ سخت امتحان کا
شوخیٔ (بے پردگی) مغربی کے خریدار ہیں بہت — گاہک مگر خدا ہے حیا کی دُکان کا

نورِ اسلام کی حفاظت کے لئے فانوسِ پردہ کی ضرورت

نئی تہذیب کی عورت میں کہاں دین کی قید — بے حجابی جو ہو اُس میں تو قباحت (برائی) کیا ہے
نورِ[2] اسلام نے سمجھا تھا مناسب پردہ — شمعِ خاموش (بجھی ہوئی شمع) کو فانوس (قندیل) کی حاجت کیا ہے

آج اُس کا خوشنما ہے مگر ہوگی کل خراب

تعلیم عورتوں کو بھی دینی ضرور ہے — لڑکی جو بے پڑھی ہو تو وہ بے شعور (بے تمیز - بدسلیقہ) ہے
حسنِ معاشرت (خانہ داری) میں سراسر فتور (نقص - خرابی) ہے — اور اس میں والدین کا بے شک قصور ہے

---

[1] یعنی یہ کہنا کہ پردہ عورتوں سے زبردستی کرایا جاتا ہے۔ غلط ہے۔ بلکہ پردہ بھی عورتوں کے لئے ایک ذریعۂ عزت اور اُن کا ایک نسوانی حق ہے جس کی وہ خود مردوں سے خواستگار ہوتی ہیں۔ کیونکہ پردہ سے خود اُنہی کی قدر و عزت بڑھتی ہے۔ لیکن اس زمانہ میں چونکہ مغربی بے حیائی و بے پردگی کی قدر زیادہ کی جا رہی ہے اور حیا کی قدر کرنے والے صرف معدودے چند خدا پرست رہ گئے ہیں یا خود خدا جس کی قدر کا نتیجہ فوراً نہیں معلوم ہوا کرتا اس لئے مسلمان عورتوں کے لئے یہ وقت بڑے سخت امتحان کا وقت ہے اور جو عورتیں اس امتحان میں پوری نہیں اُترتیں وہی پردہ کو اپنے حق کی بجائے مردوں کے جبر سے تعبیر کر سکتی ہیں۔

[2] مطلب یہ ہے کہ نئی تہذیب کی عورتیں اگر دین و مذہب کی پابند ہوتیں اور اُن کے دلوں میں نورِ اسلام کی شمع جل رہی ہوتی تو وہ اُس کی حفاظت کے لئے پردہ کے فانوس سے کام لیتیں۔ اب تو وہ بجھی ہوئی شمع ہیں جس کے لئے فانوس کی ضرورت نہیں ہوتی۔

اُن پر یہ فرض ہے کہ کریں کوئی بندوبست — چھوڑیں نہ لڑکیوں کو جہالت میں شاد و مست
لیکن ضرور ہے کہ مناسب ہو تربیت — جس سے برادری میں بڑھے قدر و منزلت
آزادیاں مزاج میں آئیں نہ تمکنت (غرور) — ہو وہ طریق جس میں ہو نیکی و مصلحت
ہر چند ہو علومِ ضروری کی عالمہ (جاننے والی) — شوہر کی ہو مُرید (تابعدار) تو بچوں کی خادمہ

مذہب کے جو اصول ہوں اُس کو بتائے جائیں — باقاعدہ طریقِ پرستش (عبادت) سِکھائے جائیں
اوہام[1] (دھوکے، توہمات) جو غلط ہوں وہ دل سے مٹائے جائیں — سِکّے خدا کے نام کے دل میں بٹھائے جائیں
عصیاں (برائی، بدی، گناہ) سے محترز (پرہیز کرنے والی) ہو خدا سے ڈرا کرے — اور حُسنِ عاقبت (انجام بخیر ہونے کی) کی ہمیشہ دُعا کرے

تعلیم خوب ہو تو نہ آئے گی دام (فریب) میں — خالق سے لَو لگائے گی وہ اپنے کام میں[2]
خیرات ہی سے ہوگی غرض خاص و عام میں — اُس کو سکھایا جائے یہ واضح کلام میں
اچھا بُرا جو کچھ ہے خدا ہی کے ہاتھ ہے — نیکی اگر کرے گی تو فطرت (خلقت یا قدرت) بھی ساتھ ہے[3]

---

[1] جاہل عورتوں میں توہمات یعنی غلط اعتقادات بھی بہت زیادہ ہوتے ہیں اور اُس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ خدا کی عظمت و قدرت پر اُن کو پورا یقین نہیں ہوتا اور وہ تعلیمات مذہب سے بے خبر ہوتی ہیں۔ اس لئے تعلیم اُن کو ایسی دینی چاہیئے جس سے فضول اور غلط توہمات اُن کے دلوں میں جاگزیں نہ ہوں اور خدا کے سوا اور کسی طاقت سے مرعوب و متاثر نہ ہوں۔

[2] یعنی دنیاوی کام کاج بھی سب کرے گی مگر خدا کے دھیان سے غافل نہیں ہوگی۔

[3] مطلب یہ ہے کہ انسانی فِطرت یا تائیدِ ایزدی نیکی کا ساتھ دیتی ہے۔ بُرائی کا ساتھ نہیں دیتی۔ اِس لئے نیکی کرنے والوں کے مقاصد کی کامیابی میں اُن کی فطرت اور تائیدِ ایزدی معین ہوا کرتی ہے۔

تعلیم ہے حساب کی بھی واجبات سے — دیوار[۱] پر نشان تو ہیں واہیات سے
یہ کیا زیادہ گِن نہ سکے پانچ سات سے — لازم ہے کام لے وہ قلم اور دوات سے
گھر کا حساب سیکھ لے خود آپ جوڑنا — اچھا نہیں ہے غیر پہ یہ کام چھوڑنا

کھانا پکانا جب نہیں آیا تو کیا مزا — جوہر ہے عورتوں کے لئے یہ بہت بڑا
لندن کے بھی رسالوں میں میں نے یہی پڑھا — مطبخ[۲] سے رکھنا چاہئے لیڈی کو سلسلا
وقت آ پڑے تو گاڑھے گزی میں بھی عذر کیا — گھر کے لئے طعام پزی میں بھی عذر کیا

سینا پرونا عورتوں کا خاص ہے ہنر — درزی[۳] کی چوریوں سے حفاظت پہ ہو نظر
عورت کے دل میں شوق ہے اِس بات کا اگر — کپڑوں سے بچے جاتے ہیں گُل کی طرح سنور
کسبِ[۴] معاش کو بھی یہ فن ہے کبھی مفید — اِک شغل بھی ہے دل کے بہلنے کی بھی امید

---

۱ پرانے زمانہ میں چونکہ عورتوں کو حساب کی تعلیم نہیں دی جاتی تھی اس لئے وہ پوری گنتی بھی نہ گِن سکتی اور نہ لکھ سکتی تھیں۔ دیواروں یا دروازوں پر کتھے یا کوئلہ وغیرہ کے نشانات کے ذریعہ سے ضروری یادداشتیں رکھتی تھیں۔

۲ یعنی انگلستان کے رسالوں میں بھی مغربی عورتوں کے لئے کھانا پکانا سیکھنے اور باورچی خانہ سے تعلق رکھنے کی ضرورت پر مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔

۳ یعنی درزی عموماً کپڑا چرا لیا کرتے ہیں۔ عورتوں کو سینا پرونا اور قطع کرنا آتا ہوگا تو وہ درزی کی چوریوں پر نظر رکھ سکیں گی۔

۴ یعنی سینے پرونے کا ہنر ایک ایسا ہنر ہے جس سے کبھی ضرورت پڑنے پر عزت کی روزی حاصل کی جا سکتی ہے اور گھر میں اِس شغل سے دل بھی بہلتا رہتا ہے۔

سب سے زیادہ فکر ہے صحّت کی لازمی — صحّت نہیں درست تو بے کار زندگی
کھانے بھی بے ضرر ہوں صفا (صاف) ہو لباس بھی — آفت ہے (باعثِ مصیبت) ہو جو گھر کی صفائی میں کچھ کمی
تعلیم کی طرف ابھی اور اِک قدم بڑھیں — صحّت کے حفظ کے (صحت برقرار رکھنے کے لئے) جو قواعد ہیں وہ پڑھیں

پبلک میں کیا ضرور کہ جاکر تنی (اپنی شان دکھاؤ یعنی اکڑو) رہو — تقلیدِ مغربی پہ عبث (بے کار) کیوں ٹھنی رہو
داتا (خدا) نے دھن (مال و زر) دیا ہے تو دل[1] سے غنی رہو — پڑھ لکھ کے اپنے گھر ہی میں دیوی (قابلِ قدر و تعظیم) بنی رہو
مشرق کی چال ڈھال (طور طریق) کا معمول (دستور) اور ہے — مغرب کے ناز و رقص (ناچ) کا اسکول اور ہے

دنیا میں لذّتیں ہیں نمائش ہے شان ہے — ان کی طلب میں حرص میں سارا جہان ہے
اکبرؔ سے یہ سنو کہ جو اُس کا بیان ہے — دنیا[2] کی زندگی فقط اک امتحان ہے

حد سے جو بڑھ گیا تو ہے اُس کا عمل خراب
آج (حال)[3] اُس کا خوش نما ہے مگر ہوگا کل (مستقبل) خراب

---

[1] یعنی جو میسّر ہے اُس پر شاکر و قانع رہو اور حرص و ہوس کو دل میں جگہ نہ دو۔

[2] یعنی دنیا محض ایک دارالعمل یا مزرعۂ آخرت ہے۔ جیسے عمل یہاں انسان کرے گا ویسا ہی دارالجزا میں اُس کا نتیجہ پائے گا۔

[3] مطلب یہ ہے کہ جو لوگ طلبِ دنیا میں دین کی مقرر کردہ حدود سے آگے بڑھ جاتے ہیں اُن کی دنیا اگرچہ زیادہ خوش نما دکھائی دیتی ہے مگر دارالجزا میں اُن کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔

بے حجابی پڑوسی کے لئے نہیں حکّام رسی کے لئے

اُٹھ گیا[1] پردہ تو اکبر کا بڑھا کون سا حق — بے پکارے جو مرے گھر میں چلا آتا ہے

بے حجابی مرے ہمسائے کی خاطر سے نہیں — صِرف حکّام سے ملنے میں مزا آتا ہے

الاؤ پر فانوس نہیں رہ سکتا

گو ڈھیر[2] جدید روشنی کے شُعلوں کا ہے یہ — پردے کی احتیاج ہے کیا اِس بناؤ پر

جب شمع ہو تو اُس کی حفاظت ضرور ہے — فانوس کوئی رکھ نہیں سکتا الاؤ پر

[1] مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اپنی عورتوں کا پردہ اُٹھا دیتے ہیں وہ بھی اسے گوارا نہیں کرتے کہ اُن کے پڑوسی بغیر آواز دئے اُن کے گھر میں چلے آئیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے پردہ پڑوسی کے لئے تو نہیں اُٹھایا ہے بلکہ اس لئے اُٹھایا ہے کہ ہم کو اس میں مزا آتا ہے کہ ہماری عورتیں بھی انگریز حکّام سے بے پردہ مِل سکیں۔

[2] مطلب یہ ہے کہ نئی روشنی کی شعلہ رُو عورتوں کے بناؤ سنگھار کی مثال تو ایسی ہے جیسے پھٹے پُرانے کپڑوں کے ڈھیر میں کسی نے آگ لگا دی ہو اور آگ کے شُعلوں میں پھٹا پُرانا ہونا چھپ گیا ہو۔ بھلا ایسی بننے والی عورتوں کے لئے پردہ کی کیا ضرورت ہے۔ پردہ تو ایک فانوس ہے جس سے شمع کی روشنی کی حفاظت تو کی جا سکتی ہے مگر کسی الاؤ یا آگ کے ڈھیر پر اُس کو نہیں رکھا جا سکتا۔

نئی اور پرانی تہذیب

شیطان کو بھی شیطان نہ کہو

مغوی کو بھی بد نہ کہئے ترغیب ہے یہ — کس سے میں کہوں دل کی تخریب ہے یہ
شیطان کو رجیم[۱] کہہ دیا اک دن — اک شور مچا خلافِ تہذیب ہے یہ

قیدِ مشرب و ملت سے آزادی

ہر رنگ کی باتوں کا مرے دل میں ہے جھرمٹ — اجمیر میں کلیجا ہوں علی گڑھ میں ہوں بسکٹ[۲]
پابند کسی مشرب و ملت کا نہیں ہوں — گھوڑا مری آزادی کا اب جاتا ہے بگٹٹ

بھوکا یہ بھی نہ کہے کہ میں بھوکا ہوں

دقیانوسی طریق سے منھ موڑو — شیرازہ[۳] مذہبی لغت کا توڑو
بھوکے سے کہو حدِ تہذیب میں رہ — آنتوں[۴] سے کہو کہ قل ھو اللہ چھوڑو

---

۱ یعنی آج کل کی تہذیب میں یہ تلقین کی جاتی ہے کہ جو سیدھے راستہ سے بھٹکانے والا اور برائیوں کی طرف ورغلانے والا ہو اس کو بھی برا نہیں کہنا چاہئے۔ مسلمان جو اَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْم (پناہ مانگتا ہوں میں شیطانِ مردود سے) پڑھا کرتے ہیں اور اس میں شیطان کو رجیم یعنی مردود یا راندۂ درگاہ خداوندی کہا کرتے ہیں اس کو بھی آج کل خلافِ تہذیب سمجھا جانے لگا ہے۔ یہ تہذیب نہیں ہے بلکہ دل کی تخریب ہے۔

۲ یعنی میری آزادی اس قدر تیزی سے ترقی کر رہی ہے کہ میں کسی مسلک و مشرب کا پابند نہیں رہا۔ جیسا موقع دیکھتا ہوں ویسا بن جاتا ہوں۔ اجمیر میں دیسی وضع قطع اختیار کر لیتا ہوں اور علی گڈھ میں انگریزی۔ اجمیر کے کلیجے اور علی گڈھ کے بسکٹ مشہور تھے۔

۳ و ۴ یعنی اپنی زبان میں مذہبی الفاظ استعمال کرنے کے دقیانوسی طریقہ کی جو یک رنگی تم میں باقی ہے اسے ختم کر دو۔ سخت بھوک میں بھی یہ نہ کہا کرو کہ آنتیں قل ھو اللہ پڑھ رہی ہیں۔ کیونکہ قل ھو اللہ کے الفاظ قرآنی اور مذہبی ہیں۔ آنتوں کا قل ھو اللہ پڑھنا اردو محاورہ ہے بمعنی بھوک سے بے تاب ہونا۔

اونٹنی اور ٹم ٹم، قوّال اور چھم چھم

پیتا ہوں شراب آبِ زمزم[۱] کے ساتھ
رکھتا ہوں اِک اونٹنی بھی ٹم ٹم کے ساتھ
ہیں عشقِ حقیقی[۲] اور مجازی دونوں
قوّال کی بھی صدا ہے[۳] چھم چھم کے ساتھ

(ٹم ٹم: دو پہیوں کی ایک انگریزی گاڑی — قوّال: صوفیانہ اور حقانی چیزوں کا گانے والا — چھم چھم: گھونگھروؤں کی آواز)

نئی تہذیب کے انڈے

رہا کرتا ہے[۴] مرغِ فہم شاکی
نئی تہذیب کے انڈے ہیں خاکی
چھری سے اُن کو کٹوا کر فلک نے
خدا جانے ہماری ناک کیا کی

(ناک: غیرت۔ شرم۔ عزت)

---

[۱] زمزم اُس کنوئیں کا نام ہے جو خانۂ کعبہ میں ہے اور جس کو حضرت ہاجرہ نے اُس جگہ پر جہاں شدّتِ تشنگی سے حضرت اسمٰعیلؑ کے ایڑیاں رگڑنے پر پانی نکل آیا تھا مٹّی گھیر کر بنا لیا تھا۔

[۲] عشقِ حقیقی خدا کے عشق کو کہتے ہیں اور عشقِ مجازی دنیاوی معشوق کے عشق کو۔

[۳] یعنی میری تہذیب و معاشرت نئی اور پُرانی تہذیب کی ایک معجون مرکب بن گئی ہے۔ شراب پیتا ہوں اور آبِ زمزم کو متبرک سمجھ کر گھر میں رکھتا ہوں۔ اونٹنی پر بھی سوار ہوتا ہوں اور ٹم ٹم پر بھی۔ عشقِ حقیقی بھی کرتا ہوں اور عشقِ مجازی بھی۔ قوّالی بھی سنتا ہوں اور ناچ بھی دیکھتا ہوں۔

[۴] مطلب یہ ہے نئی تہذیب کے انڈے تو خاکی یعنی محض دیکھنے ہی دیکھنے کے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان انڈوں کو چھری سے کاٹ کر ہم نے اپنی قومی حمیّت و غیرت کو کہاں غارت کر دیا ہے۔ یعنی نئی روشنی کی نمائشی باتوں پر ریجھ کر اپنی قیمتی قومی خصوصیات کو کیوں برباد کر دیا۔

پیری کی نابالغی کا انتظار

کہتے ہیں اکبر یہ پیری عقل کا کیا پھیر ہے (یعنی تیری عقل کیسی اُلٹی ہو گئی ہے) — طبع تیری اس نئی تہذیب سے کیوں سیر ہے
عرض کرتا ہوں کہ میں بھی ہوں گا حاضر عنقریب — ہو چکا ہوں پیر[1] بس اب نابالغی کی دیر ہے

باپ کی لاحول اور ماں کی نوج پر خندہ زن

عزت کا ہے نہ اوج (ترقی۔ عروج) نہ نیکی کی موج (بہاؤ۔ لہر) ہے — حملہ ہے اپنی قوم پہ لفظوں کی فوج ہے
اس طرزِ تربیت پہ ہیں اغیار خندہ زن (ہنسی اڑانے والے) — لاحول باپ کی ہے تو ماؤں کی نوج[2] ہے

ہر پھول میں کانٹا

نوکروں پر جو گذرتی ہے مجھے معلوم ہے — بس کرم کیجے مجھے بے کار رہنے دیجئے

---

[1] نابالغی کے معنی ہیں ناسمجھی۔ بچپن۔ پیر نابالغ اُس بڈھے کو کہتے ہیں جو بچوں کی سی ناسمجھی کی باتیں کرے۔ مطلب یہ ہے کہ بڈھا تو میں بھی ہو گیا ہوں عنقریب اُس عمر کو پہنچنے والا ہوں جب عقل و شعور سے محروم ہو جاؤں گا۔ اُس وقت میں بھی شاید نوجوانوں کی طرح نئی تہذیب پر مائل ہو جاؤں۔

[2] نوج۔ خدا نہ کرے۔ دور پار۔ عورتوں کی زبان سے یہ لفظ اظہار تنفر کے لئے بے ساختہ نکلا کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آج کل کے نوجوانوں کی نہ عزت میں کوئی ترقی ہو رہی ہے نہ نیکی میں وہ سوائے اِس کے کہ تقریروں اور تحریروں کے ذریعے سے اپنی قوم پر حملہ کریں اور کچھ نہیں جانتے۔ ان کی تربیت ایسی ہوئی ہے جس پر اغیار ہنستے۔ باپ لاحول پڑھتے اور مائیں نوج کہتی ہیں۔ یعنی سب ہی اُن سے بیزار و ناخوش ہیں۔

راہ میں لیسنس[۱] ہی کافی ہے عزّت کے لئے — بس یہی لے لیجئے تلوار رہنے دیجئے

ڈاکٹر صاحب سے ملنا آپ[۲] کا اچھا نہیں — بیٹھئے گھر میں مجھے بیمار رہنے دیجئے

تیزیٔ مے[۳] کا اثر تھا نزع (جان کنی) کی آمد نہ تھی — خیر اُٹھئے توبہ استغفار (خدا سے گناہوں کی معافی مانگنا) رہنے دیجئے

مشرق غربی جھپیٹ میں

مشرق غربی جھپیٹ (بھوت پریت کا سایہ) میں ہے — دل[۴] سینے میں تھا سو پیٹ میں ہے

کیوں اس کو ہے مولوی پہ ترجیح — کیا بات گریجویٹ میں ہے

کیسہ (بٹوہ۔ تھیلی) خالی ہے بکس ہے خالی — جو کچھ[۵] ہے یہاں پلیٹ (رکابی) میں ہے

---

[۱] لیسنس لفظ انگریزی (Licence) بمعنی اجازت نامہ جو آج کل ہتھیاروں وغیرہ کے رکھنے والوں کو حکومت سے حاصل کرنا پڑتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آج کل لوگ تلوار وغیرہ کے لیسنس اپنی حفاظت یا اُن سے کام لینے کے لئے نہیں بلکہ صرف عزّت کے لئے حاصل کرتے ہیں۔

[۲] یہ خطاب بیمار شوہر کا اپنی بیوی سے ہے۔ یعنی شوہر کو بیمار رہنا منظور ہے مگر یہ منظور نہیں کہ عورت ڈاکٹر کے پاس جاکر اپنی عصمت کو خطرہ میں ڈالے۔

[۳] مطلب یہ ہے کہ شراب زیادہ پی لینے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جان نکل رہی ہے اور اس لئے توبہ استغفار شروع کر دی تھی مگر جب موت کا اندیشہ نہیں رہا تو پھر وہی حرکتیں شروع کر دیں۔

[۴] یعنی مشرق پر مغربی تہذیب کا یہ اثر ہوا ہے کہ دلوں میں سوائے شکم پُری کی فکر کے اور کوئی خیال نہیں رہتا گویا دل سینہ سے ہٹ کر پیٹ میں چلا گیا ہے۔

[۵] یعنی آمدنی میں سے کچھ پس انداز نہیں ہوتا سب کھانے پینے کے نذر ہو جاتا ہے۔

کاش بچّے پیدا ہی نہ ہوتے

مشرق کے جو ہو رہے وہ پستی میں پڑے
مغرب سے سبق لیا تو مستی میں پڑے

پیدا ہی نہ ہوتے کاش اطفال یہاں
آخر یہ کیوں بلائے ہستی میں پڑے

کالج کے پاس اور مسجد کے پاس

پاس کالج کے جو ہیں ووٹ طلب کرتے ہیں
پاس مسجد کے جو ہیں طاعتِ رب کرتے ہیں

عشوہ[1] ہائے عجمی کے وہ ہوئے ہیں گشتہ
یہ رخِ سادگیٔ طرزِ عرب کرتے ہیں

اُن کو ہے لمنڈ و وسکی کی ضرورت اور یہ
رفع پانی سے فقط خشکی لب کرتے ہیں

پھیلتے[2] وہ ہیں کہ اغیار سے جوڑیں رشتہ
یہ ہیں سمٹے ہوئے اور حفظِ نسب کرتے ہیں

وقت کو دیکھ کے اب آپ ہی انصاف کریں
وہ ستم کرتے ہیں یا آپ غضب کرتے ہیں

---

[1] یعنی کالج کے پڑھے ہوئے تو عجمی ناز و انداز و کرشموں پر مُبتلا ہو رہے ہیں اور مسجدوں میں خدا کی عبادت کرنے والے عرب کی سادہ زندگی ہی کو اچھّا اور قابلِ تقلید سمجھتے ہیں۔

[2] یعنی نئے تعلیم یافتہ تو نئے رنگ میں رنگ کر اغیار سے اپنے تعلّقات بڑھا رہے ہیں اور اُن سے رشتے قائم کرنا چاہتے ہیں اور پُرانے خیال کے لوگ اپنے حسب و نسب کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں اِس لیے وہ اغیار سے راہ و رسم نہیں بڑھاتے۔

نکٹائی[1] سے تو زُنّار ہی اچھی تھی

ہوائے کوچۂ مشرق کی موجیں یاد ہیں ہم کو
وہی تھی منزلِ راحت وہی زنّار اچھی تھی

نئی محفل کی نکٹائی تو گویا طوقِ گردن ہے
وہی بُت خانہ بہتر تھا وہی زُنّار اچھی تھی

آج کل کے لیڈر اور پہلے کے بزرگ

شوخی[2] یہ لیڈروں کی یہ ملّت کی ابتری
تاریک شب میں کشمکشِ برق و ابر ہے

محفوظ مثلِ انجمِ تاباں ہیں وہ بزرگ
ذوقِ صلوٰۃ جن کو ہے اور تابِ صبر ہے

لیونڈر اور عطرِ حنا

ہرچند کہ ہے مِس کا لونڈر بھی بہت خوب
بیگم کا مگر عطرِ حنا اور ہی کچھ ہے

سائے کی بھی سن سن ہوس انگیز ہے لیکن
اُس شوخ کے گھنگھرو کی صدا اور ہی کچھ ہے

---

۱ نکٹائی - انگریزی (Neck-tie) کپڑے کا ایک لمبا ٹکڑا جسے خوشنمائی سے گاؤدُم موڑ کر قمیص کے کالر میں باندھتے ہیں۔ زُنّار جنیو کو یعنی اُس تاگے کو کہتے ہیں جسے ہندو آڑا ترچھا کر کے گلے میں ڈالے رہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جنیو پہننے والے کو لباس پوشی کے اُن آداب و قواعد کا لحاظ نہیں رکھنا پڑتا ہے جن کی ٹائی باندھنے والے دلدادگانِ فیشن جدید کو محفلوں میں پابندی کرنی پڑتی ہے۔ گویا ٹائی گلے کا طوق بن کر ٹائی باندھنے والوں کو راحتِ لباس سے محروم کر دیتی ہے۔ وہ لباس نہیں پہنتے بلکہ گویا لباس میں بند ہو جاتے ہیں۔

۲ یعنی ہمارے لیڈروں کی شوخی و طرّاری اور ملّت کی ابتری کی مثال ایسی ہے جیسے کہ تاریک رات میں ابر اور برق میں کشمکش ہو رہی ہو لیڈر زوالِ ملّت کے ابر میں بجلی کی طرح کوند کر غائب ہو جاتے ہیں اور اُن کی روشنی باقی نہیں رہتی یعنی اُن کا کوئی اثر ملّت کے فلاح و بہبود پر نہیں پڑتا لیکن جن بزرگانِ دین کو نماز سے دلچسپی ہے اور جو صبر واستقلال سے کام لے سکتے ہیں۔ وہ ستاروں کی طرح ہمیشہ چمکتے رہنے اور روشنی کم رکھنے کے باوجود قوم کی صحیح رہنمائی میں مدد دیتے ہیں۔

مرکزیت ختم ہوجانے کا اندیشہ

کب کہتا ہوں یہ شیخ معزز نہ رہیں گے — البتہ[1] یہ ہے خوف کہ مرکز نہ رہیں گے!
سچ کہتا تھا معمار کسی وقت میں اکبر — اُٹھا دو فٹہ (ناپنے کا انگریزی پیمانہ) اب یہ مرے گز نہ رہیں گے!

سول لائن اور شہر کی رہائش

جناب ہی کو مناسب ہے یہ سول[2] لائن — نیاز مند کو تو شہر ہی میں راحت ہے
زمانہ ہے کہ وہ دشمن ہے صاف گوئی کا — زبان ہے کہ نہیں مانتی (باز نہیں رہتی) مصیبت ہے

زندہ نما مُردے اور مُردوں سے بدتر زندے

یہ پوچھا شیخ سے میں نے کہ کہئے کیا گذرتی ہے — یہ سن انیس سو دس ہیں نئے مقصود و منظر ہیں
نہایت یاس و حسرت سے وہ بولے کیا کہوں تم سے — یہ دو مصرعے سنو جن میں نہاں دفتر کے دفتر ہیں
نئی[3] تعلیم کے مُردے تو زندہ ہیں تماشوں میں — پرانی وضع کے زندے مگر مُردوں سے بدتر ہیں

---

[1] مطلب یہ ہے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ قدیم رہنمایانِ دین کی عزت نہ کی جائے لیکن اندیشہ یہ ہے کہ ان کی مرکزیت ختم ہو جائے گی یعنی قوم کو اُن سے وابستگی باقی نہیں رہے گی اور اُن کی پیروی نہیں کی جائے گی۔ جس طرح پیمایش کے آلات بدل گئے ہیں اسی طرح اخلاقی معیار بھی بدل جائیں گے۔

[2] سول لائن۔ انگریزی (Civil Lines) شہر کے اُس حصہ کو کہتے ہیں جہاں انگریز افسروں کی کوٹھیاں اور بنگلے ہوتے ہیں۔

[3] یعنی نئے تعلیم یافتہ جو خدا و مذہب سے بیگانہ اور اپنی قومی خصوصیات سے محروم ہوجانے کی وجہ سے حقیقت میں مر چکے ہیں وہ تو متحرک تصویروں کی طرح دنیا کے تماشائیوں کی نظر میں زندہ دکھائی دے رہے ہیں اور تماشا بنے ہوئے ہیں۔ لیکن پرانی روشنی کے لوگ جو اپنے مذہب اور اپنی خصوصیات پر قائم ہیں وہ مُردوں سے بدتر ہو رہے ہیں۔

نئی روشنی عارضی ہے اور پُرانی پائیدار

روشنی جن میں نئی ہے وہ مِری سُنتے نہیں
لاکھ سمجھاؤ کہ صاحب ہے یہ فانی (جلد ختم ہو جانے والی) روشنی

انجم و شمس و قمر لیکن ہیں میرے ہم طریق (ہم مسلک)
وضع پر قائم ہیں ان میں ہے پُرانی روشنی

عاشقی عقل کے ساتھ

عاشقی[۱] اُن کی نہیں ہے عقل سے بالکل جُدا
اہلِ دل وہ بھی ہیں لیکن دل بدن کے ساتھ ہے

وہ نہیں ہیں میرے چاکِ جیب (گریباں) و داماں میں شریک
ہے جنوں اُن کو بھی لیکن پیرہن کے ساتھ ہے

آہوئے[۲] رعنائے دشتِ ہو کے وہ قائل نہیں
آنکھ اُن کی آہوئے دشتِ خُتن (قمیص لباس) کے ساتھ ہے

مجھ[۳] کو اُلجھانے (پھانسنے) کو کافی ہوگئی سُنبل کی شان
جوشِ ہبودا (جنون و عشق) اُن کا زلفِ پُرشکن (پر پیچ و خم) کے ساتھ ہے

---

[۱] مطلب پہلے دو شعروں کا یہ ہے کہ آج کل کے عاشقوں کا عشق بھی عقل سے آزاد نہیں ہوتا۔ وہ اہلِ دل تو ہوتے ہیں یعنی دل میں محبّت تو رکھتے ہیں مگر اُن کو اپنے تن بدن کا ہوش بھی رہتا ہے وہ پُرانے زمانہ کے عاشقوں کی طرح گریبان اور دامن کو چاک نہیں کیا کرتے۔ محبّت کا جنون اُن کو بھی ہوتا ہے مگر وہ اپنے لباس کو پھاڑا نہیں بلکہ سنوارا کرتے ہیں۔

[۲] "آہوئے رعنائے دشتِ ہُو"۔ ہُو کے جنگل کا خوش خرام ہرن۔ ہُو اللہ کا اسمِ ذات ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید کی اس آیت سے ظاہر ہے۔ ھُوَ الْاَوَّلُ ھُوَ الْاٰخِرُ۔ یعنی وہ اوّل ہے اور وہ آخر۔ دشتِ ھُو اصطلاحِ صوفیہ میں مقامِ لاہوت کو کہتے ہیں۔ یعنی جہاں سوائے ذاتِ الٰہی کے ماسوا کا کوئی تصوّر نہیں ہوتا۔ ختن ملک تاتار کا ایک علاقہ جہاں کا مشک مشہور ہے اور جہاں کے بعض ہرنوں کے نافہ سے مشک نکلتا ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ آج کل کے عاشقوں کی نظریں دشتِ ھُو کے آہو پر نہیں بلکہ دشتِ ختن کے آہو پر رہتی ہیں۔ یعنی عشقِ الٰہی کے وہ قائل نہیں ہیں وہ تو صرف اُن معشوقوں سے عشق کرتے ہیں جن سے اُن کی خواہشاتِ نفس پوری ہوں۔ یا دنیاوی فوائد حاصل ہوں۔

[۳] سُنبل ایک خوشبودار گھاس ہوتی ہے جس کی پتّیاں بڑی لمبی لمبی اور گھنی ہوتی ہیں۔ اس کو بال چھڑ بھی کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ پُرانے لوگ تو سُنبل سے بھی اُلجھ جاتے ہیں یعنی اُن کو سبز پتّوں میں بھی نُورِ الٰہی نظر آجاتا ہے اور وہ اُن پر عاشق ہو جاتے ہیں مگر نئے عاشقوں میں جوشِ عشق حسینوں کی پُرشکن زلف ہی سے پیدا ہوتا ہے۔

یہ نہیں تو کچھ نہیں باتیں ہی باتیں ہیں فقط
ہر زباں اپنے جدا طرزِ سخن کے ساتھ ہے

ہم نہ رہے جان رہ گئی

کیا پوچھنا ہے حکمتِ مغرب کا واہ واہ — فطرت بھی اُس کو دیکھ کے حیران رہ گئی
سمجھے[1] تھے یہ کہ ایک ہیں ہم اور ہماری جاں — دیکھا مگر کہ ہم نہ رہے جان رہ گئی

[1] مطلب یہ ہے کہ اہلِ مغرب کی یہ حکمت و عقلمندی قابلِ داد ہے کہ انھوں نے ہم کو ہماری جان سے علیٰحدہ کردیا یعنی ہم تو نہیں رہے مگر ہماری جان باقی رہ گئی حالانکہ ہم سمجھتے تھے کہ ہم اور ہماری جان دو الگ چیزیں نہیں بلکہ ایک ہی ہیں۔ ہم نہیں ہوں گے تو ہماری جان بھی نہیں ہوگی اور ہماری جان نہیں ہوگی تو ہم بھی نہیں ہوں گے۔ مگر ہوا یہ کہ انگریزوں نے اپنی حکمت عملی سے ہم کو یعنی ہماری اُن تمام قومی اور ملی خصوصیات کو تو ختم کردیا جن کی وجہ سے ہم ہم تھے صرف ہماری جان باقی رہ گئی اور وہ جان ایک ایسے قالب میں منتقل ہوگئی جس پر اُس ہم کا اطلاق نہیں ہوسکتا جس کا پہلے ہوتا تھا۔ یعنی آج کل کے ہم وہ ہم نہیں رہے جو پہلے تھے۔

نئی اور پرانی تعلیم

خاں صاحب اور خان ساماں صاحب

تم نے جو سُنا صحیح ہے ہاں صاحب — عربی سے گریز (گھبراتے ہیں، بھاگتے ہیں) کرتے ہیں خاں صاحب
سچ کہتے ہیں وہ کہ ہم کو اس سے کیا کام — ہیں کیمپ میں ہم تو خان[1] ساماں صاحب

مغربی تعلیم کا اثر دِلوں پر

مغربی تعلیم سے دِل ایشیا کا ہے ہلول (غمگین) — کر دیا خلقت کو اس نے بے تمیز و بے[2] اُصول
جو کرے اصلاح اس کی مدح کا ہے مستحق — اور باتوں کو بظاہر میں سمجھتا ہوں فضول

سعدی کا بھتیجا اور مِلٹن کا غلام

ماسٹر صاحب کا عِلم اِس وقت گو ہے نیک نام — اہلِ دانش (سمجھدار) میں مگر میرا فزوں (زیادہ) ہے احترام (عزت)
بات بالکل صاف ہے پیچیدگی کچھ بھی نہیں — میں[3] ہوں سعدی (شیخ سعدی شیرازی) کا بھتیجا وہ ہیں مِلٹن (مشہور انگریزی شاعر) کے غلام

---

[1] خان ساماں کے لفظی معنی ہیں گھر کا سامان کرنے والا۔ میر ساماں۔ آج کل انگریزوں کے بیرے یعنی خدمتگار کو کہتے ہیں۔ انگریزوں کے خان ساماؤں کو عربی سیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔

[2] یعنی انگریزی تعلیم سے نہ تو لڑکوں میں ادب و تمیز رہی نہ کسی اُصول کی پابندی۔

[3] سعدی کا بھتیجا ہونے سے مراد یہ ہے کہ سعدی میرے بزرگوں میں تھے۔ علاوہ ازیں مسلمان عام طور شیخ سعدی کو "چچا سعدیؒ" بھی کہا کرتے ہیں۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ پُرانے تعلیم یافتوں میں عام طور پر عقل اور سمجھ زیادہ ہوا کرتی تھی اور ملٹن کے غلاموں یعنی نئے تعلیم یافتوں میں علمی نمود و نمائش زیادہ ہوتی ہے۔

اسکولی قوم

اندازِ سلف کو یک قلم بھولی قوم ہے سالک راہِ غیر معمولی قوم

بزرگوں کے طریقے — بالکل قطعی — چلنے والی — یعنی نئے راستوں پر

جمعیتِ دین ودل سے کچھ کام نہیں [1] قومی اسکول ہے اور اسکولی قوم

تعلیم جدید کا فتنہ

تہذیبِ قدیم کے جب ارکان تھے چُست

(درست، ٹھیک)

مُلکی حالات سب رہے صاف و دُرست

تعلیم جدید نے کیا فتنہ بپا

[2] اے بادِ صبا! ایں ہمہ آوردۂ تُست

---

[1] یعنی قوم بزرگوں کی راہ ورسم کو چھوڑ کر نئی نئی راہوں پر چل رہی ہے۔ اب نہ کسی کو دینی اتحاد و میل ملّت سے کام ہے اور نہ دل کے سُکون واطمینان کی فکر۔ قومی اسکولوں میں پڑھ کر جو قوم نکل رہی ہے۔ وہ مسلمانوں کی قوم نہیں بلکہ اسکولی قوم ہے۔ جس کے دل ودماغ میں سوائے اسکولی تعلیم کے اور کچھ نہیں ہے۔

[2] یہ فارسی مصرع کسی مشہور فارسی شاعر کا ہے۔ جس کا ترجمہ ہے "اے صبح کی مشرقی ہوا یہ سب تیرا ہی لایا ہوا ہے" مطلب اشعار کا یہ ہے کہ ملک میں جو سیاسی فتنہ وفساد برپا ہو رہے ہیں یہ سب تعلیم جدید کی وجہ سے ہیں اور تعلیم جدید چونکہ انگریزوں کی پھیلائی ہوئی ہے اس لئے فتنہ وفساد کے یہ بیج بھی خود انگریزوں ہی کے بوئے ہوئے ہیں۔ جب تہذیب قدیم کی ساری خوبیاں اور خصوصیات قوم میں موجود تھیں اُس وقت تک مُلک میں کوئی گڑبڑ نہیں تھی بلکہ ہر طرح امن وامان تھا۔

بے غیرتی اور بے بصیرتی

کیسا اسلام[۱] ان میں غیرت ہی نہیں — ایمان کہاں کہ جب بصیرت ہی نہیں
طرزِ تعلیم پر ہے لیکن الزام — وہ علم نہیں تو وہ طبیعت ہی نہیں

فارسی کے ساتھ اُردو بھی رخصت

اقبال کے ساتھ اے خِرد تو بھی گئی — غیرت[۲] کے ساتھ مذہبی بُو بھی گئی
سچ کہتے (مراد حکومت) ہیں حضرتِ کرامت[۳] اکبر — رخصت[۴] ہوئی فارسی تو اُردو بھی گئی

---

۱ مطلب یہ ہے کہ جدید طرزِ تعلیم سے صرف یہی خرابی نہیں ہوئی کہ صحیح علم سے ہم محروم ہو گئے بلکہ ہمارے مذاق اور ہماری طبیعتیں بھی بدل گئیں۔ ہمارے دلوں میں وہ نور اور عرفان الٰہی کی بصیرت نہیں رہی جس سے ایمان کو تقویت پہنچی ہے اور اسلام ہی ہم سے رخصت نہیں ہوا بلکہ اسلامی غیرت بھی ہم میں باقی نہیں رہی۔ یعنی اس کا احساس بھی نہیں رہا کہ ہم مسلمان کہلاتے اور مسلمان قوم میں سمجھے جاتے ہیں۔ ہم سے ایسی حرکات سرزد نہ ہونی چاہئیں جو براہِ راست ہماری اور بالواسطہ ہماری قوم کی ذلت اور رسوائی کا باعث ہوں۔

۲ حدیث قدسی ہے اَلْحَیَاءُ شُعْبَۃٌ مِّنَ الْاِیْمَانِ۔ حیا اور غیرت بھی ایمان کی ایک شاخ ہے۔ جب مسلمان میں حیا اور غیرت نہیں رہتی تو اُس کا ایمان اور مذہب بھی کمزور ہو جاتا ہے۔

۳ کرامت سے مراد ہیں مولوی سیّد کرامت حسین کنتوری۔ بیرسٹرایٹ لا الہ آباد و بانی "کرامت حسین گرلز کالج لکھنؤ"۔ بعد کو الٰہ آباد ہائی کورٹ کے جج بھی ہو گئے تھے۔ وفات ۱۹۱۷ء (از مولٰنا عبدالماجد صاحب دریا آبادی)

۴ یعنی زبان فارسی جس کی بنیادوں پر اُردو کی عمارت کھڑی کی گئی ہے اگر اُس کا پڑھنا پڑھانا مسلمانوں نے چھوڑ دیا تو یہ سمجھنا چاہئے کہ اُردو بھی ختم ہو گئی۔ یعنی اُردو کی اکثر و بیشتر ادبی خوبیاں ادب فارسی کی رہینِ منّت ہیں۔ اور اُن کے برقرار رکھنے کے لئے فارسی جاننا بھی ضروری ہے۔

موجِ تسنیم کی بجائے وھسکی کی لہر

قسمت[1] وہ کہاں کہ اب وہ تقسیم نہیں
کیوں کر وہ اثر ہو جب وہ تعلیم نہیں

لغزش[2] (پیروں کا لڑکھڑانا) پہ مری بُرا نہ مانو اے شیخ
وھسکی (شراب) کی ہے لہر موجِ تسنیم (بہشت کی ایک نہر) نہیں

نہ بازوؤں میں قوّت نہ دِل میں نور

انگریز[3] میں عظمتِ جہانبانی (حکومت برطانی) ہے
ہم میں اک شانِ علمِ روحانی ہے

لیکن تم لوگ تو کسی میں بھی نہیں
بازو نہ قوی نہ قلب نورانی ہے

---

[1] یعنی پہلے جن اخلاقی اقدار سے ہماری قسمت کو عروج ہوا تھا اور ہم نے قابلِ رشک ترقیاں کی تھیں اب حالات ایسے ہو گئے ہیں کہ وہ اخلاقی خصوصیتیں ہمارے حِصّے میں نہیں آتیں اور آج کل کی تعلیم سے وہ اثرات مترتّب نہیں ہوتے جو قدیم تعلیم سے ہوا کرتے تھے۔ پھر ہم اپنی قومی حیثیت سے آج کل کیسے ترقّی کر سکتے ہیں۔

[2] یعنی میری لغزشوں پر شیخ کو ناراض نہ ہونا چاہئے کیونکہ یہ لغزشیں شیخ کے کسی ایسے متبع کی نہیں ہیں جو بہشت کی آرزو اور خدا کا خوف دل میں رکھتا ہے بلکہ ایک نئی روشنی کے دلدادہ کی ہیں جو شراب کے نشہ میں مدہوش ہے۔

[3] یعنی انگریز اپنی حکومت اور حکومتی صلاحیتوں کی وجہ سے دنیا میں ممتاز ہیں اور قدیم روش کے مسلمانوں میں ایک امتیازِ ی علمِ روحانی کی شان ہے۔ یعنی اِن نئے تعلیم یافتوں میں کوئی امتیازی خوبی نہیں ہے۔ نہ اُن کے پاس کوئی مادّی قوت و طاقت ہے اور نہ اُن کے دل میں روحانیت کا نُور۔

بے نور کے تارے

تعلیم بھی پائی سب کے پیارے بھی ہوئے　　دنیا کو بھی خوش کیا ہمارے بھی ہوئے
(ہماری طرف منسوب ہوکر ہمارے نام کو بھی چمکایا)

لیکن جو یہ نورِ طبع پایا نہ گیا　　پھر کیا تم عرش کے تارے بھی ہوئے
(دل میں روحانیت کا نور)　(سب سے اونچے آسمان کے تارے یعنی بہت بڑے درجہ والے)

طلب عہدہ اور الفتِ وطن

تکمیل میں اُن علوم کے ہو مصروف　　نیچر کی جو طاقتوں کو کردیں مکشوف
(کائنات۔ قدرت)　(ہویدا۔ واضح)

لیکن تم سے امید کیا ہو کہ تمھیں　　عہدہ[1] مطلوب ہے وطن ہے مالوف
(پیارا۔ عزیز)

فونوگرافی تعلیم

طفلِ مکتب کہ سخن ہا ز زباں می گوید　　شکوہ کم کن کہ چنیں گفت وچناں می گوید

طبع او فونوگراف[2] است و سرودش سبقش　　آنچہ بستند برو نقش ہماں می گوید
(اس کا نغمہ یا گیت)

[1] مطلب یہ ہے کہ اُن ہی علوم طبیعیہ کا حاصل کرنا انسان کے لئے مفید ہوسکتا ہے جن سے کائنات اور قدرت کی چھپی ہوئی طاقتوں کا انکشاف ہو اور ان علوم کا حاصل کرنا اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم سرکاری عہدے حاصل کرنے کے لئے نہیں بلکہ بنی نوع انسان اور اپنے ملک کو فائدہ پہنچانے کے لئے علم وفنون حاصل کریں اور اُن کے حاصل کرنے کے لئے ہمیں دنیا کے جس حصّہ میں بھی جانا پڑے وہاں جائیں۔ لیکن ہم تو سرکاری عہدوں کے بھوکے ہیں اور وطن عزیز کو چھوڑکر باہر جانے، پردیس کی تکلیفیں اُٹھانے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

[2] فونوگراف = Phonograph آلۂ حافظ وناشر الصّوت۔ یعنی جس کے ذریعہ سے آوازیں محفوظ بھی کی جاتی ہیں اور نشر بھی۔ مطلب یہ ہے کہ آج کل کے بچّوں کے متعلق یہ شکایت کرنا بے کار ہے کہ اُن کی زبان سے یہ کیوں نکلتا ہے یا وہ کیوں نہیں نکلتا۔ آج کل کے بچّوں کی مثال تو فونوگراف کی سی ہے۔ فونوگراف میں جیسی آوازیں بھری جاتی ہیں ویسی ہی اُس میں سے نکلتی ہیں۔ ہمارے بچّے بھی اپنی عقل وشعور سے کام نہیں لیتے۔ اُستاد کے رٹائے ہوئے سبقوں کو دُہرا دیتے ہیں۔

مذاقِ قوم کو مذہب سے بیگانہ نہ ہونے دو

مسلمانوں میں اب تعلیمِ انگلش رُک نہیں سکتی — کسی سے مشرق و مغرب کی سازش (میل ملاپ) رُک نہیں سکتی
وہ نزلہ[1] رُک نہیں سکتا، یہ ہیچش رُک نہیں سکتی — بڑے بوڑھوں کی لیکن یہ بھی خواہش رُک نہیں سکتی

مذاقِ قوم بے گانہ (ناآشنا) نہ ہو اللہ اکبر سے
یہ نقشِ جانفزا مٹنے نہ پائے دل کے دفتر سے

گملوں ہی پر پھولنے والے لڑکے

دیکھ آئے قوم سُنتے تھے جسے — چند لڑکے ہیں مشن (مسیحیت کی تبلیغ کرنے والا اسکول) اسکول کے
بار آور پارک (باغیچہ) میں یہ ہوں گے کیا — گملوں[2] ہی پر رہ گئے ہیں پھول کے

---

[1] نزلہ زکام مشرق میں زیادہ ہوتا ہے اور ہیچش مغرب میں۔ مشرق و مغرب کے ملاپ سے اہلِ مشرق کو نزلہ بھی ضرور ہوگا اور ہیچش بھی۔ یعنی دماغ پر بھی اثر پڑے گا اور معدہ پر بھی۔ لیکن اس کے باوجود بڑے بوڑھوں میں یہ خواہش باقی رہے گی کہ قوم کا مذاقِ طبع کہیں ایسا نہ بگڑ جائے کہ وہ اللہ اکبر سے بیگانہ ہو جائیں اور خدا پرستی کا روح پرور نقش اُن کی لوحِ دل سے مٹ جائے۔

[2] یعنی آج کل جس کو قوم کہتے ہیں وہ کچھ طالبِ علم ہیں اور وہ بھی زیادہ تر مشن اسکول کے۔ اُن سے بڑے ہونے پر قوم کو فائدہ پہنچنے کی کیا امید ہو سکتی ہے کیونکہ وہ تو اسکولوں اور کالجوں ہی میں اپنے آپے سے باہر ہو گئے ہیں اور قوم کو نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے ہیں یا یہ کہ اُن کی بار آوری (فائدہ رسانی) کی قوت اسکولوں کے گملوں میں اُن کے پھولوں کے کھل جانے سے ختم ہو گئی ہے۔ پھولنا یا پھول جانا اُردو کا ایک محاورہ بھی ہے (جس کے معنی ہیں مغرور ہو جانا۔ اترانا۔ اور درختوں کا پھولنا اُن کے پھول دینے یا اُن میں پھول آنے کو بھی کہتے ہیں۔ جس پودے کو گملے میں پھول آ جانے کے بعد گملے سے زمین میں منتقل کیا جاتا ہے وہ اُس وقت تک پھل نہیں دیتا جب تک کہ اُس میں پھر پھول نہ آئیں۔

کفر کے ساتھ جنگ جوئی نہ رہی

ہم میں وہ خوبی و نکوئی (نیکی) نہ رہی — پاکیزگی (پرہیزگاری) و خجستہ خوئی (نیک خصلتی) نہ رہی
تعلیمِ جدید سے ہوا کیا حاصل — ہاں[1] کفر کے ساتھ جنگ جوئی نہ رہی

ندوہ کو تو قبلہ رخ رہنے دو

کہنا مجھ کو جو کچھ ہے وہ کہنے دیں — دینی[2] علموں کی موج کو بہنے دیں
شبلی (مولانا شبلی نعمانی) کی دعا بتانِ مغرب (یعنی انگریزوں سے) سے یہ ہے — ندوہ[3] (ندوۃ العلماء) کو حضور قبلہ رخ رہنے دیں

کاش ہم باپ اور کمیٹی میں آپ نہ ہوتے

تعلیم ہے لڑکوں کی کہ اک دامِ بلا (مصیبت کا جال) ہے — اے کاش کہ اس عہد میں ہم باپ[4] نہ ہوتے
یہ آپ کی برکت ہے کہ پیچیدگیاں ہیں — بہتر تھا کمیٹی میں اگر آپ[5] نہ ہوتے

---

[1] یعنی تعلیمِ جدید سے ہماری ساری اخلاقی خوبیاں اور بھلائیاں تو ختم ہو گئیں۔ صرف ایک چیز حاصل ہوئی جس کو مذہبی رواداری اور بے تعصبی کہا جاتا ہے یعنی اپنے مذہب کی محبت کے تقاضے سے ہم جو کفر سے نفرت رکھتے اور اُس کے خلاف برسرِ پیکار رہا کرتے تھے۔ اب یہ جذبۂ مخالفتِ کفر ہمارے اندر نہیں رہا۔

[2] یعنی علومِ دینیہ کی درس گاہوں کے فیض کو جاری رہنے دیں۔

[3] یعنی علی گڑھ کی طرح ندوۃ العلماء میں مغربی مقاصدِ تعلیم کو داخل نہ کریں اور اُس کا مقصد یہی رہنے دیں کہ جو مسلمان اس درس گاہ سے فارغ التحصیل ہو کر نکلیں وہ مرکزِ اسلام اور مرکزِ قومیت سے نہ ہٹیں بلکہ اُس پر اور زیادہ مضبوطی سے قائم ہو جائیں۔

[4] یعنی ہم کو اپنی اولاد کی وہ تکلیفیں اور ابتر حالتیں نہ دیکھنی پڑتیں جن کے جدید تعلیم کی وجہ سے وہ شکار ہو رہے ہیں۔

[5] آپ سے مراد وہ جدید تعلیم یافتہ مسلمان لیڈرانِ قوم ہیں جو انگریزوں کی مشاورتی مجلسوں اور تعلیمی درس گاہوں کی منتظمہ جماعتوں کے ممبر ہیں۔ مسلمانوں کی تعلیم میں جو پیچیدگیاں پیدا ہوئی ہیں وہ حضرت اکبرؔ کے نزدیک ایسے مسلمان ممبروں ہی کی وجہ سے ہوئی ہیں جو نئی روشنی کے گرویدہ ہو گئے ہیں اور پرانی تعلیم کو اچھا نہیں سمجھتے۔

دیوبند، ندوہ اور علی گڈھ

ہے دلِ روشن مثالِ دیوبند[1] — اور ندوہ ہے زبانِ ہوشمند
ہاں علی گڈھ کی بھی تم تشبیہ لو — اِک معزز پیٹ بس اُس کو کہو
پیٹ ہے سب پر مقدم اے عزیز — گو کہ فکرِ آخرت ہے اصل چیز

[1] دیوبند ہندوستان کے صوبۂ یو۔پی کے ضلع سہارنپور کا ایک مشہور قصبہ ہے جہاں مولانا محمدؒ قاسم نانوتوی وغیرہ علمائے مسلکِ قدیم کا ایک مذہبی دار العلوم ہے۔ ندوہ کے معنی انجمن کے ہیں یہاں مراد ندوۃ العلماء سے ہے۔ اس نام سے عربی اور مذہبی تعلیم کا ایک ادارہ مولانا محمدؒ علی مونگھیری اور مولانا شبلی وغیرہ نے ۱۹۰۱ء میں قائم کیا تھا اور جس کا مقصد عربی اور دینی نصاب وطریقۂ تعلیم میں ایسی اصطلاحات کا جاری کرنا تھا جن سے اس درس گاہ کے تعلیم یافتہ عربی زبان بے تکلفی سے بول سکیں اور لکھ سکیں اور دینی معاملات میں وہ بالکل پرانی لکیر کے فقیر ہی نہ بنے رہیں بلکہ اپنی سمجھ بوجھ اور روشن خیالی سے کام لے سکیں۔ علی گڈھ سے مراد سر سید احمد خاں کا قائم کردہ علیگڈھ کالج ہے جو اَب یونیورسٹی ہوگئی ہے۔ اور جس کے قائم کرنے کا مقصد زیادہ تر مسلمانوں کو اعلیٰ سرکاری نوکریاں دلوانا اور مُلک میں اُن کی قومی اور سیاسی پوزیشن کا قائم کرنا تھا۔ حضرتِ اکبرؔ کہتے ہیں کہ دیوبند کو دلِ روشن کہنا چاہیئے۔ ندوہ کو زبانِ ہوشمند۔ اور علی گڈھ کو "ایک معزز پیٹ" یعنی دیوبندی علماء کے دلوں میں تو خدا ترسی اور روحانیت کا نُور ہوتا ہے۔ اور ندوی علماء باتیں بڑی سمجھداری کی کرتے ہیں اور علیگڈھ مسلمانوں کو معزز نوکریاں دلواتا ہے یعنی اُن کے لئے عزت سے پیٹ پالنے کا انتظام کرتا ہے۔ آخری شعر میں فرماتے ہیں کہ اس میں شک نہیں کہ پیٹ کا فکر سب سے مقدم ہے اور اس لحاظ سے مذکورہ تینوں درس گاہوں میں علیگڈھ کو فوقیت حاصل ہے۔ لیکن زندگی کا مآل کار اور مقصدِ خلقتِ انسانی محض پیٹ بھرنا نہیں ہے بلکہ اصل مقصد دار الجزا یعنی آخرت کی تیاری کرنی ہے۔ اور اصل چیز جب آخرت ہے تو دیوبند اور ندوہ کا درجہ جہاں مسلمانوں کی محض دنیا ہی کو نہیں بلکہ اُن کی عاقبت کو بھی درست کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے علی گڈھ سے بڑھا ہوا ہے۔

تعلیم بازاری عقل سرکاری

اُس چیز کا کیا کہنا اکبر تھا جس نے دلوں کو نیک کیا
لاکھوں ہی طبائع کو کھینچا ہموار کیا اور ایک کیا (یعنی ہم مذاق و ہم خیال کیا)
جو قوم کو ابتر کرتے ہیں اب اُن اثروں (نتائج) پر رونا ہے
معلوم نہیں کیا مطلب ہے معلوم نہیں کیا ہونا ہے
تعلیم جنھوں نے پائی ہے وہ بد تو نہیں ہیں بے حِس ہیں (یعنی احساس قومیت نہیں رکھتے)
دعوے جو ہیں رسم و مذہب کے سب اُن کے یہاں سے ڈسمس[۱] ہیں
کیوں دولت و قوّت کی ہے کمی اِس کے تو سبب پیچیدہ ہیں
کچھ[۲] اس کو سمجھ سکتے ہیں وہی بوڑھے جو زمانہ دیدہ (تجربہ کار) ہیں
لیکن جو یہ سوشل (تمدنی و معاشرتی) آفت ہے طوفان بپا ہے فتنوں کا
بے مہریِ (بے مروتی) مِلّت کی یہ ہوا اِک قہر (غضب، مصیبت) ہے جس کا ہر جھونکا

۱؎ ڈسمس لفظ انگریزی Dismiss بمعنی برخاست کرنا، یا عدالت کا کسی نالش کو خارج کرنا یعنی دعوے کو ناقابلِ دادرسی سمجھنا۔
مطلب یہ ہے کہ مذہب و قومیت کے نام پر جو درخواستیں اُن سے کی جاتی ہیں اُن کو وہ قابل اعتناء نہیں سمجھتے۔

۲؎ مطلب یہ ہے کہ آج کل قوم میں دولت و قوت کی جو کمی ہوتی چلی جا رہی ہے اُس کے اخلاقی اور اقتصادی اسباب پیچیدہ ہیں جو آسانی سے نئی نسلوں کی سمجھ میں نہیں آسکتے۔ البتہ بوڑھے لوگ ایسے موجود ہیں جنھوں نے قومی عروج کا زمانہ بھی دیکھا ہے وہ سمجھتے ہیں کہ اس کا سب سے بڑا سبب اپنی حکومت کا نہ ہونا ہے اور مرکزِ قومیت سے روگردانی کرنا ہے۔

اس کا جو سبب ہے سُن لو اُسے سب پردہ عیاں ہے ظاہر ہے

الفاظ صریح و واضح ہیں یہ مطلعِ اکبر حاضر ہے

تعلیم[۱] جو دی جاتی ہے ہمیں وہ کیا ہے فقط بازاری ہے

جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے

کالج کا کاکا توُا

نہ تیر افگنی (تیراندازی) ہے نہ اب حکمرانی (صلاحیت حکومت) نہ وہ وضعِ ملّت (طور طریق) نہ قرآن خوانی

نہ باہم ادب ہے نہ وہ مہربانی یہی کہتی پھرتی ہے لڑکے کی نانی (یعنی پرانے زمانہ کی بھولی عورتیں)

ہر اک شاخ میں پاس یہ اے بُوا ہے مرا لال[۲] کالج کا کاکا توا ہے

---

[۱] اِس شعر کو پہلے تین شعروں کے ساتھ ملا کر پڑھنا چاہئے۔ مطلب یہ ہے کہ آپس کی بے مہری و بے مروّتی کی وجہ سے تمدّنی اور معاشری فتنوں کا جو طوفان آج کل ہماری قوم میں بپا ہے اُس کے اسباب .... واضح ہیں اور وہ یہ ہیں کہ تعلیم جو ہم کو دی جا رہی ہے وہ بازاری ہے یعنی شریفوں کی سی نہیں بلکہ اوباشوں کی سی ہے۔ اِس تعلیم سے شریفانہ نہیں بلکہ اوباشی خصائل پیدا ہوتے ہیں اور عقل جو ہم کو سکھائی جا رہی ہے ہماری اپنی عقل نہیں بلکہ سرکاری عقل ہے تاکہ ہم ہر ایک بات کو اپنی نظر اور اپنی عقل سے نہیں بلکہ سرکاری نظر اور سرکاری عقل سے دیکھیں۔

[۲] لال پیارے لڑکے کو کہتے ہیں اور لال سُرخ چونچ کا ایک مشہور پرندہ بھی ہوتا ہے۔ کاکا تُوا ایک قسم کا سفید رنگ کا بڑا طوطا ہوتا ہے۔ مطلب اشعار کا یہ ہے کہ جو لڑکے اسکولوں اور کالجوں سے پاس ہو کر نکل رہے ہیں اُن میں نہ کوئی مادّی قابلیتیں ہیں اور نہ مذہبی و روحانی۔ نہ وہ ہتھیاروں کا اِستعمال جانتے ہیں نہ حکمرانی کی قابلیت رکھتے ہیں۔ اطوار و خصائل اُن کے مسلمانوں کے اطوار و خصائل سے مختلف ہیں۔ نہ نماز روزہ کے پابند ہیں نہ تلاوت قرآن کے عادی۔ نہ اُن میں بڑوں کا ادب ہے نہ چھوٹوں پر شفقت و مہربانی۔ مگر یہ دیکھ کر کہ اُنھوں نے بہت سے امتحانات پاس کر لئے ہیں بھولی بھالی عورتیں اُن کو محبت اور فخر سے کاکا تُوا کہا کرتی ہیں۔

احیاء زبانِ سنسکرت

زبانِ سنسکرت اِس وقت پنڈت جی سے کہتی ہے (ہندوؤں کی قدیم مذہبی زبان)
کہ اچھا ہے مری الفت تمہارے دِل میں رہتی ہے

میں خوش ہوں گی بلاشک تم اگر مجھ کو جِلاؤ گے
مگر وِھسکی[1] (شراب) پلاؤ گے کہ گنگا جل (گنگا کا پانی) پلاؤ گے

جیوں[2] گی میں کہ پھر تم کو مِلاؤں دیوتاؤں سے
بھڑاؤ گے مجھی کو یا کہ دنیا کی بلاؤں سے

اگر شوقِ عبادت[3] ہے تو میں موجود ہوں اب بھی
اگر دنیا کا سودا ہے تو کب میں اس سے راضی تھی

غُل مچانے والوں کے اُستاد تو آپ ہی ہیں

پیدا[4] جو ہوئے یہ غُل مچانے والے
دل اُن کا نہیں ہیں ہم بڑھانے والے

لیکن بہ ادب کریں گے یہ عرض کہ ہیں
اِس فن کے حضور ہی سکھانے والے

---

[1] یعنی میرے زندہ ہونے کے بعد مجھے زندہ رکھنے کے لئے تم مجھے انگریزی شراب پلاؤ گے یا گنگا جل۔ یعنی مجھ سے مغربی تہذیب کے فروغ دینے کا کام لوگے یا ہندو مذہب اور ہندو تہذیب کے فروغ دینے کا۔

[2] یعنی کیا تم مجھے اپنے قدیم دیوتاؤں سے تعلق پیدا کرنے کا ذریعہ بناؤ گے یا اپنی دنیاوی مصیبتوں کا مجھ سے ہی مقابلہ کراؤ گے یعنی مجھ کو محض اپنے سیاسی اغراض و مقاصد کے لئے استعمال کرو گے۔

[3] یعنی اگر اپنی مذہبی محبت اور اپنے عبادت کے شوق سے تم مجھے زندہ کرنا چاہتے ہو تو شوق سے کرو لیکن اگر دنیا کی محبت میرے زندہ کرنے کی محرک ہوئی ہے تو میں اس سے نہ پہلے خوش تھی نہ اب خوش ہوں۔ میں ایسی زندگی سے باز آئی۔

[4] یعنی انگریزوں کے خلاف شورشیں کرنے والے جو نوجوان پیدا ہوئے ہیں ہم اُن کی شورشوں کو اچھا تو نہیں سمجھتے اور نہ اُن کی ہمت افزائی کرنا چاہتے ہیں لیکن انگریزوں سے بہ ادب ضرور عرض کریں گے کہ جنابِ والا شورش اور ایجی ٹیشن کا یہ فن تو ہمارے نوجوانوں کو آپ ہی نے سکھایا ہے ورنہ ہماری تہذیب تو یہ سکھاتی ہے کہ بزرگوں کا ادب اور حاکموں کی اطاعت کی جائے۔

علیگڈھ کالج

اور

سرسیّد

سِرُّ لِاَبِیْہٖ کی بجائے سِرُّ لِلماسٹر

کالج میں کسی نے کل یہ نغمہ گایا ۔۔۔ قومی خصلت کا سر سے اُٹھا سایا
کہتے تھے ولد کو لوگ سِرُّ لابیہٖ[1] ۔۔۔ سِرُّ للماسٹر کا اب وقت آیا

تحصیلِ عُلوم کا نتیجہ مفلسی وگمنامی

جو لوگ طرف دار علی گڈھ کے رہیں گے ۔۔۔ اس دور میں بیشک وہی بڑھ چڑھ کے رہیں گے
مفلس[2] رہیں گمنام رہیں خیر جو کچھ ہو ۔۔۔ کالج کے یہ سب علم تو ہم پڑھ کے رہیں گے

پھول کا پودا نہیں گلدان کا گلدستہ

ظاہر میں اگرچہ رازِ سربستہ ہے ۔۔۔ مضمون لطیف وخوب و برجستہ ہے
پودا[3] نہیں پھول کا علی گڈھ کالج ۔۔۔ گلدان میں مسلموں کا گلدستہ ہے

---

[1] عربی کا ایک مشہور مقولہ ہے "اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیْہٖ" یعنی بیٹا اپنے باپ کی خصلت پر ہوتا ہے۔ لیکن آج کل کے لڑکوں کا اُٹھان باپ کے رنگ پر نہیں بلکہ ماسٹروں کے رنگ پر ہوتا ہے۔ یعنی آج کل کے بچوں پر بجائے خاندانی اور خونی رنگ چڑھنے کے انگریزی اسکولوں کے ماسٹروں کا اور اُن کی تعلیم کا رنگ چڑھتا ہے۔

[2] یعنی نتیجہ خواہ کچھ بھی ہو۔ ہم مفلس وگمنام ہی کیوں نہ رہیں مگر کالج کے سب امتحانات ضرور پاس کریں گے۔

[3] یعنی علی گڈھ کالج کو پھول کا پودا یا درخت نہیں سمجھنا چاہیئے بلکہ وہ تو ایک گلدان ہے جس میں مسلمانوں کے پھولوں کا ایک گلدستہ بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ یعنی قوم کے اِس تعلیمی ادارہ کی خوش نمائیاں محض دیکھنے دکھانے کی ہیں۔ ان میں اصلی قومی زندگی نہیں ہے۔

خود فروشی کے بغیر ہی انمول ہو گئے

واہ اکبر بس مقیمِ کول ہو کر رہ گئے ¹ — خود فروشی کی نہیں انمول ہو کر رہ گئے
(کول: علیگڈھ کا پرانا نام — انمول: بیش قیمت)

عرض و طولِ ہند میں تم نے نہ دوڑائے خطوط — دل کشی مرکز میں پائی گول ہو کر رہ گئے
(عرض و طول: چوڑائی لمبائی، مراد وسیع خطۂ ہند — مرکز: یعنی علی گڈھ — گول ہو کر: خاموش ہو کر بیٹھ گئے)

چندہ کی مسلمانی

² اب کہاں تک بُت کدے میں صَرفِ ایماں کیجئے — تاکجا عشقِ بُتاں میں سُستیِ پیماں کیجئے
(صرفِ ایماں: یعنی ایمان کو خراب — سستیِ پیماں: قالو بلیٰ عہدِ ازل)

ہے یہی بہتر علی گڈھ جا کے سیّد سے کہوں — مجھ سے چندہ لیجئے مجھ کو مسلماں کیجئے
(سیّد: مراد سر سید احمد خاں)

ؕ۱ ان اشعار میں اُن لیڈرانِ قوم پر طعن ہے جنھوں نے اپنی لیڈری کے دائرہ عمل کو صرف علی گڈھ کالج کی تعمیر و ترقّی ہی تک محدُود کر رکھا تھا اور جو مرکزِ قومی سے وابستہ ہونے کی وجہ سے بغیر کسی ایثار و قربانی کے مسلمانانِ ہند کے بڑے اور مشہور لیڈروں میں شمار کیے جانے لگے تھے۔ حالانکہ اُنھوں نے کبھی ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت کا جائزہ لینے کے لیے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ وہ مُلک کے دُور دراز حِصّوں کا دورہ کریں بلکہ اگر کبھی کوئی ایسی ضرورت پیش بھی آئی تو گول ہو کر رہ گئے یعنی اُس کو ٹال گئے۔

ؕ۲ مطلب غالباً یہ ہے کہ میں نے خدا پر بھروسہ چھوڑ کر اور اُس سے بندگی کا جو عہدِ ازل میں کیا تھا اُسے بھول کر انگریزوں کی محبّت اور اُن کی جبہہ سائی تو بہت کرلی۔ اب مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ میں علی گڈھ جاؤں اور سرسیّد کو چندہ دے کر مُسلمان ہو جاؤں۔ یعنی دنیاوی مقاصد پورے کرنے کے لیے براہِ راست انگریزوں کی خوشامد و درآمد سے کام نہیں چلتا ضرورت اس کی ہے کہ میں سرسید کے متبع مسلمانوں میں ہو جاؤں اور یہ مقصد علی گڈھ کالج میں چندہ دینے سے بآسانی حاصل ہو سکتا ہے۔

پرانی روشنی بالائے طاق

فیضِ کالج سے جوانی رہ گئی بالائے طاق[1] (یعنی بھلا دی گئی) — امتحاں پیشِ نظر اور عاشقی بالائے طاق (یعنی عاشقی ختم ہو گئی)

وہ[2] چراغوں سے ہیں جلتے (نفرت کرتے) ایسے ہیں روشن ضمیر (یعنی زیرک و دانا جن کا دل روشن ہو) — کہتے ہیں رکھئے پرانی روشنی بالائے طاق

قوم کے عشق میں ایک ہی دھن

واہ اے سیّد پاکیزہ گہر (عالی نسب) کیا کہنا — یہ دماغ اور یہ حکیمانہ نظر کیا کہنا

قوم کے عشق میں یہ سوزِ جگر کیا کہنا — ایک ہی دھن (دھیان، شوق) میں ہوئی عمر بسر کیا کہنا

یورپ کی پیری کے آگے کچھ نہ چلی

پاؤں[3] کو بہت جھٹکا پٹکا زنجیر کے آگے کچھ نہ چلی (یعنی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی) — تدبیر بہت کی اے اکبر تقدیر کے آگے کچھ نہ چلی

یورپ نے دکھا کر رنگ اپنا سیّد (سر سیّد) کو مرید بنا ہی لیا — سب پیروں سے تو وہ بچ نکلے اس پیر کے آگے کچھ نہ چلی

---

[1] بالائے طاق رہنا بمعنی بھول جانا، بھلا دینا اور بالائے طاق رکھنا بمعنی ختم کر دینا۔ تعلق نہ رکھنا۔ مطلب یہ ہے کہ علی گڑھ کالج سے جو فیض قوم کو پہنچے ہیں اُن میں ایک یہ بھی ہے کہ نوجوانوں میں جوانی کے ولولے باقی نہیں رہے اور امتحان کی تیاری میں وہ ایسے مشغول ہوئے کہ عشق عاشقی بھی اُن کی ختم ہو گئی۔

[2] یعنی نوجوانوں کے دلوں اور دماغوں میں نئی روشنی کچھ ایسی بس گئی ہے کہ وہ پرانی روشنی سے نفرت کرنے اور اُس کو بالکل غیر ضروری سمجھنے لگے ہیں۔

[3] یعنی انگریزوں کی غلامی قسمت میں لکھی تھی اُس سے بچنے کے لئے بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ سر سید جیسے عالی دماغ بھی جو کسی پیر کے پھندے میں نہیں پھنسے تھے وہ بھی انگریزوں کے مرید ہو گئے اور اُن کی وفاداری کا دم بھرنے لگے۔

جاگو ضرور مگر اللہ کا نام لے کر

سیّد[۱] صاحب سکھا گئے ہیں جو شعور — کہتا نہیں تم سے ہیں کہ ہو اُس سے نفور
سوتوں کو جگا دیا اُنھوں نے لیکن — اللہ کا نام لے کے اُٹھنا ہے ضرور

(شعور: بیداری مغزی — نفور: بیزار، نفرت کرنے والے)

نہ پڑھنے کا کوئی اُصول نہ بڑھنے کی کوئی راہ

سُنتا[۲] نہیں کچھ کسی سے بڑھ بڑھ کے سوا — کہتا نہیں کوئی کچھ بھی پڑھ پڑھ کے سوا
پڑھنے کا نہ ٹھیک اصول بڑھنے کی نہ راہ — اور قبلہ کوئی نہیں علی گڈھ کے سوا

کانگریس اور سر سیّد

بات[۳] سیّد کی کچھ ایسی تھی کہ جس نے اُس کو — کاٹنا چاہا زمانے میں وہ بس آپ کٹا
کہتے پھرتے ہیں یہ اب کانگرسی ہر سُو — مرگیا کول کا بوڑھا یہ چلو پاپ کٹا

(کاٹنا: مٹانا۔ رد کرنا — آپ کٹا: یعنی شرمندہ و ذلیل ہوا — کانگرسی: کانگریسی خیال والے — کول: علی گڈھ کا پرانا نام — بوڑھا: یعنی سر سید — پاپ کٹا: قصہ پاک ہوا، نجات ملی)

۱؎ یعنی سر سید نے جو سوتی ہوئی قوم کو جگایا اور اُس کے اندر روشن خیالی اور بیدار مغزی پیدا کی ہے وہ بھی قوم کے لئے مفید ہو سکتی ہے بشرطیکہ جاگنے والے خدا کا نام لے کر جاگیں یعنی جاگنے اور ہوش میں آنے کے بعد خدا سے بے تعلق نہ ہو جائیں۔

۲؎ مطلب یہ ہے کہ ہر ایک قومی لیڈر یہی کہہ رہا ہے کہ بڑھو بڑھو (ترقی کرو) اور پڑھو پڑھو۔ لیکن نہ تو تعلیم کسی صحیح اصول پر دی جا رہی ہے اور نہ بڑھنے اور ترقی کرنے کے لئے کوئی راستہ ہے۔ سب نے خدا اور رسول کے قبلہ کو چھوڑ کر علی گڈھ ہی کو قبلہ بنا لیا ہے۔ یعنی کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ خدا اور رسول کے احکام اور اُن کی مرضی کیا ہے۔ جو ہدایات علیگڈھی لیڈروں کی طرف سے جاری ہوتی ہیں سب اُنہی پر عمل کرتے ہیں۔

۳؎ یعنی سر سید کی باتیں ایسی وزن دار اور مدلّل ہوتی تھیں کہ مخالفوں کو اُن کے مقابلہ میں مُنھ کی کھانی پڑتی تھی۔ اِس لئے سر سید کے انتقال پر اُن کے مخالف خوشیاں منا رہے ہیں کہ اس عالی دماغ بوڑھے کی مخالفت سے اُن کو نجات مل گئی۔

ارکان لیگ میں تخصیص علیگ

کمیٹی میں جتنے ہیں ارکانِ لیگ (مراد مسلم لیگ) — بفضلِ خدا سب ہیں میرے کلیگ (ساتھی)
مگر اُن سے ہے مجھ کو تخصیصِ خاص (تعلق خصوصی) — کہ ہے[1] نام کے ساتھ جن کے علیگ

علی گڈھ کالج، لندن کی مسجد

بزرگانِ مِلّت نے کی ہے توجّہ — کمی پر رہیں گے نہ عالِم نہ عابد (عبادت کرنے والے)
ترقیٔ دیں ہوگی اب روز افزوں — علی[2] گڈھ کا کالج ہے لندن کی مسجد

آپ نے اپنے باپ سے سیکھا ہے، مَیں نے آپ سے

کرچکا کالج میں جب تکمیلِ فن — تب یہ بولے مجھ سے مسٹر ماریسن[3]

---

[1] علی گڈھ کالج کے تعلیم یافتہ اپنی تعلیمی ڈگریوں کے ساتھ "Alig" بھی لکھا کرتے ہیں جو علی گڈھ کی انگریزی املا کا مخفف ہے۔

[2] یعنی مسلمانوں کو عالِم بنانے کے لئے علی گڈھ کالج تو تھا ہی اب اُن کو عابد بنانے کے لئے بزرگانِ مِلّت کی توجّہ سے لندن میں ایک مسجد بھی بن گئی ہے۔ جب قوم میں عالِم بھی ہوں گے اور عابِد بھی تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ دین میں روز افزوں ترقی نہ ہو۔ یہ سب طنز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ لندن کی مسجد بھی جن قومی اور سیاسی مصلحتوں کی بنا پر تعمیر ہوئی ہے اُن سے عابِد بھی ویسے ہی پیدا ہوں گے جیسے کہ علی گڈھ کالج سے عالِم پیدا ہو رہے ہیں۔ اور دین کی ترقیاں بھی اُسی رُخ پر ہونگی جس رخ پر دنیاوی ترقیاں ہو رہی ہیں۔

[3] Mr. Morrison. بھی علی گڈھ کالج کے ایک مشہور انگریز پرنسپل تھے۔

گو کہ شہرت ہے تمہاری دُور دُور — مجھ سا تم رکھتے نہیں عقل و شعور
عرض کی میں نے کہ اے روشن ضمیر — ہے یہی تو جس کو روتا ہے بشیر[۱]
آپ[۲] نے سیکھا ہے اپنے باپ سے — اور میں نے جو پڑھا وہ آپ سے

پھُولنے تو لگے تھے پھلے نہیں

سر سید کو فلک نے تننے[۳] نہ دیا — تہذیب کو پھر دوبارہ جننے نہ دیا
ملّت کی شکست میں مدد دی کامل — بننے لگی قوم جب تو بننے نہ دیا
گھر میں ہمیں چرخ نے[۴] ٹہلنے نہ دیا — باہر کی طرف چلے تو چلنے نہ دیا
کالج[۵] نے بٹھا دیا جو مانندِ شجر — کچھ پھُول چلے تھے اُس نے پھلنے نہ دیا

---

۱ یعنی خان بہادر مولوی بشیر الدین صاحب اخبار البشیر اٹاوہ کے مشہور ایڈیٹر اور علیگڈھی تحریکات نے ایک مخلص نکتہ چیں۔

۲ یعنی مسٹر مارتین کے علیگڈھی شاگردوں میں اُن کا سا فہم و شعور کیسے پیدا ہو سکتا تھا کیونکہ مسٹر مارتین کے اُستاد تو اُنہی کی قوم کے اور اُن کے دل سے ہمدرد تھے اور علیگڈھی شاگردوں کے اُستاد مسٹر مارتین ایک غیر قوم ہی کے نہیں بلکہ ایسی غیر قوم کے ہیں جو حکمراں بھی ہے اور جو ہندوستانیوں کی تعلیم میں بھی اپنی حکمرانی کی مصلحتوں کو ملحوظ رکھتی ہے۔

۳ تننا بمعنی سیدھا ہو کر بیٹھنا۔ اکبرؔ کا مطلب یہ ہے کہ زمانہ نے سر سید کو اتنا موقع نہیں دیا کہ وہ آزادی کے ساتھ قوم کی تہذیب و اصلاح کرتے جب تک سر سید کی رہنمائی میں قوم بگڑتی رہی زمانہ بھی سر سید کا ساتھ دیتا رہا مگر جب سر سید کو یہ احساس پیدا ہوا کہ قوم بگڑ رہی ہے اور انھوں نے اپنی رہنمائی کا رُخ بدلنے کی ضرورت محسوس کی تو موت نے اُن کو اس کی مہلت نہیں دی۔

۴ یعنی انگریزوں کی غلامی کی وجہ سے نہ تو ہم اپنے ملک میں ہاتھ پاؤں چلا سکے اور نہ ہم کو اس کی اجازت دی گئی کہ ہم دوسرے ملکوں میں جا کر کچھ حاصل کریں۔

۵ یعنی علی گڈھ کالج کی تعلیم سے ہماری قومی ترقی کا درخت اُگ تو آیا تھا اور کچھ پھُولنے بھی لگا تھا مگر انگریزوں نے اپنی مصلحتوں کی وجہ سے اُسے پھلنے نہ دیا۔ یعنی تھوڑا سا فائدہ تو قوم کو علی گڈھ سے حاصل ہوا مگر کوئی ایسا فائدہ حاصل نہ ہوا جس سے قوم پنپتی اور اُس میں قوّت پیدا ہوتی۔

حضرتِ سیّد دے گئے مذہب میں لوچ

دیکھ[1] کاریگری حضرتِ سیّد اے شیخ — دے گئے لوچ وہ مذہب میں گمانی کی طرح

بحرِ[2] ہستی کا یہی دور چلا جاتا ہے — برف کی طرح جمے بہہ گئے پانی کی طرح

خدمتِ سر سیّد میں حاضری

حاضر ہوا میں خدمتِ سیّد میں ایک رات — افسوس ہے کہ ہو نہ سکی کچھ زیادہ بات

بولے[3] کہ تجھ کو دین کی اصلاح فرض ہے — میں چل دیا یہ کہہ کے کہ آداب عرض ہے

حکّام کی عیسیٰ النفسی سے اعضاء کالج کی زندگی

اب قوم میں زندگی کے آثار نہیں — جو اہلِ نظر ہیں شرمندہ ہیں

حکّام کی ہے یہ صرف عیسیٰ نفسی[4] — اعضاء کالج کے کچھ اگر زندہ ہیں

---

[1] یعنی سرسید کی یہ ایک قومی کاریگری ہے کہ اُنھوں نے مذہب اسلام کو ایک ایسے رنگ میں پیش کیا کہ ہر شخص اُس سے اپنے مذاق اور اپنے مقصد کے مطابق کام لے سکے اور اُس کو آسانی سے گھٹایا یا بڑھایا جا سکے۔ گمانی لچکدار لوہے کے اُس پرزے کو کہتے ہیں جس کو اُبھارا اور دبایا یا پھیلایا اور سمٹایا جا سکے۔

[2] یہ شعر پہلے شعر سے مرتبط نہیں ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ دنیا میں کوئی قوم ایک حال پر قائم نہیں رہتی کبھی ترقی کر کے برف کی طرح جم جاتی ہے اور کبھی زوال میں آ کر پانی کی طرح بہہ جاتی اور فنا ہو جاتی ہے۔

[3] یعنی سرسید سے یہ سُنتے ہی کہ مجھ کو دین کی اصلاح کرنی چاہیئے میں آداب عرض کر کے اُن کے پاس سے چلا آیا کیونکہ میں نے یہ اندازہ کر لیا کہ سرسید مجھ کو کس قسم کی نصیحتیں کریں گے۔ اور میں دین کی اصلاح کو بے دینی سمجھتا ہوں۔

[4] یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی وہ معجزانہ طاقت جس سے وہ پھونک مار کر مُردوں کو زندہ کر دیتے تھے مطلب یہ ہے کہ قوم میں زندگی کے آثار تو باقی نہیں رہے۔ کالج کے کچھ نوجوان جو زندہ نظر آتے ہیں وہ محض اِس وجہ سے زندہ ہیں کہ انگریز اُن کو مارنا نہیں چاہتے۔

نبیوں میں کوئی پنشن یافتہ نہیں ہوا

لہ عقلِ سید بود از انوارِ حکمت بافتہ (بنی ہوئی) — زورِ بازویش عدو را پنجہا برتافتہ (موڑ رکھا ہے)
مشکلے در پیش ہست اورا اگر گویم نبی — زانبیا ہرگز کسے نگذشت پنشن یافتہ

بُت خانہ کو اپنا کرلیا

لہ دورِ گردوں نے (انقلاب زمانہ) اُبھارا دَیر (کلیسا) کو سچ ہے مگر (ترقی دی) — یہ نہ کہیئے حضرتِ سیّد نے پھر کیا کرلیا
اُن نگاہوں سے کہ جو تھیں خوگر (عادی) طوفِ (طواف) حرم (خانہ کعبہ) — آفریں (شاباش دیجئے) کہیئے کہ بُت خانہ (مراد کلیسا) کو اپنا کرلیا

لہ ترجمہ و توضیح:۔ سرسید کی عقل حکمت کی شعاعوں سے بُنی ہوئی تھی۔ یعنی سرسید نہایت روشن دماغ اور عقل کے پتلے تھے۔ ان کے زورِ بازو نے دشمن کے پنجوں کو موڑ رکھا تھا یعنی اُن کی عالی دماغی نے اُن کے دشمنوں کو زیر کر رکھا تھا (پنجہ لڑانا ایک ورزشی مقابلہ ہے جس میں ہار جیت حریف کا پنجہ موڑ دینے سے ہوتی ہے) اگر میں کہتا ہوں کہ سرسید نبی تھے تو یہ مشکل پیش آتی ہے کہ انبیاء میں سے اب تک کوئی پنشن Pension بمعنی وظیفہ بمعاوضہ خدماتِ سابقہ) پانے والا نہیں ہوا۔ مقصد یہ ہے کہ سرسید میں بہت سے قابلِ قدر کمالات اور غیر معمولی قابلیتیں تھیں۔ مگر اُن میں یہ ایک بڑی کمزوری بھی تھی کہ وہ انگریزوں کے پنشن خوار تھے اس لئے وہ دینی قابلیتوں اور عقلمندیوں کو آزادی کے ساتھ استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ غیر اللہ کا وظیفہ خوار ہونا چونکہ انسان کی آزاد خیالی و آزادی میں مُخل ہوا کرتا ہے اس لئے آج تک کوئی پنشن خوار انسان نبی نہیں ہوا۔

لہ یعنی یہ صحیح ہے کہ انقلاب زمانہ نے کلیسا کو (یعنی کلیسا کے ماننے والے عیسائیوں کو) عروج پر پہنچا دیا لیکن سرسید کی یہ قابلیت بھی قابلِ داد ہے کہ اُنھوں نے اپنی اُن نظروں سے جو طوافِ حرم کی عادی تھیں یعنی جن کو بچپن سے اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ وابستگی رہی تھی کلیسا یعنی انگریزوں کو اپنا مخالف نہیں بننے دیا بلکہ دوست بنا لیا۔

سر سیّد بڑے کام کرنے والے تھے

ہماری باتیں[1] ہی باتیں ہیں سیّد کام کرتا تھا
نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں

کہے جو چاہے کوئی میں تو یہ کہتا ہوں اے اکبرؔ
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

پڑھے لکھے مسلمانوں میں جنگ

علی گڈھ[2] میں حریفانہ (مخالفانہ) ترنگیں (اکڑفوں، لاف وگزاف)
پڑھے لکھے مسلمانوں میں جنگیں

ہمیں تو کر رہی ہیں سخت مایوس
تمہیں کو ہوں ترقی کی اُمنگیں (ولولے، شوق)

---

[1] یعنی ہم محض باتیں بناتے ہیں کام نہیں کرتے۔ سر سیّد کی خدماتِ قومی اور کارگزاریوں کا جو پُر خلوص اعتراف ان اشعار میں کیا گیا ہے اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت اکبرؔ سر سیّد کے قومی مقاصد اور سرگرمیوں سے سخت اختلاف رکھنے کے باوجود سر سیّد مرحوم کی عملی قابلیتوں اور اُن کی پُر خلوص کارگزاریوں کی بہت قدر کرتے تھے اور اپنی تقویٰ شعاری سے مخالفوں کے متعلق بھی عدل و انصاف کی رائے کا اظہار کرنے میں تامّل نہیں فرماتے تھے۔

[2] یہ قطعہ غالباً علی گڈھ کالج کے طالب علموں کے باہمی جھگڑے کی اطلاع ملنے پر لکھا گیا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ علی گڈھ کالج کے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں ایسے مخالفانہ جھگڑوں کا ہونا اُن تمام اُمیدوں کو خاک میں ملا دیتا ہے جو اس کالج سے قوم کی ترقی ہونے کے متعلق نئی روشنی کے مسلمانوں نے قائم کر رکھی ہیں۔

تقلید فرنگ

صرف نقّالی

ہر چند کہ کوٹ بھی ہے پتلون بھی ہے
بنگلہ بھی ہے پاٹ بھی ہے صابون بھی ہے
لیکن یہ میں تجھ سے پوچھتا ہوں ہندی
یورپ[1] کا تری رگوں میں خون بھی ہے

دن کو کچہری کی مسلیں رات کو تاریخ اسلام

جو کام[2] تھا گھنٹے کا نکلتا ہے وہ پل سے
خوش کیوں نہ رہیں لوگ فرنگی کے عمل سے
تاریخ تو خالد[3] کی پڑھو رات کو گھر پر
اور دن کو کچہری میں ڈبو نیل کھل سے

دل آگیا نٹ پر

اس درجہ جھک پڑے ہیں وہ بیف پر مٹن پر
ہے بار پیٹ[4] اُن کا پتلون کے بٹن پر
صورت پہ اور نسب پر ترجیح دی ہنر کو
کس بل[5] جو اُس کے دیکھے دل آگیا نٹن پر

[1] یعنی ہندوستانیو! تم یورپینوں کی وضع قطع اور طرز بود و ماند کی نقالی تو کر رہے ہو مگر کیا تمہاری خلقت و فطرت بھی یورپی خلقت و فطرت سے بدل سکتی ہے۔ اگر نہیں بدل سکتی اور ایک مشرقی مغربی نہیں ہو سکتا تو پھر اس ظاہری نقالی سے کیا فائدہ۔

[2] یعنی اہلِ مغرب کی ایجاد کردہ مشینوں سے گھنٹوں کا کام پلوں میں نکل آتا ہے اِس لئے فرنگیوں سے ہم لوگ کیوں نہ خوش رہیں۔

[3] یعنی حضرت خالد ابن ولیدؓ جو رسول اللہ ﷺ کے ایک صحابی اور اسلام کے ایک بڑے بہادر اور مشہور جرنیل اور فاتح تھے اور جن کو حضرت عمرؓ نے معزول کر دیا تھا۔

[4] یعنی حد سے زیادہ بیف اور مٹن کھانے سے اُن کی توند اِس قدر بڑھ گئی ہے کہ پتلون کا بٹن نہیں لگتا یا پتلون اُن کی موٹی توند پر بُری معلوم ہوتی ہے۔

[5] یعنی نئی روشنی کے نوجوان نہ صورت کو دیکھتے ہیں نہ حسب نسب کو ظاہری اور بازیگرانہ ہنروں کو دیکھ کر نٹنیوں تک پر عاشق ہو جاتے ہیں۔

نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے ہوئے

رسوا (ذلیل) وہ ہوا جو مستِ پیمانہ (جام شراب) ہوا — لپکا جو پیاٹے (چھلکنا / ایکدم دوڑنا / انگریز لڑکیوں کا لہنگا) پر وہ دیوانہ ہوا
انگلینڈ[۱] (انگلستان) سے اپنا دل جو لایا نہ درست — محروم اُدھر (یعنی انگلستان میں) اِدھر (یعنی اپنے وطن) سے بیگانہ ہوا

یورپی قال کا جال

سوچو[۲] کہ آگے چل کر قسمت میں کیا لکھا ہے — دیکھو گھروں میں کیا تھا اور آج کیا دھرا ہے
ہُشیار رہ کے پڑھنا اِس جال میں نہ پڑنا — یورپ نے یہ کہا ہے یورپ نے وہ کہا ہے

شوقِ ترقّی سببِ تباہی

نہ راجگی (راجہ بننا) کا مجھے شوق ہے نہ شاہی کا — اگرچہ میں بھی ہوں طالب (چاہنے والا، طلبگار) مگر خدا ہی کا
یہ وعظِ[۳] مغرب اور اِس کا اثر یہ مِلّت پر — بنا ہے شوقِ ترقّی سبب تباہی کا

---

[۱] مطلب یہ ہے کہ انگلستان میں رہنے یا تعلیم حاصل کرنے سے جن کے دلوں اور عادتوں میں ناپسندیدہ تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہیں وہ وہاں کے قیام کے مقاصد میں ناکام رہتے اور نامراد واپس آتے ہیں اور اپنے وطن سے بیگانہ ہو جاتے ہیں یعنی اپنی وطنی معاشرت اُن کو اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ اگر شراب پی کر بدمستیاں کرتے ہیں تو رسوا و ذلیل ہوتے ہیں اور اگر کسی یورپین لڑکی کے عشق میں مبتلا ہو کر بے سوچے سمجھے اُس سے شادی کر لیتے ہیں تو بیوی ایسا ناک میں دم کرتی ہے کہ دیوانے ہو جاتے ہیں۔

[۲] یعنی محض یورپ کے بڑے لوگوں کی تحریرات اور اقوال کو پڑھ کر اپنے مستقبل کے متعلق کوئی رائے قائم نہ کرو بلکہ ماضی اور حال کی حالت کا موازنہ کر کے دیکھو کہ پہلے تمھارے گھروں میں کیا تھا اور اب کیا ہے اور اُسی موازنہ سے اندازہ کرو کہ آئندہ تمھارا کیا حشر ہونے والا ہے۔

[۳] یعنی جو لوگ مغربی ترقیوں سے متاثر ہو کر مسلمانوں کو بھی ویسی ہی ترقیاں کرنے کے وعظ سُنا رہے ہیں۔ اُن کے وعظوں کا اثر قوم پر اُلٹا پڑ رہا ہے اور ترقی کرنے کے شوق میں قوم تباہی کی طرف چلی جا رہی ہے۔

جلوۂ خورشید سے بیگانہ ہوں

چہرۂ یورپ کا میں پروانہ ہوں — اُس کی ہراِک بات کا میں دیوانہ ہوں
شب[1] میں پیدائش ہوئی ہے پیشِ شمع — جلوۂ خورشید سے بیگانہ (ناآشنا) ہوں

آنکھوں میں عینک منہ میں مصنوعی دانت

عینک آنکھوں میں مُنھ میں مصنوعی دانت — نیچر نے سُکھا کے کر دیا جسم کو تانت[2]
اب تک ہے مگر وہی ہوس (خواہشات نفس) حضرت کی — ہے[3] طولِ امل (امید کی درازی۔ لالچ) ہنوز شیطان کی آنت (یعنی حد سے زیادہ لمبی)

کیک نے روٹی اور پتلون نے لنگوٹی بھی کھوئی

تھے کیک کی فکر میں سو روٹی بھی گئی — چاہی تھی شئے بڑی سو چھوٹی بھی گئی
واعظ[4] کی نصیحتیں نہ مانیں آخر — پتلون کی تاک میں لنگوٹی بھی گئی

---

[1] یعنی میں ایسے زمانہ میں پیدا ہوا ہوں جب کہ اسلام اور مسلمانوں کے عروج کا آفتاب غروب ہو چکا تھا اور نئی روشنی کی شمع جل رہی تھی اس لئے میں آفتاب کے جلوہ یعنی مسلمانوں کی ترقیات سے ناآشنا ہوں اور یورپ کی ہر ایک بات مجھے اچھی اور دلکش معلوم ہوتی ہے۔

[2] تانت جانوروں کی اُس انتڑی کو کہتے ہیں جسے بٹ کر یا سُکھا کر کمان یا سارنگی وغیرہ میں لگاتے ہیں۔ 'جسم کو تانت کر دیا' سے مُراد ہے جسم سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔

[3] یعنی ضعیف العمری کی وجہ سے آنکھوں پر عینک لگانی پڑ رہی ہے۔ دانت مصنوعی ہیں اور جسم سُوکھ کر کانٹا ہو گیا ہے لیکن اس کے باوجود حرص وہوس اب تک بدستور ہے اور ویسی ہی لمبی چوڑی امیدیں ابھی تک قائم کی جا رہی ہیں جو ختم ہونے میں نہیں آتیں۔

[4] یعنی پرانے خیال کے واعظوں کا کہنا نہیں سُنا۔ کیک کھانے اور پتلون پہننے کے شوق میں روٹیوں سے محتاج ہو گئے اور لنگوٹی بندھ گئی

ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم

اندھیر مچا ہے زیرِ فلک خلقت بھی ہے چُپ اور راج [حکومت] بھی چُپ
ہم دیکھ رہے ہیں آنکھوں سے پر کل بھی تھے چُپ اور آج بھی چُپ
صاحبزادے[۱] نشے میں ہیں اور بیف کنور جی کی سے ہے اَٹھن
ہیں مولوی صاحب قبلہ بھی چُپ اور پنڈت جی مہراج بھی چُپ

نئی روشنی کے پروانے

ہیں لیمپ عزیز شمع بیگانہ ہے | جلتا ہے چراغ[۲] سے جو فرزانہ ہے
سب کی ہے مسوں کے روئے روشن پہ نگاہ | جو ہے نئی روشنی کا پروانہ ہے

بے بصیرتی، بے ہمتی اور بے دینی

جب نورِ یقیں نہیں بصیرت[۳] کیسی | طاقت[۴] ہی نہیں دلوں میں ہمت کیسی
اسلام[۵] نئی روشنی میں کیا ہو یک رُخ | مسجد ہی نہیں تو پھر جماعت کیسی

۱۔ یعنی مسلمان امرا کے لڑکے شراب پی رہے ہیں اور ہندو راجاؤں کے لڑکے گائے کا گوشت کھا رہے ہیں۔ مگر نہ کوئی مولوی بول سکتا ہے نہ پنڈت۔

۲۔ یعنی جو آج کل بڑے عقلمند سمجھے جاتے ہیں وہ کڑوے تیل کے چراغ سے جلتے یعنی اُس کو بُرا سمجھتے اور اُس سے نفرت کرتے ہیں۔ چراغ سے جلنے میں صنعت ایہام ہے۔

۳۔ بصیرت باطنی آنکھ یا دل کی بینائی کو کہتے ہیں یعنی حقائق شناسی و عبرت اندوزی کو۔ مطلب یہ ہے کہ دل کی آنکھ کے لیئے نورِ یقین کا ہونا ضروری ہے یعنی حقیقت شناسی کے لئے اس کی ضرورت ہے کہ آدمی ایمان اور یقین کی روشنی میں دِل کی آنکھ سے کام لے ورنہ وہ تذبذب اور گمان کے اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتا رہے گا۔

۴۔ یعنی جتنا انسان کا دل قوی اور مضبوط ہوتا ہے اُتنا ہی وہ اولوالعزم و عالی حوصلہ ہوتا ہے۔ جن کے دِل کمزور ہیں اُن میں ہمت اور اولوالعزمی کیسے ہو سکتی ہے۔

۵۔ یعنی نئی روشنی کے مسلمانوں کا جب کوئی مرکز و مقصد ہی نہیں ہے تو اُن میں یکجہتی و ہم خیالی کیسے پیدا ہو سکتی ہے۔ بغیر ایک قبلہ کے جماعت سے نماز پڑھنا کب ممکن

نئی روشنی خوش نما تو ہے مگر بے اُصول

چالیس سال سے ہے نئی روشنی کا دَور — کیونکر اسے کہوں کہ سراسر فضول ہے
البتہ ایک عرض کروں گا دَبی[۱] زباں — گو خوش نما بہت ہے مگر بے اُصول[۲] ہے

گورے کو نہ بنانا سالا

ایسا[۳] شوق نہ کرنا اکبر — گورے کو نہ بنانا سالا
بھائی رنگ یہی ہے اچھا — ہم بھی کالے یار بھی کالا

ہوٹل میں عیش، ہسپتال میں ہائے ہائے

کل مستِ عیش وناز تھے ہوٹل کے ہال میں — اب ہائے ہائے کر رہے ہیں اسپتال میں
دنیا اُسے قرار دو اور آخرت یہ ہے — سُن لو[۴] کہ سازِ معنیِ اکبر کی گت یہ ہے

۱؎ دَبی زبانِ سے کچھ کہنا محاورہ ہے بمعنی صاف صاف نہ کہنا۔ لحاظ سے بات کرنا۔ شعر میں دَبی زباں سے نہیں بلکہ صرف دَبی زباں موزوں ہوا ہے۔

۲؎ یعنی نئی روشنی کا دَور (زمانہ) بظاہر بہت اچھا معلوم ہوتا ہے مگر اس دَور کے لوگوں کے سامنے کوئی ایک مقصد اور اُن کے کاموں کا کوئی ضابطہ اور اصول نہیں ہے۔

۳؎ مطلب یہ ہے کہ کالے مَردوں (یعنی ہندوستانی مَردوں) کا نباہ کالی عورتوں (یعنی ہندوستانی عورتوں) سے ہو سکتا ہے اس لئے گوری عورتوں (یعنی یورپین عورتوں) سے ہندوستانیوں کو شادی نہیں کرنی چاہیے۔ ورنہ یہ یورپین بیویاں ہی نہیں بلکہ اُن کے بھائی بند بھی زندگی تلخ کر دیں گے۔

۴؎ مطلب یہ ہے کہ اکبر اپنے اشعار میں جس بات پر بار بار زور دے رہے ہیں وہ یہ ہے کہ بدعملوں کی دنیا اور آخرت کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی ایک دن تو ہوٹل میں خوب عیش وعشرت کرے اور گلچھرّے اُڑائے اور دوسرے دن بیمار ہو کر ہسپتال میں داخل ہو اور تکلیف سے ہائے ہائے کرے۔ یعنی دنیا دار العمل ہے اور آخرت دار الجزا۔

نماز روزہ خلاف فیشن

پشّے[۱] نے کہا سُبک نشینی میری (اس طرح سے بیٹھنا کہ بیٹھنے والے کا بوجھ محسوس نہ ہو) (مچھر)
ہے قابل داد (تعریف) اگر کریں آپ انصاف
میں نے یہ کہا بجا ہے لیکن یہ نیش (ڈنک)
ہے بارِ گراں و تلخ تقصیر (قصور) معاف
فرمائیں مرا قصور حضرت جو معاف
جو امر ہے واقعی گذارش کروں صاف
انکار[۲] نہیں نماز روزے سے مجھے
لیکن یہ طریق (دستور زمانہ) اب ہے فیشن کے خلاف

لیلیٰ اسکول مسٹرس اور قیس ریڈر

اللہ رے[۳] انقلابِ طرز و مذاقِ مشرق
حافظ (یعنی حافظ شیرازی) کے شعر کیسے سب پڑھ رہے ہیں ریڈر (انگریزی زبان کی تعلیمی کتاب)
لیلیٰ (قیس عامری کی مشہور معشوقہ) کا ناز رخصت، اسکول مسٹرس (استانی) ہیں
سودائے (جنون) قیس (قیس عامری، مجنون) غائب، اب وہ بنے ہیں ریڈر (عدالتی پیشکار)

---

۱ پشّہ یعنی مچھر سے مراد انگریز ہیں جو دوسرے ملکوں میں اپنی حکومت کے پیر اس طرح جماتے ہیں کہ کسی کو محسوس بھی نہیں ہوتا مگر جب محکوموں کا خون پینے کے لئے ڈنک مارتے یعنی محکوموں کو محتاج بنا کر خود مالدار ہونے کی چالیں چلتے ہیں تو بڑی ناگواری اور تکلیف محسوس ہوتی ہے۔

۲ یعنی نماز روزہ کے فوائد سے تو نئی روشنی والے بھی انکار نہیں کرتے اُن کو اعتراض صرف یہ ہے کہ نماز روزہ کے پابند لوگ دقیانوسی خیال کے سمجھے جاتے ہیں کیونکہ نماز، روزہ کا طریقہ اب فیشن کے خلاف ہو گیا ہے۔

۳ یعنی اہلِ مشرق کے مذاق و تمدن میں یہ کیسا عجیب انقلاب ہو رہا ہے کہ حافظ شیرازی کے اشعار کی بجائے اب انگریزی کی ریڈریں پڑھی جارہی ہیں اور مشرقی عورتیں لیلیٰ کے ناز و انداز دکھانے کی بجائے اسکولوں میں اُستانیاں ہو گئی ہیں اور مشرقی مردوں میں کوئی قیس عامری کا سا مجنون نظر نہیں آتا بلکہ اُنھوں نے عدالتی پیشکاری کی ملازمتیں کر رکھی ہیں۔

آزادی و تقلیدِ بے جا کی یورش

[۱] نہ مسجد میں نظر آتے نہ رہتے ہیں محلوں میں ترقی پا کے بس مِل جاتے ہیں بر گیڈ کے گلوں میں
یہی یورش رہی آزادی و تقلیدِ بے جا کی تو غائب قوم کی تسکین ہے دو چار ہلوں میں

حکومتی کیمپ کا چکر

[۲] پایا جب کیمپ کے چکر میں اُنھیں سب کا شریک رشک جاتا رہا اس پر کہ بڑے عالم ہیں
صبر و آزادی و طاعت کے مزے لو اکبر اُن کی راہوں پہ اُنھیں چھوڑ دو جو حاکم ہیں

مشین میں اُلجھے ہوئے گھسٹ رہے ہیں

[۳] ہماری حالت کو کچھ نہ پوچھو........ فعولُ فعلن فعولُ فعلن فعولُ فعلن فعولُ فعلن
[۴] پچھاڑے کھاتے ہیں لوٹتے ہیں پکڑتے ہیں شیخ جی کا دامن مگر مشینیں جو چل رہی ہیں اُنھیں میں اُلجھے گھسٹ رہے ہیں

۱؎ یعنی آج کل کے ترقی یافتہ نہ مسجدوں میں نظر آتے ہیں اور نہ اپنے محلّوں میں رہنا پسند کرتے ہیں بلکہ وہ بسلسلۂ ملازمت یا کاروبار انگریزوں کے فوجی کیمپوں میں رہائش اختیار کر لیتے اور فوجی افسروں کے اشاروں پر چلتے ہیں۔ اگر مسلمان بے جا تقلید اور آزادی کے اسی طرح شکار ہوتے رہے تو چند ہی روز میں اُن کی ساری قومی عزّت و وقعت خاک میں مِل جائے گی۔

۲؎ یعنی جو علماء حکام رسی یا انگریزوں کی ملازمت کے چکر میں پڑ جاتے ہیں اُن میں علم و فضیلت کا کوئی اِیا امتیاز باقی نہیں رہتا جس پر رشک کیا جائے اس لئے ہم کو صبر و شکر سے کام لینا اور آزادی سے عبادت کرنے کا لُطف اُٹھانا چاہئے۔ حاکموں کی ریس تمہیں کرنی چاہئے۔

۳؎ قوم کی اصل حالت کو بیان کرنے کی بجائے صرف شعر کی بحر کا وزن لکھ دیا ہے تاکہ ہم خود حسبِ حال موزوں الفاظ تلاش کر لیں اس بحر کا نام بحر متقارب مقبوض اثلم ہے۔

۴؎ مطلب یہ ہے کہ قوم کی اصل حالت تو ناگفتنی ہے۔ ظاہری حالت یہ ہے کہ اُس شخص کی طرح جو کسی مشین کی مال میں پھنس جائے۔ لوٹتے ہیں۔ پچھاڑے کھاتے ہیں اور گھسٹے چلے جاتے ہیں اور سہارے کے لئے شیخ کا دامن تھامتے ہیں یعنی تکلیف و مصیبت سے نجات حاصل کرنے کے لئے بزرگانِ دین سے دُعائیں کراتے ہیں۔

نہ نورِ دل ہے نہ شمعِ مزار ہے

مایوس کر رہا ہے نئی روشنی کا رنگ ؎۱ — اِس کا نہ کچھ ادب ہے نہ کچھ اعتبار ہے
تقدیس ماسٹر کی نہ لیڈر کا فاتحہ — یعنی نہ نورِ دل ہے نہ شمعِ مزار ہے
(ادب و احترام)

مسلموں کے حرم میں انگلش لیڈیاں

حرم میں مسلموں کے رات انگلش لیڈیاں آئیں — پئے تکریم مہماں بن سنور کر بیبیاں آئیں
(زنانہ خانہ)
طریقِ مغربی سے ٹیبل آیا کرسیاں آئیں ؎۲ — دلوں میں ولولے اٹھے ہوس میں گرمیاں آئیں

رگوں میں وہ خون ہی نہ رہا

بوئے گل میں فسوں ہی وہ نہ رہا ؎۳ — موسم بدلا جنوں ہی وہ نہ رہا
(مستی پیدا کرنے والا اثر)
سینے میں وہ دل کہاں سے آئے اکبر — جب اپنی رگوں میں خوں ہی وہ نہ رہا

؎۱ یعنی نئی روشنی کے دور میں نہ تو اُستادوں کا ادب واحترام کیا جاتا ہے اور نہ لیڈروں کو ایصال ثواب۔ نہ تو زندوں کے دلوں میں نور ہوتا ہے نہ مُردوں کی قبر پر کوئی چراغ جلاتا ہے۔

؎۲ یعنی مسلمانوں کے گھروں میں انگریز لیڈیوں کی انگریزی طرز پر مہمانداریاں ہونے سے مسلمان بیبیوں کے دلوں میں بھی انگریزی تقلید کے ولولے پیدا ہونے لگے ہیں۔

؎۳ یعنی جس طرح بہار کا موسم ختم ہو جانے پر جب عاشقوں کے دلوں میں جنونی ولولے نہیں اُٹھتے تو پھولوں کی مست خوشبوئیں بھی اُن کو مست و بے خود نہیں کرتیں۔ اسی طرح جب انسانی رگوں میں خون کا جوانی کا سا جوش نہیں رہتا تو دل بھی افسردہ ہو جاتا اور اُس میں اُمنگیں باقی نہیں رہتیں۔ مقصد یہ ہے کہ نئی روشنی اور قومی تنزل کے اثر سے اب دل میں ولولے بھی پیدا نہیں ہوتے جو قومی عروج واقبال کے زمانہ میں پیدا ہوا کرتے تھے۔

فلک کو کد ہے کہ بگڑو اور بگاڑو

الاپو[١] مغربی بُھیر (دُھن) میں کوئی راگ (گیت) — اُٹھو مسجد سے اور دامن کو جھاڑو
جنونِ لیڈری کا دور ہے یہ — فلک کو کد (ضد) ہے بگڑو اور بگاڑو

مغربی چکّر

مجھ گدا کو کردیا رخصت جو دے کر عطر پان[٢] — فاقہ تو ٹوٹا نہیں، ہاں عزّت افزائی ہوئی
مرکزِ[٣] دل بزمِ مشرق میں کوئی ملتا نہیں — ہر طبیعت مغربی چکّر میں ہے آئی ہوئی
مذہب و وضع و زبانِ قوم کا کس کو خیال — جب اکابر (بڑے لوگ) کی نظر آنر (انگریز) کی شیدائی ہوئی

نظمِ اکبر کو سمجھ لو یادگارِ انقلاب
یہ اُسے معلوم ہے ٹلتی نہیں آئی ہوئی[٤]

---

١ مطلب یہ ہے کہ آج کل نئی روشنی کی لیڈری کا جنون سروں پر سوار ہے اور یہ لیڈر جو مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ مسجد کی خاک چھاننا چھوڑ دو اور مغربی روش اختیار کرو، خود بھی تباہی کی طرف جا رہے ہیں اور قوم کو بھی تباہ کر رہے ہیں۔

٢ مشرقی تہذیب میں معزز مہمانوں کی عطر اور پان سے تواضع کی جاتی تھی۔ یہی طریقہ بعض انگریز افسروں نے بھی معزز ہندوستانیوں کی مدارات کا اختیار کر لیا تھا تاکہ ہندوستانی اسے اپنی عزّت افزائی سمجھیں خواہ ملاقات سے اُن کی مقصد برآری ہو یا نہ ہو۔

٣ یعنی مشرقی ماحول میں اب ایسا کوئی مرکز نہیں ملتا جس سے دل کو وابستہ کیا جائے۔ سب کی طبیعتیں مغربی چکّر میں پھنس گئی ہیں۔

٤ یعنی جس ثقافتی اور تمدّنی انقلاب کے دور میں سے ہم گذر رہے ہیں وہ تو آکر رہے گا اور کسی کے ٹالے نہیں ٹلے گا۔ ہاں اکبر کی نظمیں اس انقلاب کی یادگار رہیں گی۔

لاالٰہ موجود ۔ اِلّا اللہ غائب

بے سبب زیں لائبریرہا مرا اکراہ نیست[۱]   ہر کتابے راکہ بکشادیم بسم اللہ نیست
(بیزاری کی کراہیت)
کورس را ہر سال تغیرست و باہم اختلاف[۲]   اتحادِ معنوی را سوئے دلہا راہ نیست
(نصاب تعلیم)
از مذاقِ مشرقی ہر طبع را بے گانگی![۳]   چیزے از مغرب بدلہا ہست و خاطر خواہ نیست
صف نشیناں چشم یاری می کُنند از ہم دریغ[۴]   کو دلے کاں را دریں محفل جنونِ جاہ نیست

۱؎ لائبریرہا جمع مہنّد ہے انگریزی لفظ لائبریری (Library) بمعنی کتب خانہ کی۔ ترجمہ:۔ ان (یعنی انگریزی) کتبخانوں سے مجھ کو بلاوجہ نفرت نہیں ہے (بلکہ نفرت کی وجہ یہ ہے) کہ جس کتاب کو بھی میں کھولتا ہوں اُس میں بسم اللہ نہیں ملتی۔ یعنی کوئی کتاب بسم اللہ یا خدا کے نام سے شروع نہیں کی جاتی۔

۲؎ ترجمہ:۔ ہر سال نصابِ تعلیم کی کتابیں بدل جاتی ہیں اور وہ (مضمون میں) ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں (اس سے معلوم ہوتا ہے) کہ معنوی اتحاد کا دلوں تک گذر نہیں ہوا ہے (یعنی ابھی تک تعلیم و تربیت کا کوئی ایسا مقصد متعین نہیں ہوا ہے جس پر سب متفق ہوں) حضرت اکبر نے ہر سال نصابِ تعلیم جدید کی کتابوں میں تبدیلیاں ہونے کی یہ بڑی بالغ نظرانہ توجیہہ کی ہے۔ پہلے زمانہ میں مقصد تعلیم اسلامی معیار پر قوم کی تعمیر و تربیت تھی اور اس مقصد پر ساری قوم متحد و متفق تھی۔ اس لئے تعلیمی کتابوں میں بھی تبدیلی کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی اور قوم کی سب نسلیں تعلیم گاہوں سے ایک ہی سانچہ میں ڈھل کر نکلتی تھیں۔ برخلاف موجودہ زمانہ کے کہ سب کے خیالات و مقاصد مختلف ہیں اور سب اپنی اپنی ڈفلی پر اپنا اپنا راگ الاپ رہے ہیں۔

۳؎ ترجمہ:۔ مشرقی مذاق (عادات و اطوار) سے ہر ایک شخص کی طبیعت بے گانہ ہو گئی ہے (یعنی کسی کو اُس سے اُنس و تعلق باقی نہیں رہا) کچھ مغربی مذاق دلوں میں (پیدا ہوا ہے) مگر حسب دل خواہ نہیں (یعنی جتنا پیدا کرنا چاہتے ہیں اتنا نہیں)۔

۴؎ ترجمہ:۔ ایک ہی صف میں بیٹھنے والے (یعنی ہم عقیدہ و ہم عصر) دوستی کی آنکھ ایک دوسرے سے چُراتے ہیں (یعنی آپس میں محبت و ہمدردی نہیں رکھتے) اس محفل میں کون ایسا دل ہے جسے جاہ و اقتدار کا جنون نہ ہو (یعنی سب جاہ و اقتدار حاصل کرنے کے لئے آپس میں رشک و رقابت رکھتے ہیں)۔

گشتہ ام مایوس ازیں اندازِ آغازِ شما[1] — لاالٰہیت نمایاں ہست و الا اللہ نیست
صورتِ مذہب کہ می سازند تحسیں می کنم[2] — معنیِ دیں را کہ می سوزند خلق آگاہ نیست

ہانڈی سرد مذہب پہ آنچ

کرلی ہے خوب میں نے نئی روشنی کی جانچ — مجھ سے بہت نہ کیجئے اب آپ تین پانچ (جھگڑا۔ بحث مباحثہ)
ان[3] لیڈروں کی شعلہ زبانی (گرم گرم تقریریں) سے کیا ہوا — ہانڈی تو سرد رہ گئی مذہب پہ آئی آنچ

---

[1] تمھارے انداز آغاز یعنی (تمھاری ابتدا اس طریقہ پر ہونے سے میں بہت مایوس ہوں۔ (تمھاری طبیعتوں میں لاالٰہیت (یعنی کسی کو معبود نہ بنانے کا رجحان) تو نمایاں ہے لیکن الا اللہ (یعنی اقرار خدائے واحد) نہیں ہے۔ یعنی تمھاری آزاد خیالی تمھیں اس کی تو اجازت نہیں دیتی کہ تم کسی غیر اللہ کو لائق پرستش سمجھو لیکن اس کے ساتھ ہی تمھارے سر خدائے واحد کی عبادت و پرستش کے لئے بھی نہیں جھکتے اور اندیشہ ہے کہ اپنی آزاد خیالی کی رَو میں کہیں تم خدائے واحد کی ہستی سے بھی منکر نہ ہوجاؤ۔ اس شعر میں ایک بلیغ حکیمانہ اشارہ یہ بھی ہے کہ اگر لاالٰہ کے تصوّر کے ساتھ ہی الا اللہ کا تصوّر بھی ذہن میں نہ آئے تو اندیشہ رہتا ہے کہ لاالٰہ کہنے والے کہیں اللہ ہی سے منکر نہ ہوجائیں۔

[2] ترجمہ:۔ مذہب کی جو صورت (ظاہری آرایشوں سے مزیّن کرکے وہ بناتے ہیں اُس پر تو ہم سب اُن کی تعریف کرتے ہیں لیکن دین کے معنی (یعنی مذہب کی روح اور مغز) کو وہ جلاتے ہیں اس سے دنیا بے خبر ہے۔ یعنی آج کل کے قومی لیڈران بظاہر تو مذہب کے بڑے حامی بنتے ہیں اور مذہب کو بڑی بڑی اچھی اچھی شکلوں میں ہمارے سامنے پیش کرکے خراج تحسین وصول کرتے ہیں۔ لیکن جن دل کش اور خوش نما شکلوں میں وہ مذہب کو پیش کرتے ہیں انھی کی وجہ سے قوم میں مذہب کی روح فنا ہوتی جارہی ہے اور نمائشی مذہب پرستی میں ترقی ہورہی ہے۔

[3] مطلب یہ ہے کہ اس کا خوب تجربہ ہوچکا ہے کہ نئی روشنی کے لیڈرانِ قوم مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے جو گرما گرم اور پُرجوش تقریریں کرتے ہیں اُس سے مسلمان قوم کو تو کوئی فائدہ نہیں پہنچا اور مذہب کی روح روز بروز جلتی یعنی فنا ہوتی چلی جارہی ہے۔

بُتانِ کلیسا کی مریدی

میں نے کہا یہ اپنے[۱] خیالی خضر (رہبر) سے آج
بتلاؤ اس روش (طرزِ اصلاح) سے ترقی کی کیا امید

ہر[۲] گام (قدم) پر جو طاعتِ حق سے الگ پڑا
ہوتے رہو گے مرکزِ قومی سے تم بعید

ہاں[۳] انتشار و جہل کی تکمیل ہوگی جب
ہو جاؤ گے بُتانِ کلیسا کے تم مرید

شاید[۴] کہ مدعا (مقصد) بھی تمھارا ہے بس یہی
ہر چند ابھی ہے درس کے پردے میں ناپدید (پوشیدہ)

میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بیبیاں نکلیں

ترقی[۵] کی نئی راہیں جو زیرِ آسماں نکلیں
میاں مسجد سے نکلے اور حرم (زنانخانہ) سے بیبیاں نکلیں

مصیبت[۶] میں بھی اب یادِ خدا آتی نہیں اُن کو
دعا مُنھ سے نہ نکلی پاکٹوں (پاکٹ کی جمع بمعنی جیب) سے عرضیاں نکلیں

---

۱ یعنی اپنے خیال میں ایک قومی رہنما کا تصور کر کے اُس سے کہا۔

۲ یعنی اگر تمہاری اصلاحی کوششوں سے قوم کا ہر قدم طاعتِ حق سے الگ پڑتا رہا تو قوم مرکزِ اسلام سے روز بروز دور ہوتی چلی جائے گی۔

۳ یعنی جس قدر قوم مرکز سے دُور ہوگی اُسی قدر اُس میں انتشار و افتراق اور مذہب سے ناواقفیت پیدا ہوگی اور نتیجہ یہ ہوگا کہ اسلام سے برگشتہ ہو کر لوگ عیسائیوں کے مرید اور عیسائیت کی طرف مائل ہو جائیں گے۔

۴ یعنی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا مقصد بھی یہی ہے کہ مسلمان عیسائیوں کے گرویدہ ہو جائیں اگرچہ ابھی انگریزی تعلیم کے پردہ میں یہ مقصد چھپا ہوا ہے۔

۵ یعنی دنیاوی ترقی کی نئی نئی راہیں نکلتے ہوئے دیکھ کر مردوں نے مسجد کو چھوڑ دیا اور پردہ نشین عورتیں گھروں سے بے پردہ باہر نکلنے لگیں۔

۶ یعنی پہلے لوگ کم از کم تکلیف اور مصیبت میں خدا کو یاد کر لیا کرتے تھے۔ لیکن اب نئی تہذیب کا اثر یہ ہوا ہے کہ مصیبت میں بھی مُنھ سے دُعا نہیں نکلتی۔ حاکموں کے آگے اپنا دُکھڑا رونے اور اُن کی امداد طلب کرنے کے لئے جیبوں سے عرضیاں ضرور نکل آتی ہیں۔ یعنی درخواستیں فوراً پیش کر دی جاتی ہیں۔

انگریز

اور

انگریزی حکومت

الحاد کی طرف میلان

چرچے ہیں نہ مذہب کے نہ وہ قصۂ[1] دل ہے ۔۔۔ پرچے ہیں اب اخبار کے اور آرٹیکل (مضمون) ہے
اِس عہد میں مائل سوئے الحاد (بے دینی) جو دل ہے ۔۔۔ اس کی تو گورنمنٹ ہی ریسپانسبل (ذمہ دار) ہے

قِسمت نہ لڑنے کا باعث انگریز کی خوش انتظامی

اب تک جو کہیں ہماری قِسمت نہ لڑی[2] ۔۔۔ ناحق تجھے ہم نشیں ہے فکر اِس کی پڑی
انگریز کے مُلک میں لڑائی کیسی ۔۔۔ یہ ہند ہے یہاں خوش انتظامی ہے بڑی

انا الحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ

گورنمنٹ کی خیر یارو مناؤ (خیر منانا۔ سلامتی چاہنا) ۔۔۔ گلے[3] میں جو اُتریں وہ تانیں اُڑاؤ (گانا۔ الاپنا۔ تان اڑانا۔)
کہاں ایسی آزادیاں تھیں میسّر (نصیب) ۔۔۔ انا الحق[4] کہو اور پھانسی نہ پاؤ

---

[1] یعنی دلوں کی وہ حالتیں نہیں ہیں جو پہلے تھیں۔ پہلے دل مائل بہ مذہب و روحانیت تھے اور اب مائل بہ الحاد و بے دینی۔

[2] قسمت لڑنا محاورہ ہے بمعنی قسمت کا یاور و موافق ہونا۔ یہاں قسمت نہ لڑنے (یعنی قسمت کی یاوری نہ کرنے) کی توجیہ لڑنے کے لفظی معنوں کی رعایت سے یہ کی گئی ہے کہ انگریزوں نے اپنی خوش انتظامی کی وجہ سے ملک میں سب لڑائی جھگڑے ختم کر دئے ہیں اِس لئے اُن کے عہدِ حکومت میں ہندوستانیوں کی قسمت کیسے لڑ سکتی ہے۔

[3] یعنی جو گانا بھی تم سے گایا جا سکتا ہو گاؤ۔ یعنی جو تمھارا دل چاہے کہو۔

[4] "انا الحق" بمعنی میں خدا ہوں حضرت منصور حلاج کو جذبۂ بے خودی میں انا الحق کہنے کی وجہ سے پھانسی دے دی گئی تھی۔ مگر وہ زمانہ قیودِ شریعت کا تھا۔ انگریزوں کی حکومت میں ایسے روحانی جذبات و خیالات کے اظہار پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ ہر شخص آزاد ہے خواہ وہ "انا العبد" کہے یا "انا الحق"۔

ہندی کی نجات مشکل ہے

بنگالی ہاتھ میں قلم لے تو کیا　　مسلم جو مثالِ جامِ جم لے تو کیا
ہندی کی نجات ہے نہایت مشکل　　سو[1] مرتبہ مر کے وہ جنم لے تو کیا

انگریزی حکومت میں ترقی کی معراج

کوئی[2] کہتا نہیں سیاح ہوں فطرت کا ماہر ہوں　　یہیں تک فخر کی حد ہے میں ڈپٹی ہوں میں ناظر ہوں
میں[3] اپنے نوکروں کو ڈھونڈتا پھرتا ہوں بنگلے میں　　"کوئی ہے" لاکھ کہئے۔ کون کہتا ہے کہ "حاضر ہوں"

---

[1] مطلب یہ ہے کہ بنگالی ہندوؤں میں خواہ کتنا ہی زورِ قلم پیدا ہو جائے اور مسلمانوں کے پاس خواہ دوسرا جامِ جم (جمشید بادشاہ فارس کا وہ پیالہ جس میں علمِ نجوم کے ذریعہ سے دنیا کے حالات معلوم ہو جاتے تھے) ہی کیوں نہ آ جائے مگر انگریزوں کی غلامی سے چھٹکارا پانا ہندوستانیوں کے لئے بہت مشکل ہے خواہ ہندوؤں کے عقیدۂ تناسخ یا آواگون کے مطابق وہ سو مرتبہ مر کر بھی دوبارہ جنم کیوں نہ لیں۔

[2] یعنی نئی تعلیم سے نہ تو کوئی سیاح پیدا ہوتا ہے جو دنیا کے حالات کو خود گھوم پھر کر معلوم کرے۔ نہ کوئی ایسا ماہر سائنس داں پیدا ہوتا ہے جو رازہائے فطرت سے واقف ہو۔ نئے تعلیم یافتوں کے لئے باعثِ فخر بس یہ رہ گیا ہے کہ وہ ڈپٹی کلکٹر ہو گئے ہیں یا عدالت کے ناظر۔

[3] مطلب یہ ہے کہ آج کل خدمتگاروں کے دماغ ایسے چل گئے ہیں کہ جب ان کے آقا قدیم دستور کے مطابق "کوئی ہے" کہہ کر آواز دیتے ہیں تو جواب میں کوئی "حاضر ہوں جناب" نہیں کہتا۔ یعنی حاضر ہوں کہنے کو نوکر بھی کسرِ شان سمجھنے لگے ہیں۔ یا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ آج کل حکم پر چلنے والے خدمتگار نہیں ملتے۔

ابتری معاشرت کا ذمہ دار کون ہے

ہرگز نہیں ہم کو سلطنت کا افسوس ہے[۱] ابتریٔ معاشرت کا افسوس
انگریزوں پہ ہے بہت کم الزام اِس کا ہے اپنے ہی میلِ معصیت کا افسوس

انگریز مہربان نہ ہوں تو نہ سر سیّد کچھ کر سکتے ہیں نہ حالی

ایک[۲] سیّد کیا کریں یا بیٹھ کر دس کیا کریں حضرتِ حالی کے اشعارِ مسدّس کیا کریں
سچ تو یہ ہے مہربانی آپ کی درکار ہے ہم غریب و ناتوان و زار و بے کس کیا کریں

پہلے آنکھوں سے آنسو نکلتے تھے اب خون نکل رہا ہے

کونسل سے ہر طرح کا قانون آرہا ہے مطبع سے ہر طرح کا مضمون آرہا ہے
لیکن[۳] بڑھوں میں کیونکر آنکھوں کی ہے یہ حالت اشک آرہے تھے پہلے اب خون آرہا ہے

---

[۱] یعنی ہم کو اپنی حکومت چلی جانے کا اتنا افسوس نہیں ہے جتنا کہ اس بات کا افسوس ہے کہ ہماری معاشرت (رہن سہن کے طریقے) بالکل خراب اور بدتر ہوگئی ہے اور ہماری معاشرت میں اس افسوس ناک تبدیلی ہونے کے ذمہ دار انگریز اتنے نہیں ہیں جتنے کہ ہم خود ہیں۔ اگر ہمارا میلانِ طبع معصیت اور گناہ کی طرف نہ ہوتا تو ہم یہ معصیت آلود معاشرت ہرگز اختیار نہ کرتے۔

[۲] مطلب یہ ہے قوم کی اصلاح کے لئے خواہ ایک سر سید احمد کوشش کریں یا اُن جیسے دس سیدا حمد اور۔ نہ ان کی کوششیں کارگر ہو سکتی ہیں۔ نہ مولانا حالی کی مشہور مسدّس کے موثر اشعار۔ ہماری حالت اِس قدر زبون اور خراب و خستہ ہوگئی ہے کہ جب تک انگریز ہی ہم پر مہربان ہو کر ہماری اصلاح کی طرف توجہ نہ کریں ہم پنپ نہیں سکتے۔

[۳] مطلب یہ ہے کہ قانون بھی ہر قسم کے کونسلوں میں پاس ہو رہے ہیں اور مضمون بھی اچھے اچھے چھپ کر شائع ہو رہے ہیں۔ لیکن قوم کی حالت روز بروز بد سے بدتر ہوتی جارہی ہے۔ جسے دیکھ کر بجائے آنسوؤں کے اب میری آنکھوں سے خون نکلتا ہے اس لئے نہ مضمونوں سے کوئی فائدہ ہوتا ہے نہ قانون سے۔

اپنے ہم نشیں بھی رقیبوں کے مصاحب ہو گئے

رہ گئے ناآشنا احباب غائب ہو گئے
ہم نفس دو اک جو باقی تھے وہ صاحب[۱] ہو گئے
(انجان۔ بے مروت — رفیق۔ ساتھی)

وقتِ بد میں کون رکھتا ہے رفاقت کا خیال
ہم نشیں اپنے رقیبوں کے مصاحب ہو گئے
(دوستی۔ ہمدردی — ہم صحبت — مراد انگریز — رفیق۔ دیم نفس)

گنی کے بجائے پنی، دین گیا تو دنیا بھی چھنی

پہلے تو دکھاتی تھی چمک اپنی گنی[۲]
اب پیشِ نگاہ ہیں فقط پنس[۳] و پنی

کہتے ہیں حریف ہنس کے اب ازرہِ طعن
جب دین کو کھو دیا تو دنیا بھی چھنی

اب گریجوئیٹوں کی قدر ہے یا میٹوں کی

کچہریوں میں ہے پرسش گریجوئیٹوں کی
سڑک پہ مانگ ہے قلیوں کی اور میٹوں کی
(بی اے پاس — مراد ضرورت۔ مانگ — قلیوں کا جمعدار)

نہیں ہے قدر تو بس علمِ دین و تقوی کی
خرابی ہے تو فقط شیخ جی کے بیٹوں کی
(پرہیزگاری — یعنی عالمان دین کی اولاد)

۱؎ صاحب ہو گئے۔ یعنی انگریزوں کی وضع قطع اختیار کر لی اور بڑے آدمی ہو گئے۔ صاحب ہو کر انگریزوں کے مصاحب ہو جانے میں پُرلطف تجنیس ہے۔

۲؎ گنی Guinea سونے کا ایک انگریزی سکہ جو ۲۱ شلنگ یعنی تقریباً پندرہ روپے کا ہوتا ہے۔

۳؎ پنس Pence پنی Penny کی جمع ہے۔ پنی ایک انگریزی سکہ ہے جو تقریباً ایک آنہ کے برابر ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انگریزوں کی ابتدائی حکومت میں تو گنیاں بہت دیکھنے میں آتی تھیں۔ اب زیادہ تر اکنیاں دکھائی دے رہی ہیں یعنی ملکی دولت کم ہوتی چلی جا رہی ہے۔ دین کے چھوٹنے کا یہ نتیجہ ہے کہ دنیا بھی چھنتی جا رہی ہے۔

منصفی کا دروازہ بھی بند

مذہب اور مولویوں پہ گالی ہولی (یعنی گالیاں دی جا چکیں) — اسپیچ پہ انجمن میں تالی ہولی (تقریر — یعنی تالیاں بج چکیں)
دروازۂ منصفی ہے ہم پر کیوں بند[1] — ہر بات تو اے جنابِ عالی ہولی

انگریزوں پر مشرقی ہوا کا اثر

انگریزوں میں عادتِ سحر خیزی تھی (بہت صبح بیدار ہونے کی عادت) — اندازِ روش میں اِک دلآویزی تھی (دل پسندی)
مشرق کی ہوا سے وضع اب ہے بدلی[2] (روش، طریقہ) — پہلے اچھی تھی خالص انگریزی تھی

راہِ رزق میں کانٹے

میں رعیّت ہوں وہ شاہانہ دلیری ہے کہاں — مجھ کو کیوں رشک آئے وضعِ ملّت انگریز پر (انگریز قوم کے طور طریقوں پر)
کانٹے بچھ جاتے ہیں ان لوگوں کی راہ رزق میں — خوف آتا ہے چُھری چلتی ہے اُن کی میز پر

---

[1] یعنی جب ہم نے وہ سب باتیں اختیار کرلیں جو آپ چاہتے تھے۔ مذہب اور مولویوں کو گالیاں بھی دے دیں اور انجمنوں اور لکچروں میں آپ کے حسب منشاء تالیاں بھی بجادیں تو اب ہمیں منصفی کی نوکری کیوں نہیں ملتی۔

[2] یعنی جب تک انگریزوں کو مشرق کی ہوا نہیں لگی تھی اُن میں کئی عادتیں مثلاً علی الصباح بیدار ہونے کی بہت اچھی اور پسندیدہ تھیں مشرق کے اثر سے انگریزوں کی اِن اچھی عادتوں میں بھی تبدیلی پیدا ہوگئی۔ وہ خالص انگریزیت اچھی تھی جس پر مشرق کا اثر نہیں پڑا تھا۔

اپنی زبان سکھانے کا مقصد

ا ؎ نوکر کو سکھاتے ہیں میاں اپنی زباں — مطلب یہ ہے کہ سمجھے اُن کے فرماں
مقصود نہیں میاں کی سی عقل و تمیز — اس نکتے کو کیا سمجھیں جو ہیں ناداں

برٹش اقبال کو اپنا اقبال نہ سمجھو

۲ ؎ روز افزوں ہے بلاشبہ برٹش اقبال — جو خلاف اس کے تصوّر کرے وہ وہمی ہے
اپنا اقبال مگر اُس نے جو سمجھا ہے اِسے — یہ نئی روشنی کی سخت غلط فہمی ہے

انگریز کا رعب داب

۳ ؎ اسبابِ طرب یہاں وہاں سے لائیں — ہر طرح کا فرنیچر دُکاں سے لائیں
قائم نہ رہے ادب تو کیا اِس کا علاج — انگریز کا رُعب ہم کہاں سے لائیں

---

۱ ؎ مطلب یہ ہے کہ ہندوستانیوں کو انگریزی تعلیم انگریز صرف اِس مقصد کو مدِّ نظر رکھ کر دلوا رہے ہیں کہ ہندوستانی محکوم اُن کے احکام کو سمجھ سکیں اور اُن کے دفتری کام چلا سکیں مگر یہ ایسے بے عقل ہیں کہ انگریزوں کی اِس مصلحت کو نہیں سمجھتے۔

۲ ؎ مطلب یہ ہے کہ برطانوی اقبال و عروج کی روزافزوں ترقی سے تو صرف وہی انکار کر سکتا ہے جو حقیقت آشنا نہیں ہے بلکہ وہم پرست ہے مگر جو لوگ برطانوی اقبال کی ترقی سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہ ترقی نئی روشنی کی ترقی ہے یعنی جو نئی روشنی پر چلے گا وہ بھی ویسی ہی ترقیاں حاصل کرے گا جیسی کہ انگریز حاصل کر رہے ہیں یہ اُن لوگوں کی بڑی غلط فہمی ہے۔

۳ ؎ مطلب یہ ہے کہ طرزِ رہائش اور وضع قطع میں انگریزوں کی پوری تقلید کرنے اور اسی ٹھاٹھ سے رہنے سہنے کے باوجود اگر ماتحت ہمارا ادب و لحاظ نہیں کرتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انگریزوں کا سا رعب داب ہم میں نہیں ہے۔

ہندی مسلمان

اور

ہندو مسلمان

کھانے کو پپیتا، دل بڑھانے کو گیتا

پیٹ کے واسطے پپیتا (خربوزہ) ہے — دِل بڑھانے کو درسِ گیتا[۱] ہے

ہند ہی میں دیا خدا نے مقام — بندہ اب دَیر (بُت خانہ) ہی میں جیتا ہے

تدبیر ناکام، تقدیر بدنام

تدبیر کریں تو اس میں ناکامی ہو — تقدیر کا نام لیں تو اس میں بدنامی ہو

القصّہ عجیب ضیق (مصیبت، اُلجھن) میں ہیں ہندی — یورپ[۲] کا خدا کہاں ہے جو حامی ہو

قومی، مذہبی یا رُوحانی

میں کب کہتا ہوں وہ مسلمان نہیں — سب ہیں چکے ہوئے ہیں لاثانی ہیں

میں تو اتنا ہی کر رہا تھا دریافت — قومی[۳] ہیں کہ مذہبی کہ رُوحانی ہیں

۱؎ ہندوؤں کی مشہور کتاب بھگوت گیتا جس میں ہندوؤں کے پیشوا سری کرشن جی کی دل بڑھانے والی نصیحتیں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ خدا نے ہندی مسلمانوں کا مسکن ہندوستان بنا دیا ہے جو مشرکوں کی اکثریت کی وجہ سے بُت خانہ تو ہے مگر یہاں کھانے کے لئے پپیتا ہے جس سے پیٹ ٹھیک رہتا ہے اور پڑھنے کے لئے گیتا ہے جس سے دل بڑھتا اور عزم و حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔

۲؎ مطلب یہ ہے کہ ہندوستانی اپنی ترقّی کی تدبیریں کرتے ہیں تو اُن میں ناکامی ہوتی ہے اور تقدیر پر بھروسہ کر کے بیٹھتے ہیں تو نکمّے اور ناکارہ کہلاتے ہیں۔ اِس لئے وہ عجیب مصیبت میں ہیں کہ کیا کریں۔ یورپ کا خدا ہی اُن کو اس مصیبت سے نکال سکتا ہے کیونکہ اُس کے بندے کم از کم اپنی تدبیروں میں تو کامیاب ہو رہے ہیں۔ یورپ کے خدا سے مراد وہ عقائد و اخلاق ہیں جن کی اہلِ یورپ پیروی کر رہے ہیں۔

۳؎ مطلب یہ ہے کہ مسلمان بھی آج کل تین قسم کے ہو گئے ہیں یعنی قومی[۱]۔ مذہبی[۲] اور روحانی[۳]۔ اُن میں سب سے نمایاں قومی مسلمان ہیں جو قوم پرستی کے مُدّعی اور نئی روشنی کے پیرو ہیں۔ یہ قومی مسلمان زیادہ نمایاں ہونے کے باوجود اسلام کی راہِ مستقیم سے بہت بھٹک گئے ہیں اور درحقیقت صرف برائے نام مسلمان ہیں۔

ہندی مسلم میں ہند کی نیو

ہندی مسلم میں ہند کی نیو (بنیاد) بھی ہے — افطار (روزہ کھولنا) میں ہے کھجور تو سیو (بیسن سے بنی ہوئی ایک ہندوانی غذا) بھی ہے
اللہ اللہ ہے زباں پر بے شک — لیکن اک رنگِ بم مہادیو[۱] بھی ہے

نسخۂ گاؤزبان کی مضرت

وہ لطف اب ہندو و مسلماں میں کہاں — اغیار اُن پہ گذرتے ہیں خندہ زناں (ہنستے اور مذاق اڑاتے ہوئے)[۲]
جھگڑا کبھی گائے کا، زبان کی کبھی بحث — ہے سخت مضر یہ نسخۂ (پرچہ جس میں طبیب مریض کے لئے دوائیں لکھتا ہے) گاؤزباں[۳]

۱؎ بم مہادیو (ہندی) بمعنی مہادیو جی کی جے یا بول بالا۔ "مہادیو" ہندو بڑے دیوتا یا شیو جی کو کہتے ہیں۔ بم مہادیو کا مفہوم ہندوؤں کی مذہبی زبان میں اللہ اکبر کا سا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے خمیر یا طینت میں چونکہ مذہب بھی شامل ہے اس لئے اُن کے خصائل و عقائد میں عربیت کے ساتھ ہندوئیت کی خوبو بھی ہے۔ چنانچہ اُن کے روزہ کھولنے کے سامان میں جہاں عرب کی کھجوریں ہوتی ہیں وہاں ہند کے چٹ پٹے سیو بھی۔ وہ زبان سے اللہ اللہ ضرور کرتے ہیں لیکن اُن کی طبائع شرک کی طرف بھی کچھ نہ کچھ مائل رہتی ہیں۔

۲؎ مطلب یہ ہے کہ گائے کُشی اور اُردو ہندی کے جھگڑوں کی وجہ سے ہندو مسلمانوں کے تعلقات اِس قدر خراب ہو گئے ہیں کہ اُن کے آپس میں روز فساد اور جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ جن پر دوسری قومیں ہنستی اور اُن کا مذاق اُڑاتی ہیں۔

۳؎ گاؤزبان ایک مشہور دوائی بوٹی ہے جس کی پتیاں گائے کی زبان کی شکل کی ہوتی ہیں۔ گائے اور زبان کے جھگڑوں کی رعایت سے نسخۂ گاؤزبان کے ہندیوں کے لئے مضر ثابت ہونے میں کیسی ادبی لطافت ہے۔

آپس میں ملتے بھی ہیں اور لڑتے بھی ہیں

چٹکیاں[1] اک دوسرے کی وقت پر جڑتے بھی ہیں — ناگہاں غصہ جو آجاتا ہے لڑ پڑتے بھی ہیں
ہندو و مسلم ہیں پھر بھی ایک اور کہتے ہیں سچ — ہیں[2] نظر آپس کی ہم ملتے بھی ہیں لڑتے بھی ہیں

لڑو مگر ایک رہو

کہتا ہوں میں ہندو و مسلماں سے یہی — اپنی اپنی روش پہ تم نیک رہو
لاٹھی[3] ہے ہوائے دہر پانی بن جاؤ — موجوں کی طرح لڑو مگر ایک رہو

ہندو زر کے لئے عزّت چاہتا ہے اور مسلمان عزّت کے لئے زر

دونوں کو اگرچہ ہے طلب آبرو کی (عزت و آبرو) — رُخ[4] اُن کے جُدا ہیں اس کی علّت (غرض و غایت) کے لئے
بنیاد وہ اپنی چاہتا ہے مضبوط — بے چین ہے یہ نمودِ (نمائش) حالت کے لئے
ہندو عزّت طلب (یعنی طالبِ عزت) ہے زر کی خاطر — مسلم کو طلب ہے زر کی عزّت کے لئے

---

[1] چٹکیاں جڑنا اور چٹکیاں کھانا ایک ہی معنوں میں آتا ہے یعنی ایک دوسرے کی بُرائیاں یا غمّازی کرنا۔

[2] نظر ملنا اور نظر لڑنا یہ دونوں محاورے بھی تقریباً ہم معنی ہیں یعنی آنکھیں دوچار ہونا۔ دو شخصوں کی آنکھوں کا بالمقابل ہونا۔ مطلب یہ ہے کہ ہندو مسلمانوں کا آپس میں لڑنا اور ملنا ایسا ہی ہے جیسا کہ اُردو محاورہ میں آپس کی نظروں کا مِلنا اور لڑنا۔ یعنی ہندو مسلمانوں کی آپس کی لڑائی دراصل لڑائی نہیں ہے۔ وہ دونوں ایک ہی ہیں۔ غصہ میں گتھم گتھا ہو جاتے ہیں۔

[3] مطلب یہ ہے کہ زمانہ تمھارے خلاف ہو رہا ہے۔ اُس کی لاٹھی کی مُہلک زد سے بچنے کے لئے تم کو اپنے اپنے طریقوں کے مطابق نیک بن کر پانی کی طرح ہو جانا چاہیئے جس پر لاٹھی کی ضرب سے موجیں تو پیدا ہوتی اور آپس میں لڑتی بھی ہیں لیکن پانی ایک ہی رہتا ہے۔

[4] یعنی ہندو اور مسلمان اگرچہ دونوں عزّت وجاہ کے طالب ہیں لیکن غرض و غایت دونوں کی مختلف ہے۔ ہندو اپنی بنیادیں مضبوط کرنے کے لئے عزّت وجاہ حاصل کرنا چاہتا ہے اور مسلمان محض نمود و نمائش کے لئے۔ ہندو روپیہ کمانے کے لئے عزت حاصل کرتا ہے اور مسلمان عزّت حاصل کرنے کیلئے روپیہ کماتا ہے۔

ہم خیالی نہ ہونے سے آپس میں دشمنی کیوں ہو

ہ سے ہندو مؔ سے مسلم یہ دونوں مل کر ھم[1]
سر پہ انگریزی آ[2] اِس سے ہوئی حالت آھم

ہے آ ہم سے جدا لیکن محافظ اور معین
اس کے سائے میں رہے ہ م شامل ہوں بہم

دوست کیوں کر ہوں نہ ہوں جب ہم خیال و ہم مذاق
لیکن اس کا یہ اثر کیوں ہو کہ ہوں دشمن بہم

اپنا اپنا وقت ہے موقع ہے اور میلانِ طبع (طبیعت کا رجحان)
آپ اپنے شغل میں رہیئے اور اپنی دُھن (شغل) میں ہم

شیخ جی کی پالیسی جو صاحبؔ کی مرضی "

لڑیں کیوں ہندوؤں سے ہم یہیں کے اَن[2] سے پنپے ہیں
ہماری بھی دُعا یہ ہے کہ گنگا جی کی بڑھتی ہو

مگر ہاں شیخ جی کی پالسی سے ہم نہیں واقف
اِسی پر ختم کرتے ہیں کہ جو صاحب کی مرضی ہو

لہ مطلب اشعار کا یہ ہے کہ اگر ہندو اور مسلمان ایک قوم کی تعریف میں آنا اور اپنے لئے ہم کے استعمال کو جائز ثابت کرنا چاہتے ہیں تو دونوں کو اس طرح مِل کر رہنا چاہیئے جیسے کہ لفظ ھم میں ہؔ اور مؔ مِلے ہوئے ہیں اور یہ سمجھنا چاہیئے کہ ھم کی ہ سے ہندو اور م سے مسلمان مراد ہیں۔ لیکن انگریزوں کا آ بھی ہمارے سر پر موجود ہے اور اس کی موجودگی سے حالت آھم (آ + ھم) یعنی ذرا پیچیدہ ہو گئی ہے۔ آ اگرچہ ھم سے جدا ہے یعنی ہؔ اور مؔ کی طرح آپس میں مِلا ہوا نہیں ہے لیکن ھم کے شروع میں ہونے کی وجہ سے وہ ھم کا یعنی ہمارا محافظ اور مددگار ہے اور بیرونی حملہ آوروں کے حملوں سے ہماری حفاظت کر رہا ہے۔ ہم کو چاہیئے کہ اُس کے سایہ میں رہنے والے ھم کی ہؔ کو مؔ سے علیٰحدہ نہ ہونے دیں یعنی باہمی نا اتفاقیوں سے بچیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں ہم خیال اور ہم مذاق نہیں ہیں اس لئے دونوں میں یک دِلی اور دوستی کا ہونا تو مشکل ہے لیکن دوستی نہ ہونے کے یہ معنی نہیں کہ ہم آپس میں دشمن ہو جائیں۔ اپنے اپنے حالات و مقتضیات اور رجحاناتِ طبع کا لحاظ رکھ کر ہر ایک کو اپنے اپنے شغل میں مصروف رہنا چاہیئے اور آپس کی لڑائی جھگڑوں سے قومیت کی بُنیادوں کو کمزور نہیں کرنا چاہیئے۔

لہ اَنّ ہندی بمعنی ناج، رزق۔ پنپے ہیں یعنی پلے اور بڑھے ہیں۔ گنگا جی یعنی دریائے گنگ جسے ہندو مقدس سمجھتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو ہندوؤں سے لڑنا تو نہیں چاہیئے کیونکہ ہندوؤں کی طرح ہم بھی ہند میں پیدا ہوئے اور ہند ہی کے ناج سے جس کی پیداوار میں دریائے گنگا کے پانی کو بھی بڑا دخل ہے، پلے اور بڑھے ہیں اور ہندوؤں کی طرح ہم کو بھی دریائے گنگا کی خیر منانی چاہیئے لیکن ہمارے رہنمایانِ قوم کی پالیسی کچھ اور ہے۔ وہ اُس روش پر چل رہے ہیں جس پر انگریز اُن کو چلانا چاہتے ہیں اور وہ ملکی مفاد کے مقابلہ میں "صاحب کی مرضی" کو مقدم سمجھتے ہیں۔

مسلم کی رکاکت آمیز پالسی اور ہندو کی خوفناک ترنگ

رزق تا بحُثتاج جب دے دے تجھے اللہ پاک — کر عبادت میں بسر اور سر کو رکھ بالائے خاک

پالسی مسلم کی دیکھی اور ہندو کی ترنگ — اُس[۱] میں ہے اکثر رکاکت یہ ہے اکثر خوفناک

(ضرورت کے مطابق — اوپر — شیخی۔ تعلّی — بے غیرتی۔ کمزوری)

مشرقی تعصّب، مغربی پالسی

ہر طرف برپا ہے طوفانِ عناد و اختلاف — برہمن اور شیخ سوشل ساز و ساماں کیا کریں

پالسی[۲] مغرب پہ مشرق پر تعصّب ہے سوار — اس کو ہندو کیا کریں اس کو مسلماں کیا کریں

(دشمنی — تمدنی — مذہبی تنگ نظری۔ ہٹ دھرمی)

بچنا انگریز سے زیادہ چاہیئے یا ہندو سے

[۳] زیادہ ان سے رہو محترز، کہ ہندو سے — یہ خود ہی سوچ لو دِل میں، اگر نہ کچھ کد ہو

یہ چاہتے ہیں کہ فتنہ یہاں کا ہو موقوف — وہ فکر میں ہیں مسلمانی ہی ندارد ہو

(الگ تھلگ۔ محتاط — بدامنی — بند — ضد۔ مخالفت)

---

۱ یعنی مسلمانوں کی قومی پالسی (روش) میں اکثر انگریزوں کی بے جا خوشامد کو دخل ہوتا ہے اور ہندوؤں کی قومی پالسی میں شیخی اور تعلّی کو۔ مسلمانوں کی پالسی میں رکاکت اور بے غیرتی ہوتی ہے اور ہندوؤں کی پالسی سے فتنے فساد پیدا ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔

۲ یعنی مغربی حکمرانوں نے اپنے مشرقی محکوموں کو ایسی مذہبی آزادی دے رکھی ہے جس کی وجہ سے ان میں مذہبی تنگ نظری اور دوسرے مذاہب سے بُغض پیدا ہو گیا ہے، اِس کا علاج نہ ہندوؤں کے پاس ہے نہ مسلمانوں کے پاس۔ اور اسی وجہ سے ملک میں فرقہ وارانہ جھگڑوں اور دشمنیوں کا ایسا طوفان برپا ہے کہ نہ ہندو اپنی تمدّنی اصلاح کر سکتے ہیں نہ مسلمان اپنی۔

۳ مطلب یہ ہے کہ انگریزوں کو نہ تو ہندوؤں سے دشمنی ہے نہ مسلمانوں سے وہ تو صرف اپنا اقتدار یعنی حکومت قائم رکھنے کے لئے یہ چاہتے ہیں کہ ملک میں بدامنی نہ پھیلے اور اُن کی مخالفت نہ ہو۔ لیکن ہندو اس فکر میں ہیں کہ ملک میں مسلمانی ہی کو ختم کر دیں۔ اب ہندوستانی مسلمانوں کو خود ہی ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیئے کہ اُن کو ہندوؤں سے زیادہ محتاط رہنا چاہیئے یا انگریزوں سے۔

گائے کا گوبر اور اونٹ کی مینگنی

سینگ[1] ہے پھر بھی وہ جھکائے ہے سر ۔۔۔ آپ بے سینگ سر اُٹھاتے ہیں
حامی گاؤ ہیں اِسی سے بہت ۔۔۔ اُس کو کم لوگ مُنھ لگاتے ہیں
اُس کے گوبر سے لیپتے ہیں مکاں ۔۔۔ اونٹ کی مینگنی جلاتے ہیں

---

[1] گائے اور اونٹ کے استعارہ میں ہندو مسلمانوں کی حالت کو بیان کیا گیا ہے۔ یعنی جس طرح گائے سینگ ہونے کے باوجود سر جھکائے رہتی ہے اور اسی وجہ سے ہندو اُس کی حفاظت اور اُس سے محبّت کرتے ہیں اور اُس کے گوبر سے اپنے گھروں کو لیپتے ہیں اور اونٹ سینگ نہ ہونے کے باوجود سر کو اونچا اُٹھالیتا ہے۔ اسی وجہ سے کوئی اُس کو منھ نہیں لگاتا اور پیار و محبت کر کے سر نہیں چڑھاتا اور اونٹ کی مینگنی سے آگ جلانے یعنی ایندھن کا کام لیا جاتا ہے اسی طرح ہندو دولت و عزّت و علم رکھنے کے باوجود چونکہ عجز و انکسار سے کام لیتے ہیں اس لئے اُن کے دوست اور حامی بہت ہیں اور مسلمان چونکہ تموّل و عزّت نہ رکھنے کے باوجود مشیخت و تمکنت سے کام لیتے ہیں اِس لئے اُن کے دوست بہت کم ہوتے ہیں اور کوئی اُن کو مُنھ نہیں لگاتا اور سر چڑھانا پسند نہیں کرتا۔

اُردو اور ہندی

اُردو کی حمایت اخبار "البشیر" میں

سرحد پہ باغیوں کو سکھ ماریں گے ۔۔۔ گردن اُردو کی رام (مراد ہندواؤں سے ہے) رکھ ماریں گے
قائم رہے البشیر[1] کا یہ پرچہ ۔۔۔ ہم بھی مضمون کوئی لکھ ماریں گے

اُردو سے ہندی لڑ گئی

عِلم پر بھی عشق کی تاثیر آخر پڑ گئی ۔۔۔ تخلیئے (تنہائی، خلوت) کی بات پبلک کے دِلوں میں گڑ گئی
وصل کی شب میں نے اُس بُت سے[2] لڑائی تھی زباں ۔۔۔ یہ اثر اُس کا ہوا اُردو سے ہندی لڑ گئی (بھڑ گئی، ٹکرا گئی)

[1] "البشیر" اٹاوہ کا بہت پُرانا اور مشہور ہفتہ وار اخبار ہے جس کے ایڈیٹر خان بہادر مولوی بشیر الدین صاحب نے یوپی کے لفٹننٹ گورنر میکڈانل صاحب کے اُردو ہندی جھگڑے کی بنیاد ڈالنے پر اُردو کی حمایت اور مخالفینِ اُردو کی مخالفت میں بڑے پُرزور مضامین لکھے اور لکھوائے تھے۔ مقصد اشعار کا یہ ہے کہ سکھ اپنی جنگ جُوئی سے مسلمانوں کو مار سکتے ہیں اور ہندو اپنی سازشی حکمت عملی سے اُردو کو فنا کر سکتے ہیں۔ مسلمانوں کے پاس سوائے اِس کے اور کیا طاقت ہے کہ البشیر میں اُردو کی حمایت کا کوئی مضمون لکھ ماریں یا لکھ ڈالیں گے۔ اس قطعہ میں ردیف "ماریں گے" کے مختلف محاوراتی استعمالوں سے معنوی حُسن پیدا کیا گیا ہے۔ لکھ مارنا سے محاورہ میں زیادہ تر ایسے تردیدی مضامین کا لکھنا مراد لیا جاتا ہے جن کا کوئی عملی نتیجہ مترتب نہ ہو۔

[2] زبان لڑانا محاورہ ہے جو جواب دینے اور زبان درازی کرنے کے معنوں میں بھی آتا ہے اور عاشق و معشوق کے حالتِ ہیجان جذبات میں زبان سے زبان ملانے یا مس کرنے کے معنوں میں بھی۔ یہاں دوسرے ہی معنی مراد ہیں۔ مطلب اشعار کا یہ ہے کہ ہندو مسلم دوستی کے زمانہ میں ہندو مسلمان دونوں نے ایک ایسی زبان اختیار کر لی تھی جس کے بولنے اور سمجھنے میں دونوں کے لئے آسانی تھی اور جو دونوں کی تقریباً مشترکہ زبان ہو گئی تھی۔ لیکن جب اس اشتراک زبان کے نتائج پر عام ہندوؤں نے غور کیا اور اُن کو یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں، یہ آپس کی دوستی ہندوؤں کو مسلمانوں میں مدغم نہ کر دے تو اُنھوں نے اُردو ہندی کا جھگڑا کھڑا کر دیا اور کہنے لگے کہ ہندوؤں کی زبان تو ہندی ہے اور اُردو زبان مسلمانوں کی ہے۔ اس لئے ہندوؤں کو اُردو کے گرانے اور ہندی کے بڑھانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ بے میل لوگوں میں جب باہمی محبت کی بنیاد عارضی جذبات پر رکھی جاتی ہے تو جذبات کے فرو ہونے پر ایسی محبت کا اثر معکوس باہمی دشمنی و مخالفت کی شکل میں ظاہر ہوا کرتا ہے۔

اُردو میں عربی اور ہندی میں سنسکرت

اُردو میں جو سب شریک ہونے کے نہیں
اِس مُلک کے کام ٹھیک ہونے کے نہیں
ممکن نہیں شیخ امرء القیس[۱] بنیں
پنڈت جی والمیک[۲] ہونے کے نہیں

ہمدم اور لیڈر کی بحث

کہاں اُردو و ہندی میں زرِ نقد
وہی اچھا ہے جو گِنتا منی ہے
مرے نزدیک تو بے سود یہ بحث
میانِ[۳] ہمدم و چِنتا منی ہے

(روپیہ) (درمیان)

[۱] امرء القیس عرب کا ایک بڑا مشہور شاعر تھا جو صاحبِ دیوان ہے اور جس کا ایک قصیدہ اُن سات مشہور فصیح و بلیغ عربی قصیدوں میں بھی تھا جو عرب کے سات نامور شاعروں نے اپنا کمال ظاہر کرنے کے لئے کعبۃ اللہ کے دروازہ پر لٹکا دئے تھے اور جو سبعہ معلقہ کے نام سے مشہور ہیں۔

[۲] والمیک سنسکرت زبان کا مشہور شاعر۔ رامائن کا مصنف جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ رامچندر جی کی زندگی میں موجود تھا۔ مطلب اشعار کا یہ ہے کہ جب مُلک میں ہندو مسلمان دونوں ہی کو رہنا سہنا ہے تو اُن کو زبان بھی ایسی اختیار کرنی پڑے گی جیسے اُردو کی طرح ہندو مسلمان دونوں آسانی سے سمجھ لیں اور بول سکیں۔ ہندی مسلمانوں کا گزارہ نہ تو ہندوستان میں امرء القیس بننے یعنی عربی کا فاضل بننے سے ہو سکتا ہے اور نہ ہندوؤں کا گزارہ والمیک یعنی فاضل سنسکرت بننے سے۔

[۳] ہمدم لکھنؤ کا ایک مشہور اُردو روزنامہ تھا جو اُس وقت سید بشارت علی صاحب جالب دہلوی مرحوم کی ایڈیٹری میں نکل رہا تھا اور مسٹر چنتامنی الہ آباد کے مشہور انگریزی روزنامہ لیڈر کے مدراسی ایڈیٹر تھے جو بعد میں کونسل کے ممبر بھی ہو گئے تھے۔ ہمدم اور لیڈر میں اُردو ہندی کی بحث چھڑی ہوئی تھی۔ حضرتِ اکبر طنزاً لکھتے ہیں کہ ایسی بے سود بحثوں سے کیا فائدہ۔ جس سے کوئی مالی فائدہ حاصل نہ ہو۔ آج کل تو ایسی بحثیں کرنی چاہئیں جن سے روپیہ ملے۔

خوب مِل کر لڑی زباں سے زباں

معنیٔ جنگ اُردو و ہندی
مَیں یہ سمجھا بہ عالمِ رندی
یعنی ہے اس میں لُطف وصلِ بتاں
خوب[1] مِل کر لڑی زباں سے زباں

تین چوتھائی اُردو کے مالِک ہندو ہیں

اُردو کے تین ربع کے مالک ہیں خود ہنود
پھر کیا سبب جو اُس سے اُنھیں انحراف (اختلاف۔بیزاری) ہے
یعنی اُردو[2] ہے چیز (تین چوتھائی) اُنھیں کے مذاق کی
اُردو کے تین جزو یہی صاف صاف ہے

---

[1] مطلب یہ ہے کہ ہندو مسلمانوں کے وصل و اتحاد کے زمانہ میں دونوں زبانوں کا ملنا یعنی دونوں کا ایک زبان اُردو اختیار کرلینا ہندی زبان کی رقابت کا باعث ہوگیا اور اُردو ہندی زبانیں آپس میں لڑنے لگیں یعنی زبان کا مسئلہ ہندو مسلمانوں کی نااتفاقی کا باعث ہوگیا۔

[2] اُردو جس کو اُرد بھی بمعنی ماش (مشہور غلہ) اُرد کی دال ہندوؤں کی خاص غذا ہے۔ اُردو کے چار حرفوں میں پہلے تین حرف (یعنی تین چوتھائی حروف) وہ ہیں جن سے لفظ اُرد بنتا ہے۔ گویا لفظ اُردو ہی سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ اُس کے تین چوتھائی کے مالک ہندو ہیں پھر مُلک کی مشترکہ زبان ہونے کی حیثیت سے بھی ہندو اُردو کے تین چوتھائی مالک ہونے کے مدّعی ہو سکتے ہیں، کیونکہ مُلک کی آبادی میں تین چوتھائی حصّہ اُنہی کا ہے۔ علاوہ ازیں اُردو زبان کی بنیادی ترکیب و ساخت میں بھی تین چوتھائی دخل ہندوؤں کی مخصوص زبان ہندی بھاشا یا پراکرت کو ہے۔

اُردو کو عربی اور بھاشا بنانے کی کوشش

ہم[1] اُردو کو عربی کیوں نہ کریں اُردو کو وہ بھاشا کیوں نہ کریں
(بھاشا: ہندوستان کی پرانی زبان پراکرت)

جھگڑے کے لئے اخباروں میں مضمون تراشا کیوں نہ کریں
(تراشا: اختراع کرنا)

آپس میں عداوت کچھ بھی نہیں لیکن اک اکھاڑا قائم ہے
(اکھاڑا: دنگل)

جب اِس سے فلک کا دل بہلے ہم لوگ تماشا کیوں نہ کریں
(فلک: مراد مخالفین اتحاد یعنی انگریزوں سے ہے)

---

[1] مطلب یہ ہے کہ اُردو ہندی کا جھگڑا ہندو مسلمانوں کی باہمی عداوت کی وجہ سے نہیں چھڑا ہے بلکہ اُس کی شہ دینے والے انگریز ہیں جو کوئی ذریعۂ اتحاد ملک میں باقی رکھنا نہیں چاہتے اور جن کی حکومتی مصلحتیں اسی کی متقاضی ہیں کہ ہندو مسلمان آپس میں لڑتے رہیں۔ انہی کے اشارہ پر کبھی مسلمان اُردو میں غیرمانوس عربی الفاظ ٹھونس کر اُس کو ہندوؤں کے لئے مُشکل و ناقابلِ فہم بنا رہے ہیں اور کبھی ہندو یہ کوشش کرتے ہیں کہ عربی اور فارسی کے بجائے سنسکرت اور ہندی کے غیرمانوس الفاظ اُردو میں داخل کو دیئے جائیں تاکہ اُردو بالکل ہندی زبان ہو کر رہ جائے جسے صرف ہندو ہی سمجھ سکیں۔

ادبی چٹکلے
اور
شعری لطائف

چاہِ ذقن اور گیسو کا جال

کہا جب، غیر کو کیوں تو نے اے گلرو پھنسایا ہے
تو بولا دل لگی کے واسطے اُلّو پھنسایا ہے
اِدھر چاہِ ذقن[1] ہے اُس طرف ہیں جال گیسو کے
ہمارے دل کو اُس نے کر کے بے قابو پھنسایا ہے

میں فرشتہ نہ کہار

اُس بُت کے لئے ہے دہر میں فصلِ بہار
اک تختِ رواں[2] پہ پھرتا ہے لیل و نہار
کہتا ہے اُٹھاؤ اس کو یہ ہے مرا عرش
کہہ دو اکبر[3] کہ میں فرشتہ نہ کہار

خیالِ عاشق کی نیک معاشی

عاشق کا خیال ہے بہت نیک معاش
ہونے نہیں دیتا حُسن کے راز کو فاش
کیوں وصل میں جستجو کمر کی وہ کرے
حاضر[4] میں نہ حجت اور نہ غائب کی تلاش

---

۱ فارسی اور اُردو شعراء معشوق کی ٹھوڑی کو کنوئیں سے تشبیہ دیا کرتے ہیں۔

۲ تختِ رواں ہوادار کو یعنی اُس تخت کو کہتے ہیں جس پر بادشاہ سوار ہو کر نکلتے ہیں اور جسے آدمی اپنے کندھوں پر اُٹھائے ہوتے ہیں۔

۳ یعنی بُت اگر خدا ہے تو میں فرشتہ نہیں ہوں جو اُس کا تخت اُٹھاؤں اور اگر وہ خدا نہیں ہے تو اُسے اپنا تخت کہاروں سے اُٹھوانا چاہئے اور مَیں کہار نہیں ہوں۔

۴ حاضر میں حجت نہیں غائب کی تلاش نہیں، یہ ایک اُردو مثل ہے۔ اس کے معنی ہیں جو موجود ہے، نذر ہے۔ لا کر دینے کا اقرار نہیں۔ شاعرانہ تخیل میں معشوقوں کی کمر نہیں ہوا کرتی یا ایسی پتلی ہوتی ہے کہ نہ ہونے کے برابر۔ اس لئے معشوق کا سچا وفادار عاشق وصلِ معشوق میں معشوق کی کمر کا پتہ چلا کر اُس کے اِس راز کو کہ اُس کی کمر موجود ہے کیوں فاش کرے کہ جس سے معشوق کے حُسن کو بٹہ لگے۔

چینِ جبیں اور دلِ زار

بوڑھے[1] ہوئے کتاب سے بوس و کنار (چومنا اور بغل میں لینا) ہے — اپنے لئے الف ہی فقط قدِ یار ہے

اپنی جبیں (پیشانی) سے چین[2] کے مالک اگر ہو تم — میں بھی ہوں شاہ روس کہ دل میرا زار ہے

داغِ دل کا روبی (لعل) اور اشک کا پرل (موتی)

کہتی ہے زراہِ کبر مجھ سے وہ گرل (لڑکی) — کیا تجھ سے ملوں کہیں کا تو ڈیوک (نواب) نہ ارل (تعلقدار)

اکبر نے کہا دکھا کے داغِ دل و اشک — ہے میری گرہ میں بھی یہ روبی (لعل) یہ پرل (موتی)

کیا خوب کہا ہے "آداب بجالاتا ہوں"

بوسہ کیسا کہ گلوری (پان کا بیڑا) بھی نہیں پاتا ہوں — بس کلام اپنا اُنھیں جا کے سُنا آتا ہوں

وہ یہ فرماتے ہیں کیا خوب کہا ہے واللہ — میں یہ کہتا ہوں کہ آداب[3] بجالاتا ہوں

---

[1] یعنی ایک علم دوست جب بوڑھا ہو جاتا ہے تو اُس کے واسطے چُومنے اور بغل میں لینے کے لئے بس کتابیں ہی رہ جاتی ہیں اور الف ہی اُس کے لئے قدِ یار کا کام دیتا ہے یعنی عشق کے سارے شوق وہ لکھنے پڑھنے ہی سے پُورے کر لیتا ہے۔

[2] چین بمعنی شکن۔ بل اور یہ ایک مشہور مُلک کا نام بھی ہے۔ زار بمعنی نحیف و کمزور۔ مصیبت زدہ اور زار شاہانِ روس کا لقب بھی تھا۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق اگر اپنی چینِ جبیں (تیوری کے بلوں) کی وجہ سے مُلک چین کا مالک ہے تو میں اپنے دلِ زار کی وجہ سے شاہِ روس ہوں۔ یعنی معشوق کو اپنے ناز پر ناز ہے تو مجھ کو اپنے نیاز پر۔

[3] "آداب بجالاتا ہوں" کا محاورہ شکر ادا کرنے کے لئے بولا جاتا ہے۔

عشق نوازی

گو کہ وہ کھاتے پڈنگ اور کیک ہیں ¹(انگریزی کھیر، انگریزی مٹھائی) — پھر بھی سیدھے ہیں نہایت نیک ہیں
جب میں کہتا ہوں کہ گیو می کس ڈیئر — سر جھکا کر کہتے "یو مے ٹیک"² ہیں

گوالن کا عشق کوڑے کی آگ

تیرے قدم سے رونقِ شہرِ پراگ ہے (الٰہ آباد کا قدیم نام) — یعنی ترے ہی دم سے بتوں کا سہاگ ہے (زندگی کی خوشی)
بھڑکی ہے دل کی آگ گوالن کے عشق میں (عورت شیر فروش) — احباب ہنستے ہیں کہ یہ کنڈے³ کی آگ ہے

آپ کالا لوگ

سب سمجھتے ہیں کہ یہ عشقِ بتاں اک روگ ہے (بیماری، علت) — لیکن اس کو کیا کریں ملتا جو موہن بھوگ⁴ ہے
شاہدانِ مغربی (معشوقان) کرتے نہیں مجھ کو قبول — ٹال دیتے ہیں یہ کہہ کر 'آپ کالا لوگ' ہیں

---

¹ گیو می کس ڈیئر' یہ الفاظ انگریزی ہیں Give me Kiss Dear بمعنی پیارے مجھ کو بوسہ دو۔

² یو مے ٹیک' یہ بھی انگریزی الفاظ ہیں You may Take بمعنی تم لے سکتے ہو۔

³ کنڈے کی آگ' دھیمی یعنی ہلکی ہوتی ہے مگر زیادہ دیرپا۔ کنڈا اُپلے کو کہتے ہیں جو گائے بھینس کے گوبر کو تھاپ کر بناتے ہیں۔ کنڈے کی گوالن سے مناسبت ظاہر ہے۔

⁴ موہن بمعنی موہنے والا۔ فریفتہ کرنے والا۔ دلربا۔ بھوگ بمعنی بھوجن۔ کھانا۔ خوشی۔ عیش۔ ہم بستری۔ موہن بھوگ حلوے کو کہتے ہیں یہاں مراد معشوق کے وصل کی لذت ہے۔

چہرے کی داڑھی یا فرد کی تفصیلِ ذیل

جوؔ[۱] مرد ہیں وہ پاک ہیں دنیا کے میل سے | سچ ہے خبیث [پلید] ملتے ہیں ایسی چڑیل سے
چہرےؔ[۲] کے نیچے قہر [مصیبت] ہے داڑھی کا جھول جھال [ڈھیل ڈھال] | اس فرد [فہرستِ حساب] کو بچائیے تفصیلِ ذیل [نیچے دی ہوئی تشریح] سے

ڈیر کلوؔ

چٹھی اس مِس [انگریز لڑکی] کی ہے یہ کہ جادو ہے | دل جوشِ مفارقت سے بے قابو ہے
ایسی پری [مراد خوبصورت] اور مجھ کو پیارا لکھے | القاب میں دیکھئے ڈیرؔ[۳] کلو ہے

---

۱ مرد سے مراد شریف اور بہادر مرد ہیں۔ ایسے مرد دنیا سے محبت نہیں کرتے کیونکہ دنیا ایسی ہے جیسی کہ ایک پلید اور خبیث عورت اور خبیث عورتوں سے میل ملّت خبیث مرد ہی رکھتے ہیں بمصداق آیۃ اَلْخَبِیْثَاتُ لِلْخَبِیْثِیْنَ خبیث عورتیں خبیث مردوں ہی کے لئے ہوتی ہیں۔

۲ چہرہ کو فردِ حساب سے اور داڑھی کو تفصیلِ ذیل سے تشبیہ دی گئی ہے۔ فردِ حساب میں آمد و خرچ کا کوئی عنوان لکھ کر اُس کے آگے حسبِ تفصیلِ ذیل لکھ دیا جاتا ہے یعنی اِس آمدنی یا خرچ کی تفصیل نیچے درج کی جاتی ہے اور یہ تفصیل عنوان کے مقابلہ میں بہت طول طویل ہوتی ہے۔ اس شعر میں طنز ہے اُن لوگوں پر جو داڑھی کے ڈھیلے ڈھالے پن کو چہرہ کے لئے ایک مصیبت تصور کرتے ہیں۔ جیساکہ تفصیلِ ذیل، فردِ حساب کے لئے ایک مصیبت ہوجاتی ہے۔

۳ بے تکلفانہ انگریزی خطوط مخاطب کے مختصر نام کے ساتھ لفظ ڈیر Dear بمعنی پیارا کے القاب کے ساتھ شروع کئے جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہندوستان کے کالے آدمی مغرب کی گوری چٹی لڑکیوں کے محض خطوں میں اُن کو ڈیر (پیارا) لکھنے سے ایسے بے خود ہوجاتے ہیں کہ اُن لڑکیوں کی جدائی میں تڑپا کرتے ہیں۔

کاسۂ سر یا چولھے پر توا

آگ برسانے کو لائی ہے ہوا — جیٹھ میں اس لوہ کی ہے کیا دوا
کاسۂ[1] سر ہو گیا بالائے سر — جس طرح چولھے کے اوپر ہو توا

(کاسۂ سر: کھوپری۔ سر کا پیالہ — جیٹھ: سخت گرمی کے مہینہ کا ہندی نام)

سب بول ڈالئے

دل[2] میں جو پڑ گئی ہے گرہ کھول ڈالئے — اک دم میں کُل متاعِ سخن تول ڈالئے
ترکیب ہے ترقّیٔ اُردو کی بس یہ خوب — جو آپ بول سکتے ہیں سب بول ڈالئے

(متاع: اندوختہ۔ پونجی)

داڑھی بھی پیٹ کی طرف جاتی ہے

خلقت[3] اسی سمت صف بہ صف جاتی ہے — باعود و رباب و چنگ و دف جاتی ہے
ہے نورِ خدا بھی طالبِ رزق کا دوست — داڑھی بھی تو پیٹ کی طرف جاتی ہے

(سمت: طرف — صف بہ صف: قطار در قطار — عود: بربط — رباب: ایک قسم کی سارنگی — چنگ: ایک قسم کا باجا — دف: ڈفلی وغیرہ)

---

[1] یعنی دماغ لوہ کی گرمی سے تپنے لگا اور کاسۂ سر ایسا معلوم ہونے لگا جیسے کسی نے جلتے چولھے پر توا رکھ دیا ہو۔

[2] مطلب یہ ہے کہ آج کل جب تک لوگ اپنے خیالات کا پبلک میں اظہار نہ کریں اُن کے دل کی گرہ نہیں کھلتی یعنی اُن کو چین نہیں پڑتا۔ اس سے کچھ اور فائدہ ہو یا نہ ہو کم از کم اُردو کی ترقّی تو ہوتی ہے۔

[3] مطلب یہ ہے کہ ساری دُنیا پیٹ کی فکر یعنی طلبِ رزق میں مُبتلا ہے۔ حصولِ رزق کی کوشش میں کوئی گا رہا ہے کوئی بجا رہا ہے کوئی کسی شغل میں ہے کوئی کسی شغل میں۔ غرض یہ کہ جو جس سے بن پڑتا ہے کر رہا ہے۔ یہاں تک کہ داڑھی جسے خدا کا نور کہا جاتا ہے وہ بھی پیٹ ہی کی طرف جاتی ہے اور طالبانِ رزق کے لئے حصولِ رزق کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

بے زر عشق ٹیں ٹیں

بے سود اشعار اور کبت (ہندی اشعار) ہوتے ہیں
مفلس سے کہاں وہ ملتفت (توجہ کرنے والے) ہوتے ہیں

کرۓ[1] پیچ (داؤں) تو عشق کے اکھاڑے (کشتی لڑنے کی جگہ) میں ہزار
یہ بُت تو بزورِ زر چیت (پچھڑتے ہیں) ہوتے ہیں

فراقِ یار

آپ کی فرقت میں مَیں کل رات بھر سویا نہیں
لیکن اتنی بات تھی گاتا رہا رویا نہیں

نوشِ جاں فرمائیں حضرت شوق سے یہ ناشتہ
چھ بجے ہیں میں نے تو مُنھ بھی ابھی دھویا نہیں

بُتانِ گمراہ بہ گرد حبیب اِلٰہ

خلافِ[2] حق چو حریفاں زراہ می گردند
زفیضِ حکمتِ او رو براہ می گردند

مکرم است بہ ہندوستاں شہِ کابل
بُتاں بگردِ حبیب الٰہ (یعنی امیر حبیب اللہ خاں) می گردند

---

[1] مطلب یہ ہے کہ معشوق نہ تو شعرو شاعری سے قابو میں آتے ہیں نہ اور تدبیروں سے، اُن کو قابو میں لانے اور اپنی طرف متوجّہ کرنے کے لئے تو بس زردار ہونے اور اُن پر روپیہ خرچ کرنے کی ضرورت ہے۔ بے زر عشق ٹیں ٹیں کی مثل مشہور ہے۔

[2] یہ اشعار امیر حبیب اللہ خاں مرحوم سابق فرماں روائے افغانستان کے حکومت انگریزی کے مہمان کی حیثیت سے ہندوستان آنے کے سِلسلہ میں لکھے گئے ہیں۔ امیر صاحب موصوف کی آمد پر ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنی اسلامیت کے پُرجوش مظاہرے کئے تھے اور جن مسجدوں میں امیر صاحب نماز پڑھنے جاتے تھے وہاں اُن کی زیارت کے شوق میں ہزاروں بے نمازی بھی نماز پڑھنے پہنچ جاتے تھے۔ اشعار میں طنز یہ ہے کہ انگریزوں کی اِس حکمت عملی سے کہ اُنھوں نے ایک اسلامی حکومت کے بادشاہ کو ہندوستان میں مہمان بُلایا گمراہ بھی راہِ راست پر آگئے اور جو خدا کے آگے نہیں جُھکتے تھے وہ بھی حبیب اللہ (بمعنی خدا کے دوست) کے گرد پھرنے لگے۔

شملہ بمقدارِ علم

افسوس ہے کہ مر گئے "بک"[۱] اب نہیں کوئی
اِس درجہ جس میں علم ہو اِس درجہ حِلم ہو
شملے[۲] میں جان دی تو تعجب ہے اس میں کیا
نازم تھی وہ جگہ جو بمقدار عِلم ہو

(بُردباری)

در پناہِ من بیا

قصّۂ[۳] منصور سُن کر بول اُٹھی وہ شوخ مِسْ
کیسا[۴] احمق لوگ تھا پاگل کو پھانسی کیوں دیا
کاش[۵] اے اکبر وہی حالت مجھے بھی پیش آئے
اور یہ کافر پکارے در پناہِ من بیا

سورج کی داڑھی

بولے جاڑوں میں لالہ گنگا دین
دھوپ سے مجھ کو ہوتی ہے تسکین
داڑھی سورج کی تھام لیتا ہوں
مدّعا یہ کہ گھام لیتا ہوں

(مراد سورج کی شعاعیں) (دھوپ میں بدن سینکتا ہوں)

[۱] مسٹر بک علی گڈھ کالج کے سب سے پہلے۔ بڑے با اثر اور نامور انگریز پرنسپل تھے۔
[۲] مسٹر بک کا انتقال شملہ پہاڑ پہ ہوا تھا جو غیر منقسمہ ہندوستان کا گرمائی دار الحکومت تھا۔ شملہ فارسی میں دستار۔ عمّامہ یا طرہ کو بھی کہتے ہیں۔ شملہ بمقدار علم، ایک فارسی مثل ہے جس کے معنی ہیں "دعوائے علم بقدرِ علم" یعنی جیسا علم ویسا ہی ٹھاٹھ۔ مطلب یہ ہے کہ مسٹر بک انگریزی کے بڑے عالم تھے اس لئے وہ مرے بھی ایسی جگہ جو انگریزی حکومت میں ہر لحاظ سے بہت اونچی تھی۔
[۳] یعنی حضرتِ منصور حلاّج رح جن کے "اَنَا الحق" (میں خدا ہوں) کہنے پر مفتیانِ شرع کے فتوے سے اُن کو سولی پر چڑھا دیا گیا تھا۔
[۴] انگریز عموماً ایسی ہی اُردو بولا کرتے تھے۔ یعنی منصور تو دیوانہ تھا اور دیوانے کو پھانسی دینی حماقت تھی۔
[۵] یعنی کاش مجھ پر بھی منصور کی سی کیفیت طاری ہو جائے اور مجھے بھی پھانسی پر لٹکانے کا فتویٰ دے دیا جائے اور جو معشوقہ، منصور کی حمایت میں اُن کے پھانسی دینے والوں کو احمق بتا رہی ہے وہ مجھے بھی پھانسی سے بچانے کے لئے اپنی پناہ میں لے لے یعنی اس بہانہ سے میں وصلِ معشوق سے شادکام ہو جاؤں۔

مدہوش لذّت

۱ؐ
ماراؔ فلک نشاند بہ پہلوئے آں صنم ۔۔۔ مدہوش لذّتیم و ندانم دگر چہ کرد
اکنوں کرا دماغ کہ پُرسد ز پانیئر ۔۔۔ کرزن چہ گفت ولؔ چہ شنید و ملؔر چہ کرد

(پانیئر: انگریزی نیم سرکاری روزنامہ الٰہ آباد کا ہوا — کرزن: لارڈ کرزن مشہور وائسرائے ہند)

نوشتۂ تقدیر سے بے خبری

۲ؐ
ما نیچری شدیم و نہ داریم آگہی ۔۔۔ با دیگراں نوشتۂ کلکِ قضا چہ کرد
اکنوں کرا دماغ کہ پُرسد ز جبرئیل ۔۔۔ احمدؔ چہ گفت و او چہ شنید و خدا چہ کرد

(نیچری: پیرو سرسید — کلک: قلم — قضا: تقدیر — جبرئیل: عامل وحی مشہور فرشتہ — احمد: مراد غالباً سرسید احمد خاں سے ہے — او: یعنی جبرئیل)

۱ؐ مجھ کو فلک یعنی انقلاب زمانہ نے اُس معشوق کے پہلو میں بٹھادیا۔ میں (ہم نشینی) کی لذّت میں مدہوش ہوں اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اب کیا کروں۔ اب کس کا دماغ ہے یعنی کس میں اِتنی ہمّت ہے کہ (اخبار) پانیئر سے پوچھے کہ کرزن نے کیا کہا، ولؔ نے کیا سُنا، اور ملؔر نے کیا کیا۔ دوسرا شعر کسی مشہور فارسی شاعر کے اس شعر میں تصرّف کرکے لکھا گیا ہے ؎ اکنوں کرا دماغ کہ پُرسد ز باغباں ٭ بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد۔ مطلب اشعارِ اکبرؔ کا یہ ہے کہ انگریزوں کے مقرّب و منظورِ نظر ہوجانے کے بعد یہ سوچنے اور معلوم کرنے کا ہوش نہیں رہا کہ انگریزی حکومت کے بڑے بڑے ذمّہ دار افسر ہمارے متعلق کیا منصوبے بنا رہے ہیں۔

۲ؐ ترجمہ:۔ میں نیچری تو ہو گیا ہوں لیکن مجھے یہ پتہ نہیں ہے کہ دوسرے نیچریوں کے ساتھ تقدیر کا کیا لکھا پیش آیا ہے (یعنی قضا و قدر نے اُن کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے) اب یہ کس کا دماغ ہے کہ جبرئیل سے پوچھے کہ سر سیّد احمد خاں نے اُن سے (ہمارے متعلق) کیا کہا۔ جبریل نے کیا سُنا اور (پھر اس پر) خدا نے کیا کیا۔ یعنی نیچری ہونے کے بعد ہمیں کبھی اس پر غور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی کہ ہمارا حشر دنیا و آخرت میں کیا ہونے والا ہے۔

لیلیٰ کی صورت کا تصوّر

نہ دِل[1] پستا ہے بسکٹ پر نہ میں پوری پہ لچتا ہوں
مذاقی حاشئے کو چھوڑ کر دونوں سے بچتا ہوں

دلِ رنگیں ہے یاں، لیلا رچانے[2] کی ضرورت کیا
اکیلا بیٹھ کر لیلیٰ کی صورت خود ہی رچتا ہوں

مچھّر اور طاعون

مچھّروں نے بہت ستایا رات
میں نے کوسا کہ ہو تمھیں طاعون[3]

بولے اُس کا ہمارا منبع ایک
کیوں وہ کرنے لگا ہمارا خون

نکلنے کی جگہ یعنی پیدا ہونے کی جگہ

لہ دِل پستنا محاورہ ہے بمعنی فریفتہ ہونا (پستہ ایک خشک میوہ بھی ہے) لچنا بمعنی گرویدہ ہونا۔ جُھکنا، نرم ہونا۔ (لچئی) ایک قسم کی نہایت ملائم پُوری ہوتی ہے جو حلوے کے ساتھ بڑی مزے دار معلوم ہوتی ہے) حاشیہ چھوڑنا، بمعنی کاغذ پر چاروں طرف جگہ چھوڑ کر لکھنا۔ مذاقی حاشئے کو چھوڑ کر، سے مراد ہے۔ زبان کے چٹخارے یا مزے کا تو تھوڑا بہت لحاظ رکھنا ہی پڑتا ہے ورنہ میں حتی الامکان بسکٹ اور پوری جیسے مشرقی کھانوں سے بچتا ہوں جو ثقیل اور نقصان رساں ہوتے ہیں۔ بسکٹ کے ساتھ دل پستا۔ پوری کے ساتھ لچتا اور مذاقی حاشئے کی تجنیسات معنوی قابلِ غور ہیں۔

لہ لیلا رچانا محاورہ بمعنی کھیل تماشوں سے خوش ہونا۔ دِل بہلانا۔ لیلیٰ۔ قیس کی مشہور معشوقہ۔ عام معشوقہ کو بھی کہتے ہیں۔ رچنا بمعنی مہندی کا رنگ ہونا۔ شادی کا سامان مہیا کرنا وغیرہ سے مطلب یہ ہے کہ جن کا دل زندہ اور رنگین ہوتا ہے اُن کو اپنی تفریح طبع کے لئے کھیل تماشوں کی ضرورت نہیں ہوتی وہ تنہا بیٹھ کر بھی اپنی معشوقہ کے تصوّر سے دِل خوش کر لیا کرتے ہیں۔

سہ طاعون۔ گلٹیوں کی مشہور وبائی بیماری جو چوہوں سے پھیلتی ہے اور چوہوں میں پسّوؤں سے اور پسّوؤں میں گندگی اور غلاظت سے۔ مچھّر بھی گندگی اور غلاظت سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ اِس لئے مچھروں پر طاعون کا اثر کیا ہوگا کیونکہ دونوں کا منبع ایک ہی ہے۔

میرے انڈر میں کام کرتا ہے

بابو جی کا وہ بُت ہوا نوکر ۔۔۔ غیر اُس کو پیام دیتا ہے
بابو کہتے ہیں وہ نہ جائے گا ۔۔۔ میرے انڈر میں کام دیتا ہے

مِس کے لینے میں مسٹیک

غلطی مجھ سے ضرور یہ ایک ہوئی ۔۔۔ پیدا وجہ نصیحتِ نیک ہوئی
لینا تھا لغت سے اور ہی لفظ کوئی ۔۔۔ مِس کو جو لیا یہ مجھ سے مِسٹیک[1] ہوئی

سلونو، نونو اور فونو

بے دل ہمیں بروز سلونو[2] نہ کیجئے ۔۔۔ لِلّٰہ بات مانئے نونو نہ کیجئے
کل کی صدا نہ خوبیٔ فطرت نہ لطفِ دید ۔۔۔ بہتر یہی ہے خواہشِ فونو نہ کیجئے

۱؎ مِس ٹیک۔ Mistake انگریزی لفظ ہے جس کے معنی ہیں غلطی۔ یہ لفظ دو جزوں سے مرکب ہے ایک مِس Miss بمعنی غلطی سے یا غلط طور پر۔ دوسرے ٹیک Take بمعنی لینا۔ مس Miss کے معنی کنواری لڑکی کے ہیں۔ یہاں مراد انگریز لڑکی سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عشق کے لئے مس کو انتخاب کرنے میں مجھ سے غلطی ہوئی اور اس غلطی کا احساس مجھ کو لغت میں لفظ مسٹیک دیکھ کر ہوا جس کے اجزا یہ بتا رہے ہیں کہ معشوق کے لئے مس کا اختیار کرنا غلطی ہے۔ مسٹیک کے لفظ سے مجھ کو ایک نصیحت حاصل ہو گئی۔

۲؎ ہندوؤں کا مشہور تہوار جو ساون کے مہینے میں پورنماسی کے دن ہوتا ہے اور جس میں ہندو عورتیں اپنے عزیزوں کی کلائی پر دھاگا باندھتی ہیں جس کو راکھی کہتے ہیں اور اسی لئے اس تہوار کا نام راکھی بندھن بھی ہے۔

۳؎ مراد یہ ہے کہ مغربی معشوقائیں مشین کی طرح ہوتی ہیں۔ نہ اُن میں کوئی فطرتی کشش ہوتی ہے اور نہ ان کی دید سے کوئی لطف حاصل ہوتا ہے۔ اِس لئے اُن سے دل لگانا بے کار ہے۔

ہولی بائبل

اِس قدر رنگ اُڑا ہو گئے رنگیں اوراق
چوک میں پادری صاحب نے جو کھولی بیبل
ہنس کے اکبرؔ نے کہا رنج نہیں کچھ اِس کا
ہو گئی اب تو حقیقت میں یہ ہولی بیبل[۱]

کھچڑی داڑھی اور ترش روئی کی چٹنی

ہوئی جب آمدِ پیری ہوا ہیں سرکہ پیشانی
ترش روئی کی چٹنی جوڑ ہے داڑھی ہو جب کھچڑی[۲]
سوال اب یہ عبث ہے کیوں بتوں کی ہے یہ ارزانی
چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی[۳]

۱؎ انجیل کو عیسائی انجیل مقدس یا ہولی بیبل کہا کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ پادری صاحب نے ہندوؤں کو ہولی کی اوباشانہ رنگ ریلیوں سے روکنے کے لئے سرِ بازار بائیبل کھول کر نصیحت شروع کی تھی مگر ہولی منانے والوں نے رنگ ایسا اُچھالا کہ انجیل کے اوراق بھی رنگین ہو گئے اور حضرتِ اکبرؔ نے یہ فقرہ چُست کر دیا کہ بائیبل اب حقیقت میں ہولی ہو گئی۔ یعنی ہولی کے رنگ میں رنگ گئی اور ہولی کے معنی ختم ہو گئی کے بھی ہیں۔

۲؎ کھچڑی داڑھی ایسی داڑھی کو کہتے ہیں جس میں آدھے بال سفید ہوں اور آدھے سیاہ۔ ایسی داڑھی عموماً بڑھاپے کی علامت ہوتی ہے اور بڑھاپے میں مزاج عموماً چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ کھچڑی داڑھی ترش روئی کی چٹنی کے استعارہ کی دلیل سے مفہوم میں لطف پیدا کیا گیا ہے۔

۳؎ یہ کسی مشہور فارسی شاعر کا مصرع ہے جس کا ترجمہ ہے۔ جب کعبہ ہی سے کفر (کا علم) بلند ہونے لگا تو پھر مسلمان کہاں باقی رہ سکتا ہے۔ یعنی جب مسلمانوں کے مذہبی پیشوا ہی مغربی تقلید میں اپنے دین و مذہب کو چھوڑ بیٹھے تو پھر عام مسلمانوں سے مسلمان رہنے کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے اور جب مسلمان ہی نہیں رہے تو پھر یہ سوال بیکار ہے کہ بتوں کی یعنی غیر خدا معبودوں کی اتنی کثرت اور ارزانی کیوں ہو گئی۔

انرجی، بینرجی، وقتِ ڈنرجی

کچھ سینؔ[1] خوش آتے ہیں نہ بھاتے ہیں بینرجی
میں ذیل کا طالب ہوں نہ خواہان انرجی
سُنتا نہیں لیکچر میں پڑا رہتا ہوں دِن رات
لگتا ہے فقط لیڈیوں سے وقتِ ڈنرجی[2]

او بہ فکرِ عجبے من بہ خیالِ عجبے

طبع[3] سمجھی کہ بلندی میں بڑھی جاتی ہے
زُلف خوش ہے کہ یہ پھانسی پہ چڑھی جاتی ہے
وہ ہے نافہم یہ عیّار، مچل ہے نازک
اہلِ بینش میں یہ اِک نظم پڑھی جاتی ہے
دارد[4] آں آفتِ جاں حُسن وجمال عجبے
چشم مستِ عجبے دارد و خالِ عجبے
او بتاراجِ دلم مائل و من مائلِ او
او بہ فکرِ عجبے من بہ خیالِ عجبے

۱؎ سینؔ اور بنرجی وغیرہ۔ بنگالی ہندوؤں کے خاندانی یا نسبی تعلق کے اظہار کے لئے ان کے ناموں کے آخر میں لگائے جاتے ہیں۔

۲؎ یعنی مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ نہ تو بنگالیوں کی طرح اُن میں جوش وولولہ ہے نہ قوّتِ عمل۔ وہ لیڈروں کے لکچر وغیرہ بھی نہیں سُننے اور گھر میں بیکار پڑے رہتے ہیں۔ اُن کا دِل تو بس انگریز لیڈیوں کے ساتھ ڈنر کھانے میں لگتا ہے۔

۳؎ مطلب یہ ہے کہ نئی تہذیب کی زلف کے پھندے میں پھنس کر ہم تو یہ سمجھ رہے ہیں کہ ترقی کر رہے ہیں اور جنھوں نے زلف کا یہ جال ہمارے لئے بچھایا ہے وہ خوش ہو رہے ہیں کہ ہم خود ہی اپنے گلے میں پھانسی ڈال رہے یعنی اپنی ہلاکت کا سامان کر رہے ہیں۔ ہم تو بھولے اور ناسمجھ ہیں اور ہمارے مخالف بڑے کائیاں اور مکّار۔ ہم نے اُن کے ظاہری رنگ ڈھنگ پر فریفتہ ہو کر اُن کے تباہ کُن منصوبوں کی طرف سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔

۴؎ یہ اشعار امیر خسرو کی ایک مشہور غزل ؏ چشم مستِ عجبے زلفِ درازے عجبے کی طرز پر لکھے گئے ہیں۔ ترجمہ اُن کا یہ ہے:- وہ آفتِ جاں عجیب حُسن وجمال رکھتا ہے۔ عجیب چشمِ مست رکھتا ہے اور عجیب خال و رُخ۔ وہ میرے دل کو لوٹنے کا ارادہ کئے ہوئے ہے اور میں اُس کی طرف مائل ہوں وہ ایک عجیب فکر میں ہے اور میں ایک عجیب خیال میں۔

شعر و شاعری

شاعروں کا نالۂ موزوں

جب پڑی قومی مصیبت تو کسی نے کیا کیا — سب ہوئے اندوہ گیں (غمگین) خونِ جگر سب نے پیا
ہاں جو[1] شاعر تھے اُنھوں نے نالۂ موزوں کے ساتھ — داغِ دل کو آسمانِ نظم (رنجیدہ) پر چمکا (برداشت سخت غم و غصہ) دیا

غیر فطری شاعری

سُنتا ہوں محال (ناممکن) ہے خدائی سے گریز (بھاگنا، بچنا) — لیکن کہتا تھا مجھ سے کل اِک انگریز
تم[2] مانگ لو اپنے شاعروں سے گھوڑا — فِطرت کے حدود سے زیادہ ہے وہ تیز

---

[1] مطلب یہ ہے کہ جب غیر ملکی حکومت کے مظالم سے قوم پر مصائب نازل ہوئیں تو ابناءِ قوم سب خونِ جگر پی کر رہ گئے اور سوائے غم و غصّہ میں تڑپنے کے اُن سے اور کچھ نہ ہو سکا۔ البتہ شاعروں نے اپنے غمزدہ دلوں کے پُر درد نالوں کو اشعار میں موزوں کر کے آسمانِ نظم پر چمکا دیا یعنی دنیا پر اپنی مظلومیت اور ظالموں کے ظلم کو آشکار کر دیا۔

[2] یعنی مشرقی شاعروں کا گھوڑا فطری حدود یعنی فطرت کی مقرّر کردہ رفتار سے بھی زیادہ تیز رفتار ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے شاعر ایسے مبالغہ سے کام لینا جانتے ہیں کہ وہ ناممکن کو بھی ممکن بنا دیتے ہیں اور اپنے تخیّل کے گھوڑے پر بیٹھ کر وہ خدا کی خدائی سے بھی گریز کر سکتے ہیں۔ انگریز ہمارے شاعروں کے اِس کیرکٹر کا مذاق اُڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم تو اپنے شاعروں کے ذریعہ سے ہر مصیبت سے نجات حاصل کر سکتے ہو اور اپنے دل کو تسکین دے سکتے ہو۔

وقت نے شاعروں کا قافیہ تنگ کر رکھا ہے

شعر کہتا ہے بزم سے نہ ٹلو — داد لو واہ کی ہوا میں پلو
وقت کہتا ہے قافیہ[1] ہے تنگ — چُپ رہو، بھاگ جاؤ، سانس نہ لو (یعنی اپنے حوصلے نہ بڑھاؤ)

آج کل کی شاعری

لفظوں کے چمن بھی اِس میں کھِل جاتے ہیں — بے ساختہ (بلا کوشش، بے تکلف) قافیئے بھی مِل جاتے ہیں
دل[2] کو مطلق نہیں ترقّی ہوتی — تعریف میں سَر اگرچہ ہِل جاتے ہیں

---

[1] قافیہ تنگ ہونا محاورہ ہے بمعنی شعر کا قافیہ نہ مِلنا یا قافیہ کا شعر میں موزوں نہ ہونا۔ نیز بمعنی عاجز آنا۔ تنگ ہونا۔ گھبرانا۔ مطلب یہ ہے کہ اشعار کی خوبی تو شاعر کو اس پر مجبور کررہی ہے کہ وہ اُنھیں جلسوں میں پڑھ کر سُنائے اور سُننے والوں کی داد یعنی تعریف و توصیف سے محظوظ ہو اور اپنے حوصلے بڑھائے۔ لیکن وقت ایسا نازک ہے جس نے شاعر کا قافیہ تنگ یعنی اُس کو عاجز و پریشان کر رکھا ہے اور مصالحِ وقت کا اقتضا ہے کہ دِل کے جذبات و خیالات کو دل ہی میں رکھا جائے اور کسی کے سامنے زبان پر نہ لایا جائے۔

[2] مطلب یہ ہے کہ آج کل کی شاعری میں اگرچہ محاسن لفظی بھی ہوتے ہیں اور محاسن معنوی بھی اور اُن کو سُن کر سُننے والے بے ساختہ داد بھی دیتے ہیں لیکن دلوں پر اُن شعروں کا کوئی مُفید اثر نہیں پڑتا اور اُن سے کوئی اِصلاحی مقصد پورا نہیں ہوتا۔

آرائشِ الفاظ

جب واقعاتِ اصلی پیشِ نظر نہ آئے
شاعر نے کام رکھّا تحسین و آفریں (واہ واہ۔ سبحان اللہ) سے
الفاظ نے سنور کر (آراستہ ہو کر) اپنے قدم جمائے
نیچر[1] (فطرت) نے کی گذارش رخصت ہوں میں یہیں سے

شاعری کی تین قسمیں

اِک شاعری وہ ہے جو بڑھاتی ہے عقل و ہوش
اِک شاعری وہ ہے جو دلاتی ہے دِل کو جوش
ارشاد ہو تو قسمِ سوم کو بھی کر دوں عرض
اِک شاعری وہ ہے کہ جو ہے صِرف واہ نوش[2]
لیکن کوئی بھی قسم ہو اچھّا ہے شِعر اگر
محفِل کو غالباً ہمہ تن[3] پائیے گا گوش

---

[1] مطلب یہ ہے کہ جن شاعروں کی نظریں حقائق فطرت و مناظر کائنات کی گہرائیوں تک نہیں پہنچتیں اُن کا مقصد شعر گوئی سے صِرف سُننے والوں کی داد و تحسین حاصل کرنا ہوتا ہے اور جب سارا زورِ تخیل الفاظ کی زیبائش و آرائش اور صنائع لفظی میں صَرف کر دیا جاتا ہے تو شعر میں فطری شاعری کا رنگ اور فطرت انسانی پر اثر اندازی کرنے کی خوبی باقی نہیں رہتی۔

[2] واہ نوش فنّی اور دِل چسپ ترکیب ہے بمعنی لفظی واہ پینے والی، یعنی جس کا مقصد صِرف یہ ہوتا ہے کہ سُننے والے اشعار کو سُن کر واہ واہ کریں۔

[3] ہمہ تن گوش پانا یعنی اہلِ مجلس کو شعر سُننے کی طرف پوری طرح متوجہ پانا اور محاسن شعری سے محظوظ ہوتے دیکھنا۔

کلامِ حافظ و فردوسی کی بجائے باقاعدہ لٹریچر

اب کہاں نشو و نما پائے نہالِ معنی
کس زمیں پر دلِ پرجوش کی بدلی برسے
بزمِ حافظ[1] ہے نہ میدان ہے فردوسی کا
قوم کو کام ہے باضابطہ لٹریچر سے

کام کی اور کھیل کی شاعری

اِک شاعری وہ ہے جسے فطرت سے میل ہے
اک شاعری وہ ہے جو اکھاڑے کا کھیل ہے
دونوں ہیں گو کہ اپنی جگہ مستحقِ داد
منزل سے اُس کو کام ہے اِس کو کلیل[2] ہے

لہ حافظ = خواجہ حافظ شیرازی ایران کے مشہور اہلِ دل شاعر۔ فردوسی = تخلص ہے حکیم ابوالقاسم منصور طوسی کا جو سلطان محمود غزنوی کے زمانہ میں ایک مشہور باکمال شاعر تھے اور جن کا شاہنامہ فارسی لٹریچر کی ایک مشہور تاریخی تصنیف ہے۔ باضابطہ لٹریچر سے مراد قانونی اور سرکاری محکموں کے قواعد و ضوابط کی کتابیں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اب قوم کو زیادہ تر کام قوانین و قواعد و ضوابط کی کتابوں سے پڑ رہا ہے۔ نہ اُن کے تخیل میں حافظ کی سی بلندی رہی نہ اُن کے دلوں میں فردوسی کا سا جوش۔ معنی آفرینی کے بجائے اب سب معنی فہمی کے چکر میں پڑ گئے ہیں۔

٢ کلیل = خوشی میں گھوڑے کا اُچھلنا کودنا۔ مطلب اشعار کا یہ ہے کہ ایک شاعری تو وہ ہے جو فطری جذبات کا اظہار کرتی اور انسانی فطرت پر اپنا اثر ڈالتی ہے اور ایک شاعری وہ ہے جس کا مقصد صرف شعری مقابلہ کے کھیلوں یعنی مشاعروں میں سامعین سے تحسین و آفرین کا حاصل کرنا ہے۔ بزبانِ استعارہ فطری شاعری ایک ایسا گھوڑا ہے جس کے سامنے ایک منزل ہے یعنی جس میں کسی قومی مقصد کو مدِ نظر رکھا جاتا ہے اور دنگلی شاعری ایک ایسا گھوڑا ہے جو خوشی میں صرف اُچھلتا کودتا ہے اور جس کے سامنے کوئی منزل یا مقصد نہیں ہوتا۔

شاعروں کا مذہب

آزاد ہوں نہیں ہے کوئی مدعائے خاص
جس[1] رخ ہے قافیہ مرا مطلب بھی ہے وہی
مذہب کو شاعروں کے نہ پوچھیں جنابِ شیخ
جس[2] وقت جو خیال ہے مذہب بھی ہے وہی

---

[1] یعنی آج کل کی شاعری خیالات و جذبات کی نہیں بلکہ ردیف و قافیہ کی پابند ہوتی ہے یعنی ردیف اور قافیہ جس طرف خیالات و جذبات کو پھیر دیتے ہیں اُسی رنگ میں شعر کہے جاتے ہیں۔

[2] یعنی شاعروں کا تخیل اُن کے مذہب کا نہیں بلکہ شاعروں کا مذہب اُن کے تخیل کا پابند ہوتا ہے۔ شاعرانہ نقطۂ نظر سے جو اچھا خیال اُن کے دماغ میں آجاتا ہے اُسی کو قلم کر دیتے ہیں خواہ وہ مذہب کے موافق ہو یا مخالف۔

اکبر اور اُن کی شاعری

(بزبانِ خود)

صاحب کی محفل اور اکبر کے احباب

وان شوکت و زینت کے جو اسباب بہت ہیں — معنی کے یہاں گوہرِ نایاب بہت ہیں
صاحب (مراد احکام سے ہے) کی سی محفل تو میسر (نصیب) نہیں لیکن — صد شکر کہ اکبر کے بھی احباب بہت ہیں

بزمِ اکبر سے اعراض

بزمِ اکبر دانش آموز و نشاط انگیز (فرحت بخش) ہے — ہر سخن اُس کا لطیف و خوب و معنی خیز (پُرمعنی) ہے
بالارادہ (ازقصد) اُس سے جو کرتا ہے اعراض (اجتناب) و گریز (پرہیز) — ناتواں ہی ہے وہ یا کودن (ناداں) ہے یا انگریز[۱] ہے

پیری آئی۔ ہوئی جوانی رخصت

پیری آئی ہوئی جوانی رخصت — ساتھ اس کے وہ لطفِ زندگانی رخصت
ہے اب[۲] تو اسی کا انتظار اے اکبر — ہم کو بھی کرے جہانِ فانی رخصت

---

[۱] انگریز سے مراد یہاں انگریزوں کے مقلد ہیں۔ جو نئی تہذیب کے ایسے گرویدہ ہو گئے ہیں کہ حضرت اکبر جیسے پُرانے خیال کے دانشمند، دُور اندیشوں کی کوئی بات اُن کو اچھی نہیں معلوم ہوتی۔

[۲] یعنی بڑھاپے میں کوئی لطفِ زندگی باقی نہیں رہتا اور ہر وقت یہی انتظار رہتا ہے کہ موت کب آتی ہے۔

اکبرؔ کے اشعار کا اثر ہوگا مگر ٹھوکریں کھا کر

دیکھے اکبرؔ کے آج کچھ اشعار آئی بے حد پسند یہ گفتار
تجربہ[1] خود بنے گا واعظِ دین (نصیحت آموز) لیک بعد از خرابیٔ بسیار

اکبرؔ کی ایک ہی رٹ

گردن خالق کے آگے جھکتی ہی نہیں اب ابتری سے یہ قوم رکتی ہی نہیں
ہوتی نہیں ان میں کچھ بھی غیرت پیدا اور[2] بات اکبرؔ کی ہے کہ چکتی ہی نہیں (ختم ہی نہیں ہوتی)

کنجِ تنہائی اور خدا کا دھیان

ارماں (حسرت، آرزو) نہ شراب و بزمِ شاہد (اہم، معشوق، محبوب) کا ہے ساماں[3] نہ محافل و مساجد کا ہے
اکبرؔ کو ہے انس (محبت، لگاؤ) کنجِ (گوشہ) تنہائی سے دھیان اُس کو فقط خدائے واحد کا ہے

---

[1] مطلب یہ ہے کہ جو لوگ نئی تہذیب پر فریفتہ ہو کر خدا پرستی و دینداری کی صراطِ مستقیم سے بھٹک گئے ہیں وہ کچھ روز کے تلخ تجربوں کے بعد خود ہی دھکے کھا کر راہِ راست پر آجائیں گے لیکن اُس وقت جب کہ نئی تہذیب کے تجربوں سے اُن کو بہت بڑا نقصان پہنچ چکا ہوگا۔ دوسرا مصرعہ شیخ سعدی کے اُس شعر کا ہے ۔ انچہ دانا کند کند ناداں ، لیک بعد از خرابیٔ بسیار ۔۔۔
ترجمہ:۔ نادان بھی کرتا وہی ہے جو دانا کرتا ہے مگر کافی نقصان اُٹھانے کے بعد۔

[2] یعنی یہ دیکھنے کے باوجود کہ اُن کی نصیحتوں کا آج کل کے لوگوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا اور برابر تباہی کی طرف چلی جا رہی ہے اکبر نصیحتیں کئے ہی جاتے ہیں۔

[3] یعنی بڑھاپے میں اس کی بھی توفیق نہیں رہتی کہ دینی محفلیں منعقد کی جائیں یا مسجدوں کی رونق کو بڑھایا جائے۔

نظّارۂ شاہدِ معانی

کھولی ہے زباں خوش بیانی کے لئے ۔۔۔ اُٹھا ہے قلم گہر فشانی کے لئے

یعنی اشعار کے موتی بکھیرنے کے لئے

آیا[1] ہوں کوچۂ سخن میں اکبرؔ ۔۔۔ نظّارۂ شاہدِ معانی کے لئے

یعنی حسنِ مطالب و معانی کا معشوق

دل و دماغ بے قابو

فلک مجھ کو اگر ایوان دیتا اور چمن دیتا ۔۔۔ مزا[2] جب بھی مرے دل کا یہی داغِ کہن دیتا

محل

دماغ و دل پہ اب قابو نہیں ہے ورنہ اے اکبرؔ ۔۔۔ حریفوں کو دکھاتا بانکپن، دادِ سخن دیتا

مراد ہمعصر ۔ شوخی۔ طرحداری ۔ یعنی سخن گوئی کا کمال دکھاتا

نظمِ اکبرؔ دافعِ سحر و کفر

ایمان[3] کی ہے تاک کافری ہے تو یہ ہے ۔۔۔ تقویٰ بے دم ہے ساحری ہے تو یہ ہے

نشانہ لگھات ۔ خدا ترسی، پرہیزگاری ۔ بیجان ۔ جادوگری

نظمِ اکبرؔ ہے دافعِ جادو و کفر ۔۔۔ ماشاءاللّٰہ شاعری ہے تو یہ ہے

کلمۂ تحسین ۔ چشمِ بد دور

---

[1] یعنی میری شعر گوئی کا مقصد اُن حسین مطالب و معانی سے لطف اندوز ہونا ہے جو مجھے اپنے اشعار میں نظر آتے ہیں۔

[2] یعنی اگر مجھ کو بڑے امیروں کی طرح رہنے کے لئے محل اور سیر و تفریح کے لئے چمن نصیب ہوتے تب بھی سب سے زیادہ مزہ اور لُطف مجھے اس میں آتا کہ قوم کی بے راہ روی کے غم کا جو داغ ابتدائے عمر سے میرے دل میں بیٹھ گیا ہے اُس کو اپنے اشعار کے ذریعہ سے ابناءِ قوم کو دکھاتا رہوں۔

[3] مطلب یہ ہے کہ آج کل کی کافری محض بے ایمانی نہیں، بلکہ ایمان دشمنی ہے۔ یعنی کفر کے دوست ایمان کو مٹیا دینا چاہتے ہیں اور نئی تہذیب کی یہ ایک بڑی جادوگری ہے کہ اُس نے خدا ترسی اور دینداری کو بے حس و بے جان کر دیا ہے۔ مگر اکبرؔ کے اشعار اُس کفر کو بھی دبا رہے ہیں اور اُس جادو کو بھی۔

عام شاعروں کی پیروی

کہتے ہیں شاعری یہ تری بے اصول ہے — کہتا ہوں صاف میں تو نہیں تجھ کو مانتا
میں[1] نے کہا کہ آپ کی کرتا جو پیروی — تو آپ کے سوا کوئی مجھ کو نہ جانتا

انقلابِ زمانہ کا اثر اکبر پر

رنگ ہی کچھ اور اب تو روز و شب کا ہو گیا — جس طرف دیکھو دگرگوں حال سب کا ہو گیا
اس تغیّر سے مگر اُس کو نہیں پہنچا ضرر (نقصان) — انقلاب[2] آیا بھی اکبر پر تو رب کا ہو گیا

زبان تیغ کے بجائے عصا ہو گئی

میری طرف سے سارا جہاں بدگماں ہے اب — آزادیِ کلام وہ مجھ میں کہاں ہے اب
رکھتی ہیں پھونک[3] پھونک کے باتیں مری قدم — تیغِ (تلوار) زباں نہیں ہے عصائے (لاٹھی) زباں ہے اب

---

[1] یعنی میں بھی اگر اس رنگ کی شاعری کرتا جس رنگ کی آج کل کے عام شعرا کر رہے ہیں تو سوائے اُن شاعروں کے مجھے اور کوئی نہ جانتا اور میری اصلاحی اور تبلیغی شاعری کو جو مقبولیت حاصل ہوئی ہے وہ نہ ہوتی۔

[2] یعنی خدا سے برگشتگی کا جو انقلاب دنیا میں آیا ہوا ہے اُس کا اثر اکبر پر اُلٹا ہوا ہے کہ وہ "رب" کا ہو گیا ہے یعنی اُس کو اپنے رب سے اور زیادہ تعلق و وابستگی پیدا ہو گئی ہے۔ پُر لطف صنعتی خوبی اس شعر میں یہ ہے کہ لفظ اکبر کو اگر اُلٹ دیا جائے تو "رب کا" ہو جاتا ہے۔ گویا لفظی انقلاب بھی معنوی انقلاب کی تصدیق کر رہا ہے۔

[3] پھونک پھونک کر قدم رکھنا، محاورہ ہے بمعنی بڑی احتیاط اور دیکھ بھال سے کام کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ اربابِ حکومت اور علمبردارانِ تہذیب جدید کو میری طرف سے اور میری شاعری کے مقاصد کے متعلق بہت بدگمانیاں ہو گئی ہیں اور میرے شعروں سے ایسے مطلب نکالے جاتے ہیں جس سے مجھ کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے اس لئے مجھے شعروں کے لکھنے اور اپنے خیالات کے ظاہر کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لینا پڑ رہا ہے۔ دوسرے شعراء اپنی زبان یعنی اپنے شعروں سے تلوار کا کام لیتے ہیں اور مجھے اپنے خیالات کو زبان کی لاٹھی کے سہارے سے چلانا پڑتا ہے۔ یعنی خیالات کے اظہار میں ایسے لفظوں کا تابع رہنا پڑتا ہے جو قانونی احتیاط اور مصلحتِ وقت کے خلاف نہ ہوں۔

واہ واہ کے لئے لفظوں کی دوکان

خوب اِک ناصحِ مشفق نے یہ ارشاد کیا
بزم میں اُس نے تعلّی (شیخی-خود ستائی) جو کل اکبر کی سنی

نہ تری فوج نہ شاگرد نہ پیر اور نہ مرید
نہ تو ارجن[۱] ہے نہ سقراطؔ، رشی ہے نہ مُنی

کس نگیں (نگینہ-نگ) پر ہیں ترے نقش کے آثار عیاں
نوٹ بُک (کاپی، یادداشت، بیاض) تیری شکستہ (پھٹی پرانی) تری پنسل ہے گھُنی[۲]

فکر سے ذکر سے عبرت سے تجھے کام نہیں
واہ وا[۳] کے لئے لفظوں کی دکاں تو نے چُنی

طبع[۴] میں تیری وہی خامیِ حرصِ دُنیا
آتشِ خوفِ خدا سے نہ جلی ہے نہ بھُنی

خود پرستی (خود غرضی-خود بینی) ہے بہت خلق کی خدمت کم ہے
دِل دہی[۵] (محبت-ہمدردی) کم ہے تو ہے دِل شکنی (دل آزاری) چار گُنی

تکیہ[۶] بر جائے بزرگاں نتواں زد بہ گزاف (شیخی-تعلّی)
مگر اسباب بزرگی ہمہ آمادہ (مہیا-فراہم) کُنی

---

۱ ارجن = پانڈوں کے تیسرے بھائی جنھوں نے مہابھارت کی لڑائی میں کرشن جی کے مشہور اُپدیش سے جسے گیتا کہتے ہیں متاثر ہو کر راجہ کرن اور بڑے بڑے سورماؤں کو قتل کیا تھا اور جو ایک بڑے تیر انداز تھے۔ سقراط = یونان کا ایک بہت بڑا اور مشہور فلسفی جس پر کفر کا الزام لگایا گیا اور جس کو زہر کا پیالہ پی کر جان دینی پڑی۔ رشی اور مُنی ہندی میں عابد و زاہد اور مقدّس بزرگ کو کہتے ہیں۔

۲ گھُنی بمعنی گھُن کھائی ہوئی۔ کھوکھلی۔ اندر سے گلی ہوئی۔ مطلب یہ ہے کہ نہ تو تمہارے پاس کوئی ظاہری ساز و سامان ہے نہ لاؤ لشکر۔ نہ تمھارا کوئی شاگرد ہے نہ مرید۔ کوئی خاص علمی اور عملی قابلیت بھی نہیں ہے۔ پھر تم کس بات پر گھمنڈ کر رہے ہو۔

۳ یعنی شعر گوئی سے تمہارا مقصد نہ تو اپنی دماغی اور روحانی قوتوں کو بیدار کرنا ہے اور نہ حوادثِ عالم سے عبرت حاصل کرنا۔ لفظوں کی یہ دوکان تم نے صرف واہ واہ حاصل کرنے یعنی اپنی شاعری کی تعریف و توصیف سُننے کے لئے کھولی ہے۔

۴ یعنی دنیاوی نمود کی حرص کی خامی ابھی تک تیرے دل میں موجود ہے کیونکہ ابھی تو نے اُس کو خوف و خشیت الٰہی کی آگ میں نہیں تپایا ہے۔ یعنی اگر تیرے دل میں خدا کا ڈر ہوتا تو وہ سوائے خدا کے کوئی اور آرزو نہ کرتا۔

۵ یعنی خود غرضیاں اتنی بڑھی ہوئی ہیں کہ ابناءِ قوم کے ساتھ دلی ہمدردی رکھنے اور اُن کی خدمت کرنے کے مقابلہ میں ایسی حرکتیں ہم سے بہت زیادہ سرزد ہوتی ہیں جن سے اُن کے دلوں کو تکلیف پہنچتی اور ہم سے بیزاری پیدا ہوتی ہے۔

۶ یہ فارسی شعر بھی کسی پُرانے شاعر کا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے۔ بزرگوں کی جانشینی پر اعتماد مشیخت و تعلّی کی بِنا پر نہیں کرنا چاہئے بلکہ وہ خوبیاں اپنے اندر پیدا کرنی چاہئیں جو بزرگ بننے کے لئے ضروری ہیں۔

شیخ و سیّد کی ذات سے خطاب

شیخ و سیّد[١] سے تو خالی نہیں ذکرِ شاعر — ذات سے اُن کی مخاطب نہیں فکرِ شاعر

طبعِ مجنوں مری ہے عاشقِ ملّت اے دوست — کیوں روا رکھتا ہے ناحق مری ذلّت اے دوست

راہِ وحشت[٢] میں اگر قیس سے لغزش ہو جائے — حیف لیلیٰ پہ جو آمادۂ کاوش ہو جائے

وحشت: مراد جوش عشق و محبت — قیس: عاشق یعنی مجنوں — لغزش: غلطی — لیلیٰ: قیس کی معشوقہ — کاوش: پرخاش۔ دشمنی

دل کو گرم رکھنے والا نغمہ

پیارا ہے ہم کو شیخ ہمارا بُرا سہی — چاقو[٣] ولایتی نہیں دیسی چھُرا سہی

اکبر کا نغمہ قوم کے حق میں مفید ہے — دِل[٤] کو تو گرم رکھتا ہے وہ بے سُرا سہی

نغمہ: مراد شاعری

---

١ یعنی اکبر کی شاعری میں شیخ و سیّد کی قومی اور مِلّی رہنمائیوں پر طنز و طعن تو ضرور ہوتا ہے لیکن اُس سے کسی شیخ یا سیّد کی ذاتی توہین و تنقیص مقصود نہیں ہوتی۔

٢ یعنی اکبر کو اپنی ملّت اور قوم کا عشق ہے اور اس عشق کے جوش میں اگر اکبر سے کوئی لغزش یا غلطی ہو جاتی ہے تو یہ غلطی ایسی ہی ہے جیسی کہ لیلیٰ کے عشق میں مجنوں سے ہو جائے اور ایسی والہانہ اور غیر اختیاری غلطی پر اکبر کا مخالف ہو جانا اور اُس کی تذلیل کرنا مناسب نہیں ہے۔

٣ یعنی اگرچہ ہمارے پُرانے مذہبی رہنماؤں میں وہ ظاہری چمک دمک اور ٹیپ ٹاپ نہیں ہے جو نئے لیڈروں میں ہے لیکن اُن کی مثال ایسی ہے جیسے دیسی چھرے کی جو ولایتی چاقو کے مقابلہ میں بھدا بے ڈھنگا اور بوجھل ہونے کے باوجود ولایتی چاقو سے زیادہ کار آمد ہوتا ہے اِس لئے مجھے تو نئی روشنی کے لیڈروں کے مقابلہ میں پُرانے مذہبی رہنما ہی زیادہ محبوب و عزیز ہیں۔

٤ یعنی اکبر کی شاعری شاعری کے معیار پر پوری نہ بھی اُترے دلوں پر اثر تو کرتی ہے اور قوم کے حق میں مفید ثابت ہوتی ہے۔

بُلبل کو بے سُرا کہنے والے

ناواقفِ وزنِ شعر جو مجھ کو کہے — اُس کے آگے ضرور ہے چُپ رہنا
بُلبل[1] کو بھی بے سُرا وہ کہہ دے گا کبھی — ایسے سنجیدہ (متین۔ باوزن) شخص کا کیا کہنا

بھجن کی دُھن میں بُتِ طنّاز کی تردید

زباں اکبر کی اِس طرزِ سخن پر ناز کرتی ہے — بھجن (ہندوؤں کا مذہبی گیت) کی دُھن[2] میں تردیدِ بُتِ طنّاز (شوخ، بیباک) کرتی ہے
معزّز کرتی ہے اُن کی نظر، ممتاز کرتی ہے — بس[3] اِتنا ہے دَرِ الحاد (بے دینی) کو بھی باز کرتی ہے
معاشر کیمپ میں کیوں جا بسے مجھ سے نہ پوچھ اے دل — مثالِ اوّلیں خود تجھ پہ کشفِ راز کرتی ہے

دلِ رنگین کا خون

یہ کیا سبب ہے جو رہ رہ کے جی بھر[4] آتا ہے — یہ کیا ہوا جو مجھے شہر کاٹے[5] کھاتا ہے

---

[1] یعنی جو لوگ اکبر کے اشعار کے پُر اثر ہونے کی خوبیوں کو نہیں دیکھتے بلکہ اُن کے وزن سے گر جانے وغیرہ کے ظاہری شعری نقصوں کو دیکھتے ہیں وہ تو بلبل کے پُر اثر نالوں میں بھی بے سُرا پن محسوس کر سکتے ہیں۔
[2] یعنی ابنائے قوم و وطن کے محبوب و مرغوب خیالات و معتقدات کی تردید ایسے پیرایہ سے کرتی ہے کہ بظاہر وہ تردید تائید معلوم ہوتی ہے۔
[3] یعنی انگریزوں کے منظورِ نظر ہو جانے سے عزت و امتیاز تو ضرور حاصل ہوتا ہے مگر ساتھ ہی بے دینی اور مذہب سے روگردانی کا راستہ بھی کُھل جاتا ہے۔
[4] جی بھر آنا یعنی دل کا غمزدہ اور آنکھوں کا پُرنم ہو جانا۔
[5] کاٹے کھانا، بمعنی خوفناک معلوم ہونا۔ تکلیف دینا۔

یہ خون ہو گئی کیوں میرے دل کی رنگینی[1] | یہ داغ دینے لگی کیوں چمن کی گل چینی[2]
اُداس ہو گئی کیوں روح خانۂ تن سے (بیزار) | اُچاٹ ہو گئیں کیوں بلبلیں یہ گلشن سے (برداشتہ خاطر)

شیطان پر طعن کا طعنہ

اکبر کے کلام میں مزا کچھ بھی نہیں | گو اُس نے بہت کہا۔ کہا کچھ بھی نہیں
زلف و کمرِ بُتاں کا مفقود ہے ذکر[3] | شیطان پہ طعن کے سوا کچھ بھی نہیں

مقرّر کردہ حدود شاعری

نہ ہوں جو شعر مرے آپ کو پسند نہیں[4] | پسند فرض نہیں اور مجھے گزند نہیں (تکلیف)

---

[1] خون ہونا بمعنی مارا جانا۔ ختم کر دیا جانا۔ دل کی رنگینی خون ہو گئی یعنی زندہ دلی اور دل کی اُمنگیں ختم ہو گئیں۔

[2] داغ دینا بمعنی رنج دینا۔ تکلیف پہنچانا۔ یعنی زندہ دلی ختم ہو جانے پر گُل چینی چمن جیسے تفریحی مشغلوں سے بھی تکلیف ہوتی ہے۔

[3] یعنی اکبر کے شعروں میں چونکہ سوائے اس کے کہ ابناءِ قوم کے شیطانی افعال و اعمال پر لعن و طعن ہے، نہ حسینوں کے حُسن کا ذکر ہے نہ عشق و عاشقی کا، اِس لئے اُس کے اشعار بالکل بدمزہ اور پھیکے ہیں اور اگرچہ کہنے کو تو اکبر نے ہزاروں شعر کہے ہیں مگر آج کل کے عام مذاق کے لحاظ سے یہ سمجھنا چاہئے کہ اُس نے کچھ بھی نہیں کہا۔

[4] اس شعر میں تعقید لفظی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر میرے شعر آپ کو پسند نہیں ہیں تو نہ ہوں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ شاعر جو شعر بھی کہے وہ پسند بھی کیا جائے اس لئے میرا شعر پسند نہ آنے سے مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔

بجز[١] خطائے نظر اور سہوِ کاتب کے
کچھ اعتراض اگر ہیں تو سود مند نہیں
حدود میں نے معین کئے ہیں اپنے لئے
اور ان حدود کے اندر کہیں میں[٢] بند نہیں

شاہدِ معنی پر ظرافت کا لحاف

لغزشیں مدِ ظرافت میں جو کچھ آئیں نظر
دوستوں سے التجا یہ ہے کریں اُس کو معاف
سردِ[٣] موسم تھا ہوائیں چل رہی تھیں برف بار
شاہدِ معنی نے اوڑھا ہے ظرافت کا لحاف

اکبر کے کلام سے ناراضی

اکبر کی خرافات سے ناخوش ہوئے ایسے
نامہ ہے نہ پیغام نہ حصہ ہے نہ بخرا
مانا کہ حسینوں کے لئے ناز ہے لازم
لیکن[٤] کوئی پوچھے تو کہ پاگل سے بھی نخرا

---

[١] یعنی میرے اشعار پر اگر ایسے اعتراضات کئے جائیں جن کا تعلق میری کسی بھول چوک یا کتابت کی غلطی سے ہے تو یہ اعتراضات تو میرے لئے فائدہ مند ہو سکتے ہیں اور جو دوسرے اعتراضات کئے جاتے ہیں وہ اختلافِ خیالات وعقائد و مذاق سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے بیکار ہیں۔

[٢] بند نہ ہونا یعنی مجبور نہ ہونا۔ یعنی جو قیود و حدود میں نے اپنی شاعری کے لئے مقرر کر لئے ہیں اُن کا پابند رہ کر ہر رنگ میں میں شعر کہہ سکتا ہوں۔

[٣] مطلب یہ ہے کہ جن لطیف وحسین مطالب و معانی کو میں اپنے شعروں میں ظاہر کرنا چاہتا تھا زمانہ کی نزاکت اور سیاسی فضا کے ناموافق وخطرناک ہونے کی وجہ سے مجبوراً مجھے اُن مطالب کو ظرافت کے رنگ میں پیش کرنا پڑا ہے۔

[٤] یعنی خرافات بکنے والا تو پاگل ہوا کرتا ہے اُس کی ہنسی مذاق کی باتوں سے ناراض ہو کر قطع تعلق کر لینا دوستوں کے لئے مناسب نہیں ہے۔

کہتے بھی خوب ہیں، سُنتے بھی خوب ہیں

بے جا ہو اعتراض تو اُس پر بھی ہیں خموش — گو دِل ہی دل میں غصّے سے بُھنتے بھی خوب ہیں
کہتے ہیں خوب حضرتِ اکبر شک اِس میں کیا — لیکن میں دیکھتا ہوں کہ سُنتے[1] بھی خوب ہیں

عارفانہ شاعری کے متعلّق بدگمانی

اِک غزل میں اتفاقاً میرا اِک مصرعہ یہ تھا — دیدۂ عبرت سے رنگِ دَیرِ[2] فانی دیکھئے
کوئی بول اُٹھا زوالِ حُسنِ بُت مقصود ہے — اس سخن میں بدشگونی کی فشانی دیکھئے
عارفانہ شاعری بھی آج کل دشوار ہے — بزمِ دنیا میں یہ زورِ بدگمانی دیکھئے

---

[1] سُنتے بھی خوب ہیں، یعنی بُرا بھلا بھی اُن کو بہت کہا جاتا ہے یا یہ کہ اپنی بُرائیوں کو بہت صبر و ضبط سے سُنتے ہیں۔

[2] یعنی دیر (بُت کدہ) کو فانی کہہ دینے سے بعض لوگوں کو یہ بدگمانی ہوگئی کہ میرا اشارہ مغربی بُت کدہ کی طرف ہے یعنی میرے شعر سے بُتانِ مغرب کے زوالِ حُسن کی بدشگونی نکلتی ہے۔ حالانکہ میرا مصرعہ عارفانہ رنگ میں تھا اور میں نے تمام دنیا و مافیہا ہی کو ایک بُت کدہ سے تعبیر کیا تھا جس میں پھنس کر انسان خدا کو بھول جاتا ہے مگر بُت کدۂ عالم کا حوادثِ فنا کی زد میں آتا رہنا یہ ثابت کر رہا ہے کہ وہ خدا خانہ نہیں بلکہ بُت کدہ ہی ہے۔ مگر حکومت پرستوں کی بدگمانیاں اس قدر بڑھی ہوئی ہیں کہ وہ ایسے عارفانہ شعروں سے بھی اپنے زوال کا مطلب نکالتے ہیں۔

ذاتیات

نواب محسن الملک کی کارگزاری

مہدی[1] کو بُرا بھلا جو چاہو کہو — لیکن دکھلا دی اُس نے بیوٹی اپنی
لاکھوں ہی کے ڈھیر کردئے کالج میں — پوری کردی یہ اُس نے ڈیوٹی اپنی

ڈاکٹر مینارڈ کی مہارتِ فن

ڈاکٹر مینارڈ[2] ہیں اپنے ہنر میں لاجواب — ہاتھ[3] اُن کا برق ہے نشتر شعاعِ ماہتاب
ہفت سالہ تھا مرض دم بھر میں زائل ہوگیا — آنکھ روشن ہوگئی جاتا رہا سارا حجاب
پانچ[4] ہی دن میں نہ پٹی تھی نہ وہ بستر کی قید — حُسنِ کلکتہ تھا اور میری نگاہِ انتخاب
ڈاکٹر مینارڈ کو اللہ رکھے شادکام — اور رہے خلقِ خدا اُن کے ہنر سے فیض یاب

---

[1] مراد مولوی مہدی علی خاں نواب محسن الملک مرحوم رفیق و جانشینِ سرسیّد۔

[2] ڈاکٹر مینارڈ اُن ماہرِ امراضِ چشم، ڈاکٹر صاحب کا نام ہے جنھوں نے ۱۹۰۹ء میں حضرتِ اکبر کی آنکھ کا آپریشن کیا تھا۔ یہ اشعار حضرت اکبر نے ڈاکٹر مینارڈ کی فرمائش پر کہے تھے اور اِن کا انگریزی ترجمہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے فریم میں لگا کر اپنے ہاں آویزاں کرلیا تھا۔ (حیاتِ اکبر صفحہ ۹۷)

[3] یعنی ہاتھ بجلی کی طرح تیزی سے چلتا اور سکنڈوں میں آپریشن کردیتا ہے اور نشتر شعاعِ ماہتاب ہے یعنی جس طرح چاند کی کرنیں آنکھوں کو تکلیف نہیں دیتیں اسی طرح اُن کے نشتر سے بھی تکلیف نہیں ہوتی۔

[4] یعنی پانچ ہی دن میں پٹی کھل گئی اور بستر سے اُٹھنے کی اجازت مِل گئی۔ کلکتہ کی خوش نمائیاں مجھ کو نظر آنے لگیں اور اپنی آنکھ کے آپریشن کے لئے ڈاکٹر مینارڈ پر نظرِ انتخاب پڑنے سے مجھ کو مسرت ہوئی۔

مدرسۂ الٰہیات کانپور اور منشی رحمت اللہ رعد

مدرسۂ الٰہیات[1] خوب ہے کانپور میں — قوم کی سچ جو پوچھئے خدمتِ واقعی یہ ہے
حمدِ خدا کے غلغلے ہوں گے بلند اب یہاں — اِس میں ذرا بھی شک نہیں دین کی بہتری یہ ہے
حضرتِ رعد کا یہاں جوش وخروش دیکھ کر — سب نے کہا یُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِہٖ[2] کا یہ ہے

نواب محسن الملک مرحوم کی رہنمائی

مہدی سا بزرگ صاحبِ جاہ تو ہے — سنجیدہ کلام کے لئے واہ[3] تو ہے
منزل کا اگر پتہ[4] نہیں ہے نہ سہی — دل کش روشیں ہیں دل کشا راہ تو ہے

---

(۱) یہ مدرسۂ الٰہیات مولٰنا آزاد سبحانی نے کانپور کے مشہور قومی کارکن جناب منشی رحمت اللہ صاحب رعد مالک بڑی جنتری کی کوشش واشتراک سے قائم کیا تھا۔

(۲) یہ قرآن مجید کی سورۂ رعد کی ایک آیت کا ٹکڑا ہے جس کا مفہوم ہے "بادلوں کی گرج حمدِ خدا کے ترانے گاتی ہے" یعنی یہ آیت مجازاً حضرتِ رعد کے اُس جوش وخروش پر بھی صادق آتی ہے جو خدا کا نام بلند کرنے اور اُس کی عظمت وشان کا نقش بٹھانے کے لئے مدرسۂ الٰہیات کے قائم کرنے میں حضرتِ رعد دکھا رہے تھے۔

(۳) یعنی کوئی ایسا شخص تو ہے جو سنجیدہ باتوں کی قدر کرنا جانتا ہے۔

(۴) یعنی اگرچہ یہ نہیں معلوم کہ ہماری منزلِ مقصود کیا ہے اور ہماری قوم کو کیسی قوم بننا ہے لیکن جن راستوں پر نواب محسن الملک وغیرہ قوم کو چلا رہے ہیں کم ازکم وہ راستے تو کافی دل کش اور دلوں کو فرحت بخشنے والے ہیں۔

ایڈیٹر حبل المتین سے معذرت[1]

ملال کا تو محل اے حضور کچھ بھی نہیں
خدا گواہ ہے میرا قصور کچھ بھی نہیں

برائے لطف و کرم لائیے یہاں تشریف
الہٰ آباد علی گڈھ سے دُور کچھ بھی نہیں

محبت آپ کی ہے میرے دل میں مستحکم
میں صاف لکھتا ہوں یہ مکر و زُور کچھ بھی نہیں (چال۔ فریب)

وہ امر آپ کی جانب سے میں نہ سمجھا تھا
یہ چاہیے کہئے کہ تجھ کو شعور کچھ بھی نہیں

مولوی محمد کریم صاحب کی بھیجی ہوئی مچھلی[2]

حمدہ مچھلی مسلّم و خام ملی
تحفہ پایا مرادِ خدّام ملی

ممنونِ کریم[3] کیوں نہ ہوں اے اکبر
وہ دام[3] میں لائے مجھ کو بے دام ملی

ایک دوست کی غلط فہمی

اک[4] دوست ہمارے ہیں تپ اُن کو شدید آئی
جھیلا کئے بیماری مدّت میں شفا پائی
(جاڑا بخار)

---

[1] ان اشعار پر یہی عنوان کلیات میں دیا ہوا ہے۔ حبل المتین کلکتہ کا ایک مشہور فارسی اخبار تھا جس کے ایڈیٹر سید جلال الدین طہرانی تھے۔ اشعار میں نہ معلوم کس امر کی معذرت ہے۔ کلیات جلدِ اوّل میں اس پر حاشیہ ہے کہ یہ ایڈیٹر حبل المتین کے نام دعوت نامہ ہے۔

[2] مولوی محمد کریم صاحب تحصیلدار سے مراد ہے جن کے نام ۳ر دسمبر ۱۹۰۵ء کو بمقام میجا ضلع الہ آباد (جہاں وہ متعین تھے) حضرت اکبر نے یہ قطعہ لکھ کر بھیجا تھا۔ مولوی محمد کریم صاحب نے ۱۹۲۹ء میں اپنے وطن دریاباد ضلع بارہ بنکی میں وفات پائی (مولوی عبدالماجد صاحب)۔

[3] قطعہ کا حُسن اسی مصرع میں ہے۔ دام میں لانے سے مراد جال سے پکڑنا ہے اور بے دام ملنے سے مراد مفت حاصل ہونا۔

[4] اس قطعہ پر کلیات میں کوئی حاشیہ نہیں ہے۔ خبر نہیں حضرت اکبر کے یہ دوست کون بزرگ ہیں۔

لاہور کے جلسے میں شرکت کو ہیں اب جاتے — حالانکہ ابھی قوّت پاؤں میں نہیں پاتے
میں کہتا ہوں جاتے ہو لاہور بلا قوّت — وہ اس کو سمجھتے ہیں لاحول ولا قوّۃ
یہ میری غلط بندش وہ اُن کی غلط فہمی — ہیں حد سے بڑھا شاعر وہ حد سے سوا وہمی

مولانا شبلی کو کھانے کی دعوت

آتا نہیں مجھ کو قبلہ قبلی — بس صاف یہ ہے کہ بھائی شبلی
تکلیف اُٹھاؤ آج کی رات — کھانا یہیں کھاؤ آج کی رات
حاضر جو کچھ ہو دال دلیا — سمجھو اُس کو پلاؤ قلیا

مولانا شبلی کی شمس العلمائی

شبلی کا قدم علم کی منزل پہ جما ہے — رفتار میں آخر کی قلم اُس کا تھما ہے
چمکی ہوئی ہے بزم سلف اس کے بیاں سے — روشن ہیں یہ معنی کہ وہ شمس العلما ہے

۱؎ "لاہور بلا قوّت" کا کلمہ تلفظ میں لاحول ولا قوّۃ سے ملتا جلتا ہے۔ لاحول ولا قوّۃ شیطان کے بھگانے کے لئے بولا جاتا ہے۔

۲؎ یعنی میری شاعری کا کمال تھا کہ میں نے "لاہور بلا قوّت" الفاظ کی ایسی بندش رکھی کہ اُسے لاحول ولا قوّۃ بھی سمجھا جا سکتا تھا اور یہ دوست کا حد سے بڑھا ہوا وہمی پن تھا کہ اُنھوں نے "لاہور بلا قوّت" کو لاحول ولا قوّۃ ہی سمجھا۔

۳؎ یعنی شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی مرحوم مشہور مصنّف و مورّخ، وفات ۱۹۱۴ء

۴؎ یعنی وہ اپنی قابلیتِ تحریر سے خطاب و اعزاز حاصل کر رہے ہیں۔

۵؎ شمس العلماء کا خطاب انگریزی حکومت میں اُن حضرات کو دیا جاتا تھا جو کسی علمی قابلیت میں ممتاز ہوتے تھے۔

مسٹر سلیمان[1]، جج ہائی کورٹ

بحمد اللہ کہ حاصل آپ کو ہر ایک نعمت ہے — ذہانت ہے سعادت (نیک خصلتی) ہے شرافت ہے لیاقت ہے

علومِ مغربی میں نمبر اوّل آپ کا آیا — عزیز و دوست جو ہیں سب کو اُس سے اک مسرّت ہے

گورمنٹ آپ کی مدّاح ہے اس قابلیت پر — اکابر (بزرگانِ قوم) قوم کے خوش ہیں ہر اک کو فخر و عزّت ہے

پئے تکمیلِ دانش قصد ہے اب مُلکِ مغرب کا — مبارک ہو کہ لندن کا سفر ہے وقتِ رخصت ہے

مبارک آپ کو احباب کا یہ جلسۂ رخصت — حقیقت میں مبارک وقت ہے اور عمدہ ساعت ہے

بخیر و کامیابی آپ واپس آئیں لندن سے — یہی سب کی دُعا اس دم بہ صد جوشِ طبیعت ہے

زباں پر سب کی جاری ہے یہ شعرِ حضرتِ اکبر — کہ جن کی نظم پر نظمِ ثریا[2] کو بھی حیرت ہے

عطا کر قسمتِ تصنیفِ سعدی (شیخ سعدی شیرازی) یارب اس گُل کو
پھلے پھولے زمانے میں گلستاں بوستاں[3] ہو کر

---

[1] یہ قطعہ ڈاکٹر سید سلیمان جونپوری بیرسٹرایٹ لا کے متعلق ہے جو آخر میں مسٹر سلیمان تھے۔۔ الہ آباد ہائی کورٹ کے جج رہے۔ پھر چیف جسٹس ہوئے آخر میں سپریم فیڈرل کورٹ کے جج اور مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے وائس چینسلر بھی (مولوی عبد الماجد دریابادی) مسٹر سلیمان کا انتقال ۱۹۴۱ء میں دہلی میں ہوا اور قبرستانِ حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب پائین درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا رح میں مدفون ہیں۔

[2] ثریّا بمعنی پروین یہ چھ ستارے ہیں جو باہم متّصل ہیں اور اسی باہمی اتّصال کی وجہ سے نظمِ ثریّا (یعنی چھ ستاروں کا ایک جھمکے میں پرویا ہوا ہونا) خوش نظمی کی ایک مثال ہو گیا ہے۔

[3] گلستاں بوستاں یہ دونوں فارسی لفظ بمعنی باغ کے ہیں اور شیخ سعدی رح کی مشہورِ عالم و مقبولِ خاص و عام اخلاقی کتابوں کے نام بھی ہیں۔ پھلنا پھولنا محاورہ بھی ہے بمعنی بامراد و کامیاب اور مقبول و مشہور ہونا۔۔۔

منشی جگن پرشاد

گو دلِ بیتاب امیدِ وطن پر شاد ہے — شاق لیکن فرقتِ منشی جگن پرشاد[۱] ہے

لالہ نہال چند

ممدوحِ خاص و عام ہیں لالہ[۲] نہال چند — در اُن کے فیض کا کبھی رہتا نہیں ہے بند

چندے وصول کرنے کو ہیں پیشوا بہت — سب کرتے ہیں مباحثِ قرآن و وید[۳] و ژند

لیکن دقیق و سخت جو ہوتا ہے کوئی کام — اُس وقت میں جناب ہی ہوتے ہیں دردمند

حُکّام کے حضور میں کرتے ہیں التماس — قانون[۴] سے جو ہوتا ہے کچھ شبۂ گزند

تقریر رنٹ[۵] بل پہ جو کی مُلک بول اُٹھا

ایں[۶] کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

۱؎ کلیاتِ اکبر جلد اول طبع اوّل میں اس پر حاشیہ صرف یہ ہے "آگرہ سے تبدیلی کے وقت" جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مُنشی جگن پرشاد صاحب کوئی انگریزی حکومت کے افسر تھے۔ "پرشاد" کی ذو معنی ردیف قابلِ داد ہے۔

۲؎ لالہ نہال چند شروع صدی میں اُس وقت کی کونسل کے ایک ذی اثر ممبر تھے۔ (مولوی عبدالماجد دریابادی)

۳؎ وید۔ ہندوؤں کی مشہور قدیم کتاب جس کو وہ الہامی مانتے ہیں۔ ژند حضرت زردشت کی کتاب جس کو پارسی الہامی اور آسمانی کتاب مانتے ہیں۔

۴؎ یعنی اگر حکومت کا کوئی جاری کردہ یا مجوّزہ قانون پبلک کے لئے تکلیف دہ ہوتا ہے تو قانون کو بدلوانے یا رکوانے کی کوشش کرتے ہیں

۵؎ رنٹ بل Rent Bill بمعنی مسودۂ قانون لگان اراضیات۔ اس مسودۂ قانون کے متعلق مجھے تحقیق نہیں ہو سکا کہ یہ کون سا مسودہ تھا اور اُس کا کیا منشاء تھا۔

۶؎ کسی مشہور شاعر کا مصرع ہے جس کا ترجمہ ہے "یہ کام تجھ سے ہی ہو سکتا تھا اور مرد ایسے ہی کام کیا کرتے ہیں"۔

منشی نثار حسین[1] سے آموں کی فرمائش

نامہ کوئی نہ یار کا پیغام بھیجئے
اس فصل میں جو بھیجئے بس آم بھیجئے

ایسے ضرور ہوں کہ اُنھیں رکھ کے کھا سکوں
پختہ اگر ہوں بیس تو دس خام بھیجئے

معلوم ہی ہے آپ کو بندے کا ایڈریس (پتہ)
سیدھے الہ آباد مرے نام بھیجئے

ایسا نہ ہو کہ آپ یہ لکھیں جواب میں
تعمیل ہوگی پہلے مگر دام بھیجئے

حافظ محمد حسین اور نواب محسن الملک

گئے کول حافظ محمد حسین
تو مہدی (نواب محسن الملک) سے بولے یہ حاجی مدن

کہ کر دیجئے اُن کی دعوت ضرور
وہ ہیں صاحبِ دانش و علم و فن

وہ ہیں مولوی آپ بھی مولوی
ذرا دیکھ لیں رونقِ انجمن

وہ بولے مرا ان کا کیا جوڑ ہے
میں گلڈنگ[2] ہوں وہ ہیں اسٹیلین[3] (اسپ نر۔ سانڈ)

[1] رسالۂ پیامِ یار کے مہتمم سیّد نثار حسین صاحب مراد ہیں۔

[2] گلڈنگ لفظ انگریزی Gelding بمعنی آختہ۔ خصّی جانور جس کے خصیئے نکال دئے گئے ہوں۔

[3] سٹیلین لفظ انگریزی Stallion بمعنی سانڈ۔

حضرتِ اکبر کے چند قابلِ قدر دوست

ڈپٹی صاحب جو ہیں زینتِ عُبّادِ (عبادت گزاراں) جہاں
پُختہ وضعی (وضعداری) کے ہیں انداز دکھانے والے

لَلّو پتّو (خوشامد چاپلوسی) سے الگ اور زواید (ظاہرداری کی باتیں) سے بری
بس مصلّے (جانماز) ہی پہ ہیں چھاؤنی[1] چھانے والے

ساز[2] پر ہاتھ پڑا اور ہوئے رُخصت آپ
رہ گئے کھول کے مُنھ بین بجانے والے

انسپکٹر ہیں جو یہ خان بہادر صاحب
رُعبِ حاکم دلِ دنیا پہ بٹھانے والے

پنچ کے جلسوں میں بھی تہذیب کی تصویر ہیں آپ
اگلے اسلام کی ہیں یاد دلانے والے

دوستوں[3] کے لئے بازو کا ہیں تعویذ جناب
رہزنوں کو ہیں یہ سولی پہ چڑھانے والے

شان اللہ کی ہیں برکت[4] و اسرار[5] و مجید[6]
ان کے اخلاق کے قائل ہیں زمانے والے

فیض ان کا سببِ رونقِ عیشِ احباب
تاجِ زرّیں سرِ عشرت[7] پہ اُڑھانے والے

---

[1] چھاؤنی چھانا محاورہ بمعنی مسکن بنالینا، کیمپ قائم کرنا۔ یعنی جانماز ہی اُن کا اوڑھنا بچھونا ہے اور وہی اُن کی حفاظت کا سامان۔

[2] ساز بمعنی باجہ۔ مطلب یہ ہے کہ قوالی میں طبلہ پر تھاپ پڑتے ہی آپ اپنے ہوش میں نہیں رہتے۔

[3] یعنی آپ کی دوستی ایسی ہے جیسے کسی نے بازو پر حفاظت کا تعویذ باندھ لیا ہو یعنی آپ کے دوستوں کو کسی گزند و مصیبت میں پڑنے کا اندیشہ نہیں رہتا۔

[4] مولوی برکت اللہ صاحب رئیس غازی پور۔

[5] سر اسرار حسن خاں صاحب مدار المہام ریاست بھوپال۔

[6] خان بہادر عبد المجید خاں صاحب مرحوم۔

[7] سید عشرت حسین صاحب مرحوم حضرت اکبر کے صاحبزادے۔

سیّد عشرت حسین سے خطاب

شروع[1] سنہ میں مَیں آؤں گا واں تم اپنی ماں کو یہ لکھ چکے ہو
تو دیر پھر کیوں لگا رہے ہو یہ کیا تامّل ہے کیوں رُکے ہو
مجھی کو سمجھو تم اپنا قبلہ سرِ ادب کو یہیں کرو خم
وہاں کے چرچوں[2] میں لطف کیا ہے جسے اُٹھانے کو تم جُھکے ہو

راجہ صاحب محمود آباد کی قدر شناسیِ کلامِ اکبر

ہیں حضرتِ ساحر[3] آج اک حصنِ کمال ہے[4] مخزنِ حکمت و خرد اُن کا خیال
اشعار اکبر کے کیوں نہوں یاد اُن کو راجہ[5] کے گھر میں مُوتیوں کا کیا کال

---

[1] سید عشرت حسین صاحب سے خطاب ہے جو اُس وقت ولایت میں زیرِ تعلیم تھے اور وطن واپس آنے میں پس و پیش کر رہے تھے (مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی)

[2] چرچوں جمع مہنّد ہے انگریزی لفظ چرچ (Church) بمعنی گرجا کی۔ نیز جمع چرچا (لفظ ہندی) بمعنی تذکرہ۔ شہرہ۔ گفت گو۔

[3] ساحر تخلص تھا راجہ سر علی محمد خاں تعلقہ دار محمود آباد ضلع سیتا پور کا۔

[4] یعنی بڑے بیدار مغز عقلمند اور حکیم ہیں۔

[5] یعنی اکبر کے اشعار موتی ہیں اور راجاؤں کے گھر میں موتیوں کی کیا کمی۔ اس لئے راجہ محمود آباد کو بھی اکبر کے اشعار بہت یاد ہیں۔

مولٰنا حسرت موہانی

تھا دلِ حسرت[1] بھرا ارمان میں — ہم نے لکھ بھیجا اُنھیں موہان[2] میں
بھائی صاحب رکھ دو تم اپنا قلم — ہاتھ[3] میں لو اب تجارت کا علَم
ہو چکی غیروں سے خویشی کی بہار — بس دکھاؤ اب سودیشی[4] کی بہار

کام کو اُٹھو چڑھاؤ آستیں[5]
لَا یُضِیعُ اللّٰہُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْن[6]

---

[1] الحاج مولٰنا سید فضل الحسن حسرت موہانی مرحوم۔ اُردو کے مشہور و ممتاز شاعر۔ آزادیٔ برصغیر ہند کے پہلے مسلمان علَم بردار۔ انڈین نیشنل کانگریس کے سب سے زیادہ مخلص و دیانت دار رکن و کارکن۔ انگریزی حکومت کے ہاتھوں قید و بند کی انتہائی سختیاں برداشت کرنے والے مجسمۂ ایثار و قربانی۔ اسلامی اخلاق و تہذیب اور سادگیِ معاشرت کا قابلِ تقلید نمونہ۔ بڑے خدا ترس و تقویٰ شعار۔ دلدادۂ روحانیت و تصوف۔ ۱۹۵۱ء میں لکھنؤ میں رحلت فرمائی۔

[2] موہان اودھ کا ایک مشہور قصبہ۔

[3] مولٰنا حسرت موہانی نے مشاغلِ ادبی و لیڈری کے ساتھ کانپور میں دیسی ساخت کے کپڑوں کی تجارت شروع کر دی تھی۔

[4] سودیشی تحریک کانگریس کی طرف سے شروع ہوئی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ بدیشی مصنوعات کی بجائے ہندوستان ہی کی بنی ہوئی چیزیں استعمال کی جائیں۔ اِس شعر میں اشارہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرتِ اکبر نے مولٰنا حسرت کو لکھا تھا کہ ہندوؤں کی دوستی کا دم تو بہت بھر چکے اور اُس کا نتیجہ بھی دیکھ لیا اب اپنی اور اپنی قوم کی فکر کرو۔

[5] چڑھاؤ آستین = محاورہ بمعنی تیار ہو جاؤ۔ کمر ہمت باندھو۔

[6] آیۂ قرآنی ہے لَا یُضِیعُ اللّٰہُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْن۔ یعنی اللہ تعالیٰ خلوص سے کام کرنے والوں کے اجر (محنت کا نتیجہ) کو ضائع نہیں ہونے دیا کرتا۔

مولوی عبدالکافی صاحب اور الہ آباد کی مسجد

چوک کی مسجد الہ آباد میں ممتاز ہے
شہر کے سارے مسلمانوں کو اس پر ناز ہے

وسعت و رفعت میں تھی محسوس لیکن کچھ کمی
تنگ ہوتی تھی جگہ جب ہوں زیادہ آدمی

دین میں راسخ ہیں عبدالکافی[1] نیکو صفات
ان کی باتوں میں اثر ان کے ارادوں میں ثبات

کی انھیں نے سعی (مضبوطی سے قائم) دل سے اور لگائی حق سے لو
ہوگئی آخر خدا کے فضل سے تعمیرِ نو (پائداری)

ہوگئی کافی (خدا سے امید قائم کی) جگہ اسلام کے اقبال سے
کہہ رہی ہے مسجد اب اپنی زبانِ حال سے

مسجدِ کافی (یعنی تعمیر کردہ عبدالکافی) کی شانِ آسمانی دیکھئے
خاکساروں کی بلندی کی نشانی دیکھئے

خواجہ حسن نظامی صاحب

حسن[2] نظامی کو میں نے دیکھا شریف خصلت فقیر طینت (درویشانہ کیفیت رکھنے والے)
عمل[3] ہے اپنے ہی عنصروں میں اگرچہ دہلی کی ہے ذہانت

---

[1] مولوی عبدالکافی صاحب بہت بڑے عالم، جامع مسجد چوک الہ آباد کے امام اور مدرسہ سبحانیہ الہ آباد کے بانی تھے۔

[2] مصورِ فطرت شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب (سلمہٗ) خواہر زادہ حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ وغیرہ حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ۔ اردو کے مشہور و معروف البیلے انشاء پرداز و صحافی۔ سیکڑوں کتابوں کے مصنف و مولف۔ بیسیوں رسالوں اور اخباروں کے ایڈیٹر و بانی۔ روحانی تحریر و تقریر کے بادشاہ۔ خوش خلقی و ہردل عزیزی کے پیکرِ مجسم۔ ہزاروں مریدوں کے پیر۔ لاکھوں قدر شناسوں کے ممدوح۔ بے شمار حاسدوں کے محسود۔ اپنی ذاتی محنت و کوشش اور خداداد قابلیتوں سے ترقی کرنے والے۔ حضرت اکبرؔ کے ایک مخلص اور معتمد دوست اور حضرتِ اکبرؔ کی معنوی شاگردی پر فخر کرنے والے۔ آج کل بھی اپنے قدیم مسکن درگاہ محبوب الٰہی میں متوطن ہیں۔ ولادت ۱۲۹۴ھ موجودہ عمر ۷۶-۷۷ سال۔

[3] یعنی ایک بزرگ زادہ ہونے کی حیثیت جو روحانی خصوصیتیں اُن کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہیں عمل ان کا اُنہی خصوصیتوں پر ہے البتہ دہلی کی ذہانت کا کچھ رنگ بھی اُن کے حملوں پر چڑھ گیا ہے۔

عناں[1] (باگ) اندیشہ ہائے (خیالات) مضطر (بے قرار) اِدھر اُدھر گو کبھی مُڑی بھی
وہ دستِ دل ہے کہ جس سے چھوٹی کبھی نہ حبل المتین (مضبوط رسّی) وحدت

ضمیر[2] میں اُن کے ہے تصوّف معاشرت میں ہیں بے تکلّف
فروع جو کچھ بھی پیش آئیں اصول میں اُن کے ہے قناعت

مولوی عبد الماجد دریا آبادی

"ماجد[3]" کو آپ سمجھیں بیگانۂ طریقت	دل میں مرے تو ہے اک امید کا قصیدہ

[1] مطلب یہ ہے کہ افکار وخیالات میں ثبات واستقلال نہ ہونے سے اگرچہ اُن کی زبان وقلم کو کبھی لغزش ہو جاتی ہے لیکن وحدۃ الوجود کے عقیدہ کی مضبوط رسّی کبھی اُن کے ہاتھ سے نہیں چھُٹتی۔

[2] یعنی دل میں اُن کے تصوّف بسا ہوا ہے اور میل جول میں وہ بڑے بے تکلّف ہیں فروعی باتوں میں خواہ وہ اپنے مسلک بدلتے رہیں لیکن بنیادی اُصول تصوّف وروحانیت پر قائم وقانع ہیں۔

[3] مولانا عبد الماجد دریا بادی بی اے مسلمہ مشہور فلسفی وادیب وانشا پرداز وصحافی وشاعر، مصنّف فلسفہ جذبات ودیگر کتب حکمت وتصوّف وتاریخ وسوانح ونیز مترجم ومفسّر قرآن۔ حضرت اکبرؔ سے ذاتی تعلّقات وروابط رکھنے والے اور مرحوم کے بڑے قدردان ومدّاح۔ حضرت اکبرؔ کے متعلق اُن کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ عنقریب "بزم اکبرؔ" کی طرف سے شائع ہونے والا ہے۔ شروع شروع میں مولانا کا رجحان الحاد ودہریت کی طرف تھا۔ لیکن بعد میں حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی وغیرہ کے فیوض واثرات سے رنگ پلٹ گیا اور اب مولانا بھی گریجوایٹ ہونے کے باوجود مولانا اشرف علی صاحب کے مسلک کے رنگ میں بالکل رنگے ہوئے نظر آتے ہیں۔ "بزم اکبرؔ" کو آپ سے بڑی عملی امداد ملتی رہی ہے اور مل رہی ہے۔ حضرت اکبرؔ کے یہ اشعار مولانا ماجد کے متعلق اُس زمانہ میں لکھے گئے تھے جب یہ کہا جاتا تھا کہ مولانا کا رجحان الحاد ودہریت کی طرف ہے۔ حضرت اکبرؔ کہتے ہیں کہ اُن کا مولانا ماجد کے متعلق یہ خیال نہیں ہے کہ وہ تصوّف وروحانیت سے بیگانہ ہو گئے ہیں بلکہ اُن کا خیال یہ ہے کہ مولانا پر بھی عشقِ حقیقی اور فنا فی اللّٰہی کی کوئی ویسی ہی کیفیت طاری ہوئی ہے جیسی کہ حضرت مولانا نیازؔ بریلوی رح کے اس شعر میں بیان کی گئی ہے ؎ من پاکباز عشقم الخ۔ جس کا ترجمہ ہے:- میں ایک پاکباز عاشق ہوں اور ذوقِ فنا سے آشنا ہو چکا ہوں۔ میں ہُو کے جنگل کا ہرن ہوں جس نے ماسوا سے تعلق منقطع کر لیا ہے۔ مولانا کے قدیم رجحاناتِ طبع پر حضرت نیازؔ بریلوی کا یہ شعر کیسے صادق آتا تھا اس کی توجیہ وتشریح خود مولانا ہی کا قلم زیادہ خوبی سے کر سکتا ہے۔ (پیدائش ۱۸۹۲ء۔ عمر موجودہ ساٹھ سال۔)

ہیں غالباً یہ مصداق اس شعر باثر کے — ارشاد کر گیا ہے اک مردِ برگزیدہ

من پاک بازِ عشقم ذوقِ فنا چشیدہ
آہوئے دشت ہویم از ما سوا رمیدہ

مسٹر برن[1] چیف سکریٹری گورنمنٹ یو۔پی

شاعروں میں جب آیا میرا ٹرن (باری) — پڑھ دیا میں نے پیش حضرت برن[1]
اُردو و فارسی میں آپ ہیں برق — آپ ہی سے ہے نُورِ مطلعِ شرق
صاحبِ فیض و لطف و حِلم ہیں آپ — عزّت افزائے اہلِ علم ہیں آپ
حق تعالےٰ کو مانتے ہیں آپ — قدر طاعت کی جانتے ہیں آپ
فخر و ناز آپ کے لئے ہے مباح (جائز) — اک زمانہ ہے آپ کا مدّاح
آپ سے مِل کے دل کو راحت ہے — ایسا حاکم خدا کی رحمت ہے
آپ کا دل ہے مخزنِ ہمہ اوست[2] — جو مِلا آپ سے بنا وہ دوست
ہے بلند آپ کے کرم کا علم (جھنڈا) — ہیں مرید آپ کے سب اہلِ قلم
سازِ بزمِ آپ کا رہے برتر — ہو مبارک ترانۂ اکبر

[1] مسٹر برن یو پی سول سروس کے ایک بڑے ہر دل عزیز و قابل افسر تھے جو بعد میں چیف سکریٹری ہو گئے تھے۔

[2] ہمہ اوست کے لفظی معنی ہیں "سب وہی ہے" قائلین وحدت الوجود کائنات کی ہر چیز میں خدا ہی کے وجود کو دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سب کچھ وہی ہے۔ "ہمہ اوست"۔ "دِل کے مخزن ہمہ اوست" ہونے کا مطلب یہ ہے کہ دل میں کسی کی غیریت کا احساس نہ ہو اور سب کے ساتھ اپنوں اور دوستوں کا سا برتاؤ کیا جائے۔

سیّد عشرت حسین صاحب کا بنگلہ

فضل ہو اللہ کا ہوں جمع سارے سالیاں — وہ اُچھالیں بال یہ چمکائیں اپنی بالیاں

لمپ کی ہو جگمگاہٹ اور بجے فونوگراف — عشرتی[۱] جھوما کریں بچّے بجائیں تالیاں

گھر رہے آباد سمدھی اور سمدھن خوش رہیں — ڈومنی انعام پائے گائے پیاری گالیاں

گرد بنگلے کے رہے سرسبز ہر شاخِ درخت — نہر کے پانی سے لہراتی رہیں سب نالیاں

ڈھیر ہو پھولوں کا گلدستے بنائے باغباں — پیڑ پھل دیتے رہیں مالی لگائیں ڈالیاں

سونے[۲] چاندی کی بہیں موجیں دُلہن کے ہاتھ سے — لیں بلائیں اور دعائیں دیں اُنھیں گھر والیاں

غُل مچائیں کھیل میں بچّے رہے بنگلے میں دھوم — میہمانوں کے لئے پکوان کی ہوں تھالیاں

جھانک کر دیکھیں تو جج[۳] صاحب کا دل بھی ہو نہال (خوش و خرم) — کمرے کے دیوار میں دو اک بنی ہوں جالیاں

محمد موسٰی صاحب کی بھیجی ہوئی لیچیاں

بھیجی تم نے جو مجھ کو لیچی — شربت کی نظر ہے اُس سے نیچی[۴]

مُنھ میں رکھ کر جو میں نے چوسا — بولی یہ زبان واہ موسٰی[۵]

---

۱ حضرت اکبرؔ اپنے صاحبزادہ سیّد عشرت حسین مرحوم کو پیار سے عشرتی کہا کرتے تھے۔

۲ یعنی دلہن خوب داد و دہش کریں۔

۳ مراد خود حضرت اکبرؔ ہیں جو پنشن پانے کے بعد بھی جج کہلاتے تھے۔

۴ نظر نیچے ہونے سے مراد شرمندہ ہونا ہے یعنی لیچیوں کی مٹھاس کے آگے شربت کی مٹھاس بھی ماند ہے۔

۵ یعنی محمد موسٰی صاحب برادر خورد شمس العلماء مولوی امجد علی صاحب ایم۔ اے۔ موسا ہندی مصدر موسنا کا ماضی بھی۔ موسنا کے معنی ہیں لوٹ لینا۔ مال اُڑا لینا یہاں ممکن ہے کہ یہ معنی بھی مراد ہوں کہ زبان نے منھ سے شکایت کی کہ واہ تم نے تو لیچی کو چوس کر سارا مزا خود ہی اُڑا لیا۔

نوحے، تہنیتیں

اور

مادہ ہائے تاریخ

بروفاتِ سیّد محمودؒ[1] مرحوم

دلِ احباب سے نکلتی ہے آہ — نہ وہ بکؒ[2] رہ گئے نہ سرسیّد
لی اُنھوں نے بھی آج خلد کی راہ — ذاتِ محمُود (فرزندِ سرسیّد) سے تسلّی تھی
اے حریصانِ شان و شوکت و جاہ — بولی عبرت کہ ہوش میں آؤ
مِٹ گیا نقشِ احمدؐ[3] و محمود
رہ گیا لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللہ

بَروصالِ مولانا محمّد حسینؒ[4] الہ آبادی مرحوم

اُسی حالت میں انتقال ہوا — سُن رہے تھے سماع مولانا
عالمِ وجد میں وصال ہوا — واہ کیا خوش نصیب تھے حضرت

---

[1] جسٹس سیّد محمود (وفات ۱۹۰۳ء) سرسیّد کے فرزند ارجمند۔ سیتاپور میں دفعتاً ایک جمعہ کو وفات پائی۔ (عبدالماجد دریا بادی)

[2] مسٹر بک علی گڈھ کالج کے پہلے اور نامور پرنسپل ہوئے ہیں۔ سرسید اور محسن الملک پر حاوی (مولوی عبدالماجد دریا بادی)

[3] احمد و محمود اسمائے مبارک جناب رسالت مآبؐ کے بھی ہیں مگر اس شعر میں مراد سرسیّد احمد خاں صاحب اور اُن کے صاحبزادے سیّد محمود صاحب مرحوم ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایسی بڑی بڑی ہستیوں کے نہ رہنے سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ سوائے ذات اللہ کے باقی جو کچھ بھی ہے وہ فانی ہے۔

[4] شمس العلماء مولانا محمد حسین الہ آبادی حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکّی کے ممتاز خلفاء میں سے تھے۔ ابتداءً سماع نہیں سُنا کرتے تھے مگر پھر کچھ طبیعت میں ایسا انقلاب ہوا کہ سماع کا بے حد ذوق پیدا ہو گیا یہاں تک کہ ۱۹۰۴ء میں حضرت خواجہ معین الدّین اجمیریؒ کے عُرس کے موقع پر سماع سُنتے ہوئے حضرت شاہ عبدالقدّوس گنگوہیؒ کے اس شعر پر ؎ گفت قدّوسے فقیرے در فنا و در بقا ٭ خود بخود آزاد بودی خود گرفتار آمدی۔ کیفیت وجد طاری ہوئی اور اسی کیفیت میں انتقال فرما گئے۔ الہ آباد میں بیانِ ذکرِ معراج کے لئے رجبی شریف کے نام سے ایک بڑی مجلس منعقد فرمایا کرتے تھے جس میں دُور دُور سے آکر لوگ شریک ہوتے تھے۔

حضرت کی وفات سے ہے ہر اک دل ریش　　رکھتے تھے عزیز اُن کو بیگانہ و خویش
کیا کیا صفتیں تھیں جمع ان میں اکبر　　حافظ، حاجی، طبیب، عالم، درویش

مولانا محوِ عشقِ یزدانی تھے　　بے شک اس عہد میں وہ لاثانی تھے
بھولیں نہ کبھی انھیں محبّانِ رسول　　یعنی رجبی شریف کے بانی تھے

تاریخ وفات والدہ[1] صاحبہ سیّد عشرت حسین

مرا راحت رسان و محرمِ اسرار ما بودی　　ہمیں تاریخ فوتت گفتہ ام غمخوار ما بودی
۱۹۱۰ء

مادہ تاریخ ولادت سیّد ہاشم[2]

تیغ فاتح　　ظہورِ پدر
۱۸۹۹ء　　۱۳۱۷ھ

مادہ تاریخ ولادت سیّد عقیل ابنِ سید عشرت حسین

محمد عقیل ابن عشرت
۱۳۲۵ھ

---

[1] والدہ صاحبہ سید عشرت حسین صاحب مرحوم کا انتقال بتاریخ ۲۴؍ اکتوبر سنہ ۱۹۱۰ء کو ہوا۔

[2] سید ہاشم مرحوم حضرت اکبر کے سب سے چھوٹے صاحبزادے جن کی جواں مرگی پر حضرت اکبر کو بے حد صدمہ ہوا اور اُن کی کمر ٹوٹ گئی۔

تاریخ وفات جناب سیّد تفضل حسین صاحب پدر حضرتِ اکبر

چو شُد واصلِ ذاتِ ربِ ذاتِ او
بجو سال تاریخش از ذاتِ رب
۱۳۰۳ھ

بر وفات سیّد ہادی علی صاحب رئیس و آنریری مجسٹریٹ الہ آباد

اُن کے مرنے کا نہ کیوں ہو سب کو غم
سچ تو یہ ہے لاکھوں ہی میں ایک تھے

سُنئے الہامی یہ تاریخِ وفات
میر ہادی صُلح جُو تھے نیک تھے
۱۳۱۷ھ

پاکیزہ سرشت صاحب رائے
میر ہادی از جہاں چو مردانہ رفت
۱۳۱۷ھ

شُد اہلِ بہشت میر ہادی
۱۳۱۷ھ

نوحۂ وفات عثمان پرشاد پسر مہاراجہ[۱] سر کشن پرشاد

رحلتِ فرزند سے ہیں راجہ صاحب دردمند
شادؔ کا دل اِس مصیبت سے بہت ناشاد ہے

اکبرِ خونیں جگر اس غم میں خود ہے مُبتلا
اُس کے لب پر بھی فغاں ہے آہ ہے فریاد ہے

حرفِ تسکین و تسلّی کیا زباں پر لائے وہ
شادؔ خود صوفی ہیں اُن کو درسِ حکمت یاد ہے

---

[۱] مہاراجہ سر کشن پرشاد حیدرآباد دکن کے مشہور علم دوست اور صوفی منش وزیرِ اعظم تھے۔ اُن کے بڑے صاحبزادے کا نام جن کی وفات پر حضرت اکبر نے یہ نوحہ لکھا ہے۔ نظامِ دکن اعلیٰحضرت میر عثمان علی خاں صاحب کے نام کی رعایت سے عثمان پرشاد رکھا گیا تھا۔

رحمتِ حق پر نظر ہے اور یہی ہے التماس
منزلِ ہستی کی یہ اک فطرتی اُفتاد ہے

لطفِ اشفاقِ خدا کی گود میں پلتا ہے وہ
جنّت الفردوس اُس کے دم سے اب آباد ہے

اس تصوّر میں رہے مہراج کی طبعِ بلند
یعنی اب عثمان پرشاد آسماں پرشاد[۱] ہے

بر وفات مولانا شبلی[۲] نعمانی

لفظوں میں اجتماع نہ معنی میں نور ہے
ویران آج کوچۂ بین السطور[۳] ہے

شبلی کا خامہ صفحۂ ہستی سے اُٹھ گیا
اب مدِّ آہ و لوحِ دلِ ناصبور ہے

شبلی ہی اُٹھ گئے تو میں اب جاؤں کس کے پاس
شعر و سخن کی بزم نظر آتی ہے اُداس

ڈھونڈھا جو دل نے مادۂ سالِ انتقال
پھرنے لگا نگاہ میں یارِ سخن شناس

۱۳۳۲ھ

---

[۱] "آسماں پرشاد" کے معنی ہیں "آسمان پر خوش" مرنے کے بعد "عثمان پرشاد" کو "آسمان پرشاد" بنادینا حضرتِ اکبر کا ایک شاعرانہ کمال ہے۔

[۲] شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی رکنِ رکین و معاونِ بناءِ ندوۃ العلماء۔ فاضلِ ادب۔ مورّخ و متکلّم۔ وفات ۱۹۱۴ء

[۳] دو لکھی ہوئی سطروں کی درمیانی جگہ کو بین السُّطور کہتے ہیں۔ پُرانی کتابوں کے بین السطور میں الفاظ و معانی کی ایسی مختصر توضیح کردی جاتی تھی جس سے کتاب کی عبارت کا مفہوم سمجھنے میں آسانی ہوجاتی تھی۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ مولانا شبلی علوم و تصانیفِ قدیمہ کے متعلق جو کچھ لکھتے تھے اُس کے الفاظ ایسے چُست اور گُتھے ہوئے اور معنی ایسے روشن ہوتے تھے جیسے کہ کسی نے اُن علوم اور کتابوں پر بین السطوری حاشئے لکھ دئے ہوں۔ مولانا شبلی کے انتقال کے بعد اب یہ کوچۂ بین السطور ہی ویران ہوگیا یعنی قدیم علوم و تصانیف پر مولانا شبلی جیسا تبصرہ کرنے والا نہیں رہا۔

بروفاتِ والدۂ ڈاکٹر اقبال[1] مرحوم

حضرتِ اقبال میں جو خوبیاں پیدا ہوئیں
قوم کی نظریں جو اُن کے طرز کی شیدا ہوئیں

یہ حق آگاہی یہ خوش گوئی یہ ذوقِ معرفت
یہ طریقِ راستی خود رائی بے تمکنت

اس کے شاہد ہیں کہ ان کے والدین ابرار تھے
باخدا تھے اہلِ دل تھے صاحبِ اسرار تھے

جلوہ گر اِن میں اُنھیں کا ہے یہ فیضِ تربیت
ہے ثمر اُس باغ کا یہ طبعِ عالی منزلت

مادرِ مخدومۂ اقبال جنّت کو گئیں
چشمِ تر ہے آنسوؤں سے قلب ہے اندوہگیں

روکنا مشکل ہے آہ و زاریٔ و فریاد کو
نعمتِ عظمیٰ ہے ماں کی زندگی اولاد کو

اکبر اِس غم میں شریکِ حضرتِ اقبال ہے
سالِ رحلت کا بیاں منظور اُسے فی الحال ہے

واقعی مخدومۂ ملّت تھیں وہ نیکو صفات
رحلتِ مخدومہ سے پیدا ہے تاریخِ وفات

١٣٣٣ھ

---

[1] علاّمہ ڈاکٹر سر محمد اقبال ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ بیرسٹر ایٹ لا۔ مشہور عالم ادیب و مفکر و شاعر فلسفی۔ مصنّف پیامِ مشرق۔ و بانگِ درا و اسرارِ خودی و رموزِ بےخودی و زبورِ عجم و جاوید نامہ و شکوہ و جوابِ شکوہ وغیرہا وغیرہ۔ مسلمانوں کے مایۂ ناز انقلاب انگیز شاعر (ولادت در سیالکوٹ ۱۸۷۳ء۔ وفات در لاہور ۱۹۳۸ء) علاّمہ مرحوم نے اپنی والدہ ماجدہ کی حسرت آیات وفات پر خود بھی پُراثر نوحے تحریر فرمائے ہیں۔ آپ کی والدہ ماجدہ کا انتقال ۱۳۳۳ ہجری میں ہوا۔

بر وفات سیّد ہاشم مرحوم[1]

صدمۂ فرقت میں کر کے مُبتلا — آج ہاشم عازمِ جنّت ہوا
قوتِ بازوے عشرت چل بسی — اور مرا نورِ نظر رخصت ہوا

آغوش سے سدھارا مجھ سے یہ کہنے والا — ابّا سنائیے تو کیا آپ نے کہا ہے
اشعار حسرت آگیں کہنے کی تاب کس کو — اب ہر نظر ہے نوحہ ہر سانس مرثیا ہے

بر ولادت و وفات پسر سیّد عشرت حسین

نظر امّید کی اِک غنچۂ دل کش کو تکتی تھی — فلک نے ناشگفتہ اُس کو لیکن کر دیا رخصت
سمجھ میں کچھ نہیں آتا طلسم اس باغِ ہستی کا — بہ صد حیرت کہی تاریخ رمزِ گلشنِ فطرت
۱۳۳۶ھ

بر وفات شمیم فاطمہ صاحبہ دختر مفتی افتخار حسین صاحب

چل بسی وہ دخترِ گل پیرہن — ہوگیا ویراں ہمارا باغ آہ
سالِ رحلت کیا لکھوں اے افتخار — دیکھتے ہی ہیں جگر میں داغ آہ

---

[1] حضرت اکبر کے ہونہار چہیتے چھوٹے صاحبزادے سید ہاشم مرحوم جو بعمر تقریباً ۱۴ سال اپنے زندہ دل بوڑھے باپ کے سارے زندہ دلولوں کو ختم کر کے ۵ رجون ۱۹۱۳ء کو آیندہ کے لئے رخصت ہوگئے۔ سید عشرت حسین صاحب مرحوم سیّد ہاشم مرحوم کے متعلق لکھتے ہیں "حضرت قبلہ (یعنی حضرت اکبر) جیسے بیٹے کو پسند کرتے تھے ہاشم ویسے ہی بیٹے تھے۔"

فغاں کہ سوخت زغم جانِ افتخار حسین ‌ ‌ ‌ دلش فسردہ شد از جورِ عالمِ فانی
شمیم فاطمہ دخت عزیز و نورِ نظر ‌ ‌ ‌ نہالِ نورس وزیبا بباغِ امکانی
جمالِ صورت معنی ضمیرِ ہستی او ‌ ‌ ‌ بہ خلق بخیمِ سعادت بہ خلق لاثانی
فغاں کہ دستِ اجل پنجہ زد بدامنِ او ‌ ‌ ‌ کشید رخت اقامت زعالمِ فانی
بہارِ گلشنِ ہستی ہنوز نا دیدہ ‌ ‌ ‌ پرید طائر روحش بحکمِ یزدانی
فراقِ لختِ جگر را زوالدین بپرس ‌ ‌ ‌ چہ برقہا کہ فگندہ زسوزِ پنہانی
ہزار شعلۂ حسرت کہ سرزد از دِلہا ‌ ‌ ‌ ہزار اشک مصیبت کہ کرد طغیانی

چو فکر سالِ وفاتش نمودم از سرِ راہ
شمیمِ خلد شدہ گفت فضلِ رحمانی

۱۳۳۳ھ

قطعہ تاریخ وفات سیّد مہدی حسن صاحب

جنابِ سیّد مہدی حسن خجستہ صفات ‌ ‌ ‌ بلند مرتبہ ذی علم مصدرِ حسنات
سدھارے دارِ فنا سے وہ سوئے خُلدِ بریں ‌ ‌ ‌ سنہ وفات کا خواہاں ہوا جو قلبِ حزیں

پڑھا یہ ہاتفِ غیبی نے مصرعِ جیّد
مقیمِ خلدِ بریں مہدیِ حسن سیّد

۱۳۳۷ھ

قطعہ تاریخ وفات بی بُوٹا صاحبہ زوجۂ ثانی حضرت اکبر[1]

آں نونہالِ خوبی ماہِ دو ہفتۂ من ۔۔۔ در نو بہارِ عمرش رفت از فضائے ہستی
پیمانۂ مۓ غم سرشار و بیہشم کرد ۔۔۔ رفتم سرِ مزارش در بے خودی و مستی
آہے ز دل کشیدم گفتم کہ اے مہِ من ۔۔۔ با ایں کمال و رفعت حیف است میلِ پستی
آخر چہ پیشت آمد اے شمعِ محفلِ من ۔۔۔ در گوشۂ نشستی وز انجمن گسستی
آخر چہ شُد کہ رفتی اے رونقِ گلستاں ۔۔۔ در موسمِ بہاراں رنگِ چمن شکستی
اے برق وش چہ داری نسبت بگورِ تیرہ ۔۔۔ اے شعلہ رو بخاکِ تربت چرا نشستی
اے خوش نگاہ واکن چشمانِ سحر آگیں ۔۔۔ چیزے بگو بہ عاشق لبہا چرا بہ بستی
ناگہ ندائے از غیب آمد بگوشِ جانم ۔۔۔ کاے بے خبر ز ایماں اے حورِ بُت پرستی
آں را کہ شعلہ خوانی واں را کہ برق دانی ۔۔۔ آں جُملہ بود رنگِ نقشِ طلسمِ ہستی
آں رنگ ہا پرید و بویش بماند رازے ۔۔۔ رازے کہ کس نہ داند دَر بندِ خود پرستی
عبرت کشود چشمِ حیرت بہ ہوشم آورد ۔۔۔ در سینہ دفن کردم جوش و خروشِ ہستی

تاریخِ فوت گفتم در صنعت عجیبے
بُوٹا[2] بروں شد اکبر از گرد باغ ہستی

۴۰۹ ۔۔۔ ۱۷۰۲ / ۴۰۹ ۔۔۔ ۱۲۹۳ھ

---

[1] بی بوٹا حضرتِ اکبر کی کم سن محبوبہ اور پھر منکوحہ۔ تائب ہو کر اور عقد میں آکر عین عنفوانِ شباب ۱۸۷۶ء میں وفات پائی۔ (مولوی عبد الماجد صاحب دریا بادی)

[2] یہ مادۂ تاریخ صنعت تخرجہ میں ہے یعنی گرد باغِ ہستی کے اعداد ۱۷۰۲ میں سے بوٹا کے اعداد ۴۰۹ تفریق کرنے سے سنہ وفات ۱۲۹۳ نکلتا ہے۔

تقریظاتؔ

ایڈیٹر صاحب رسالۂ یدِ بیضا کے نام

عِلمِ اسرارِ دل و حلِّ معمّا داری
برتر از نظمِ دکن نظمِ ثریّا داری

تو چہ حاجت بہ جمالِ سخن ما داری
حُسنِ یوسف دمِ عیسیٰ یدِ بیضا داری

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

شاہی کیوڑہ کی تعریف میں

عنبر فشاں ہوا ہے معطّر مکاں ہے
کیوڑے کا یہ عرق نہیں کیوڑے کی جان ہے

کیوڑہ بنے گا پندرہ قطروں (یعنی روحِ کیوڑہ) سے اِک گلاس
اس کی یہی ہے جانچ یہی امتحان ہے

صنعتِ صانع کو دیکھ اِس روغن بادام میں
یاسمن (یا چنبیلی) کی روح پھونکی ہے تنِ بادام میں

[1] یدِ بیضا (عربی) بمعنی چمکتا ہوا ہاتھ۔ حضرت موسیٰ علیہ السّلام سے ایک معجزہ یدِ بیضا کا بھی ظاہر ہوا کرتا تھا۔ یعنی جب وہ اپنا ہاتھ بغل میں ڈال کر نکال لیتے تھے تو وہ ایسا چمکتا تھا کہ آنکھیں چُندھیانے لگتی تھیں۔ یدِ بیضا ایک ماہوار رسالہ کا نام تھا جو حیدر آباد دکن سے نکلا کرتا تھا اور جس کی تعریف میں یہ اشعار کہے گئے تھے۔

[2] اس قطعہ پر کُلّیاتِ اکبر جلد دوم میں یہ حاشیہ ہے:۔ یہ اشعار حضرت اکبر نے حسب فرمائش شیخ محمد حسین سکندر پُوری ضلع بلیا مصاحبِ دار نظامۃ العالیہ مرشد آباد صدر دوکان کھشگرا اسٹریٹ کلکتہ نمبر ۳ موجد بادامی روغن، شاہی کیوڑہ وغیرہ کے کیوڑے کی تعریف میں موزوں فرمائے (محمّد عبد الرّحمٰن قیس)

ڈاکٹر اقبال کی ایک نظم کی تعریف

اس نظم کا نقطہ نقطہ ہے منبعِ نُور — ہر حرف سے ہے تجلّیٔ حق کا ظہور
اوجِ[1] ملکوت کا ہے عالم جہان ہر لفظ — ہر بیت شعر اقبال کی ہے بیت[2] المعمُور

ایم۔آر۔آرزو کا بنولے کا تیل

ایم[3]۔آر۔ آرزو کی یہ ترکیب دیکھئے — نیٹو[4] کو رنگ وروپ میں مسٹر بنا دیا
تاثیر میں مفید بنولے کا تیل تھا — خوشبو میں بھی بس اس کو لونڈر[5] بنا دیا

نقی محمّد خاں صاحب کی تصنیف پر قطعہ تاریخ

خدا کے بندۂ صالح نقی محمّد خاں — سپہرِ علم وخرد کے ہیں اخترِ تاباں
کتاب ان کی یہ ہے ہادیِ طریقِ ثواب — ملا ہے ہم کو یہ گنج جواہر خوش آب
جو غنچہ قلب کا تاریخ کی طلب میں کُھلا — کلیدِ خُلق وصداقت بس سالِ طبع مِلا
۱۳۳۵ ھ

---

[1] یعنی ہر لفظ سے ملکوتی تخیّل کی بلندی عیاں ہے۔

[2] بیت المعمور کے لفظی معنی ہیں بھرا گھر آباد مکان، مذہبی اصطلاح میں اُس آسمانی مسجد کو کہتے ہیں جس کے متعلق مشہور ہے کہ طوفانِ نوح کے زمانہ میں اُس کو زمین سے اُٹھا کر عرشِ چہارم پر قائم کر دیا گیا تھا۔ یہ تحقیق نہیں ہو سکا کہ علامہ اقبال کی کس نظم کی تعریف میں یہ اشعار کہے گئے ہیں۔

[3] ایم۔آر۔آرزو نام ہے کسی خوشبودار بنولے کے تیل کے موجد کا۔

[4] نیٹو سے مراد دیسی اور مسٹر سے مراد مغربی ہے۔ یعنی ایک دیسی چیز کو مغربی رنگ وروپ میں تبدیل کر دیا۔

[5] لونڈر (انگریزی) Lavander = انگریزی عطر۔

تقریظ کتاب اعجوبۂ اسرار

نورِ باطن بڑھ گیا اعجوبۂ اسرار سے — دل نے پائی تقویت اس روح کے غمخوار سے
پردۂ غفلت اُٹھا دیتے ہیں وہ مضموں ہیں یہ — پھیر دیتے ہیں طبیعت دہر کے بازار سے
ہیں مصنّف اس زمانے کے بڑے عالی خیال — واقعی یہ ہے کہ ہیں وہ فرقۂ ابرار سے
بند ہے اس وقت چشمِ عبرت عرفاں تمام — ہاں لیا ہے کام اُنھوں نے دیدہ بیدار سے

ہے بجا "اعجوبۂ اسرار" کی نسبت یہ قول
دولتِ ایماں بڑھی تصنیفِ گوہر بار سے

تقریظ کتاب ہدیۂ حیدری

کس قدر پُر نور ہے یہ تنظیمِ مدحِ بوتراب (حضرت علی رض) — یہ بلاغت حیرت افزا یہ فصاحت لاجواب
اِس قصیدے سے ہوئے روشن زمین و آسماں — اوجِ معنی پر دلِ اختر سے نکلا آفتاب

حسب الارشاد جناب مشتاق احمد صاحب۔ آنریری سکریٹری، بزمِ اکبر
کتاب ہٰذا کلیم پریس کراچی میں چھپی اور دفتر بزمِ اکبر، بنز رٹا لائینز۔ کراچی نمبر ۴ سے شائع ہوئی

لسان العصر

حضرت اکبر الہ آبادی کے متعلق اختر انصاری اکبر آبادی نے پچانوے شاعروں سے تازہ نظمیں لکھوائی ہیں۔ کوئی پرانی اور مطبوعہ نظم اس مجموعہ میں نہیں ہے۔

حامد حسن قادری۔ اسد ملتانی۔ حفیظ ہوشیارپوری۔ شاد عارفی۔ ماہر القادری۔ سراج الدّین ظفر۔ ادیب سہارنپوری۔ اختر ہوشیارپوری۔ سرشار صدّیقی۔ شاہد نقوی۔ رئیس امروہوی۔ ظریف جبلپوری۔ عابد چشتی۔ سجّاد باقر۔ خمار انصاری۔ سلطان برقی۔ صہبا اختر۔ ہدایت حیدری اور افضل صدیقی جیسے شعرا نے حضرتِ اکبر کو خراج تحسین دیا ہے۔

رحلت سے مہینہ بھر قبل کا ایک فوٹو اِس کتاب میں لگایا گیا ہے۔

ضخامت ایک سو بانوے صفحے۔ قیمت تین روپے۔ محصول آٹھ آنے۔

اکبر اِس دَور میں

اسے بھی اختر انصاری اکبر آبادی نے ممتاز ناقدین کے تازہ مضامین حاصل کرکے ترتیب دیا ہے۔ حضرت اکبر الہ آبادی پر بے مثل کتاب ہے۔ اکبر اور اکبر کی شاعری کو سمجھنا ہو تو "اکبر اس دَور میں" ضرور پڑھئے۔

ضخامت تین سو چھتیس صفحے۔ قیمت پانچ روپے۔ محصول بارہ آنے۔